نیکیوں کے موسمِ بہار...... رمضان المبارک پر اچھوتی تحریریں

جون 2015ء

اُردو ڈائجسٹ

urdudigest.pk | urdudigest.com

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

ممنون حسین

ان کی پوری زندگی حیرتوں،
اچنبھوں، باطن کی سچائیوں،
پُرعزم کاوشوں اور غیر معمولی
کامیابیوں سے عبارت ہے

بے لوث خدمات سے
عہدے اور منصب ان کے
قدم چومتے رہے!

صفحہ ۱۶ الف



انٹرنیٹ مدد کو ان پہنچا ۱۲۹
جدید ٹیکنالوجی کا ایک مثبت روپ

دو بہادر نابینا طالبات ۸۱
انسانی عزم و ہمت کی جیتی جاگتی مثالیں

جانوروں کی بظاہر بیکار ۳۳
آنتوں سے [illegible] کاروبار [illegible]

اردو ڈائجسٹ جون 2015ء
قیمت: 100 روپے
جلد 32

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ کی باندھی ہوئی حدیں

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کو) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔ پھر روزہ رات تک پورا کرو اور جب تک تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو، تو عورتوں سے نہ ملو۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی، سو ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ بچتے رہیں O (سورۃ البقرۃ ۲: ۱۸۷)

رسول ﷺ کا فرمان

روزے دار کی مسرتیں

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس دن کوئی شخص روزے سے ہو، تو اسے چاہیے کہ نہ فحش کلامی کرے، نہ چیخے چلائے اور نہ جھگڑے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "روزے دار کو دو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب افطار کرتا ہے، تو خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملے گا تو اس کے روزے کے سبب اس سے خوش ہوگا۔" (بخاری کتاب ۳۰، باب ۹، مسلم کتاب الصیام، باب ۳۰)

جنت کا دروازہ

حضرت سہلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جنت میں ایک دروازہ ہے، جس کا نام "ریان" (سیراب کرانے والا) ہے۔ اس دروازے سے روزِ قیامت صرف روزے دار داخل ہوں گے۔" (بخاری کتاب: ۳۰، باب: ۴، مسلم کتاب الصیام، باب ۳۰)

جون 2015ء
شعبان المعظم 1436ھ
جلد 55 شمارہ 6
urdudigest.com www.urdudigest.pk
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
[illegible]
محمد اسلم [illegible]
[illegible] حسن [illegible] صدیقی [illegible]
فاروق اعجاز قریشی
ایاز عمران قریشی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اعجاز قریشی 0300-8460093
advertisement@urdu-digest.com
[illegible] 0300-4005579
[illegible] احسان اللہ [illegible]
خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
19/21 [illegible] فون 92 42 37589957
[illegible] 1500 [illegible] 1000 [illegible]
[illegible] 60 [illegible]
[illegible]
[illegible]
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore)
Branch Code No. 110
اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں [illegible]
325. G-III [illegible]
فون +92-42-35290738 فیکس +92-42-35290731
ای میل editor@urdu-digest.com
[illegible]
[illegible]



شیاطین اللہ کی پکڑ میں

محترم قارئین! ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے۔ اللہ تعالیٰ [illegible] انعام کرنے والا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں اپنی رحمتوں کے دروازے اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھول دیتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت اور توفیق دے کہ ہم رمضان المبارک کی قیمتی ساعتوں سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

زمبابوے کرکٹ ٹیم کی پاکستان آمد [illegible] کا مژدہ ثابت ہوا۔ بظاہر یہ معمولی بات لگتی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چھ برس میں پاکستانی قوم کرکٹ کے مواقع کو ترس گئی۔ [illegible] اسٹیڈیم جا کر [illegible] دیکھنے [illegible] تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ [illegible] میچ دیکھنے کی [illegible] ٹکٹ [illegible] ہوا۔ پھر ۲۲ [illegible] کی [illegible] اسٹیڈیم جا پہنچا۔ [illegible] ہر طرف [illegible] پاکستانیوں کی بہار [illegible] دل خوش ہو گیا۔

"جیوے جیوے پاکستان" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعروں کی گونج نے [illegible] بنا دیا۔ جذبِ الوطنی [illegible] آنکھوں میں [illegible] میچ میں [illegible] نہ ہوا [illegible]۔ سپاہیوں [illegible] مستعدی سے کام [illegible] پنجاب پولیس زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بھی لگے۔ اس میچ نے کروڑوں نوجوانوں کے دلوں میں اپنے ملک سے محبت اور جذبے کا دیپ روشن کر دیا ہے۔

[illegible] میدانوں میں دہشت گردی کے واقعات [illegible] تجزیوں اور [illegible] بڑی دنیا کو یہ پیغام دیا گیا کہ پاکستان محفوظ ملک نہیں۔ [illegible] کی ٹیم پر [illegible] حملے کے [illegible] کوئی پوری [illegible] میں [illegible] اسکینڈل کے بے نقاب ہونے سے ثابت ہوا [illegible] کے ذریعے سازش کے تحت مختلف پاکستانی شہروں میں [illegible] کو استعمال کر کے ملک کو غیر مستحکم [illegible] بنا دیا [illegible] اور [illegible] کے ذریعے بے شرمی سے [illegible]۔

میڈیا [illegible] کالم نگار [illegible] اداروں کے حاضر سروس [illegible] افسران اور غیر قانونی دولت کمانے والوں [illegible] ملک کو بری طرح [illegible] اور پھر ایسے قوانین بنانے [illegible] [illegible] بلیک [illegible] سے ان [illegible] تک [illegible] بنایا گیا۔ [illegible] صرف [illegible] بڑی [illegible]

صدر مملکت

بے لوث خدمات پر عہدے اور منصب ان کے قدم چومتے رہے

الطاف حسن قریشی



فارمولے پر بنائی گئیں۔ حقیقی اداروں کو مفلوج اور ناکارہ ثابت کرنے کے بجائے خندہ پیشانی سے اپنا "سودا" بیچا گیا اور ابھی تک بیچا جارہا ہے۔ پولیس جیسے اہم ادارے کو رشوت اور بدانتظامی سے بے اثر کرکے حفاظت کے نام پر نجی ایجنسیوں کو متعارف کرایا گیا۔ پی ڈی اے اور ایل ڈی اے جیسے بہترین اداروں کو بھی اسی فارمولے کے تحت ناکارہ کردیا گیا اور نجی کمپنیوں سے حقوق آشنا اور قبضہ مافیا کی مدد سے شہروں پر چھوٹی ہاؤسنگ سوسائٹیز بنائیں جن میں پارٹی رہنماؤں اور ان کے قریبی عزیزوں نے اربوں روپے کا کاروبار کرکے عام اقتصادی سے بنایا گیا اور کالا دھن بیرون ملک سے سفید کیا گیا یا بے حساب تک کیا جا رہا ہے۔ ہر شعبے کا تجزیہ ہوا گیا لیکن کوئی بھی قانون کی گرفت میں نہ آسکا۔ سب نے بیرون ملک کوٹھیاں اور لندن کو اپنا مسکن بنالیا۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آئی ٹی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین ایگزیکٹ کے بارے میں جانتے تھے اور اکثر اوقات ان کا ذکر کرتے تھے کہ یہاں جو کاروبار ہوتا ہے وہ کاروبار بہت عرصے سے چل رہا ہے۔ یہ سیاست دان جن کا کام آئین اور حکومت کے اداروں کی سمت درست رکھنا تھا، ناجائز دولت کمانے والوں اور ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ تبدیلی کے نام پر انتخابی حلقوں پر قبضہ کرتے رہے اور مفاہمت کے نام پر تحفے میں لینے والے پارٹی بغاوت میں عیاشی کرتے رہے جن میں پارٹی رہنما شامل ہیں۔

نیب اور ایف آئی اے جیسے اداروں کو مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور ان کو روک دیا گیا۔ ماضی کے قابل فخر تعلیمی اداروں کو تباہ کرنے کے لئے جعلی ڈگریاں جاری کرنے کو ذریعہ بنا دیا گیا۔ رہائشی علاقوں میں گلیوں میں جعلی اسکول اور اسپتالوں کا جال بچھا دیا گیا اور پھر اسناد و تحفظ دینے کے لئے عمارت اور چیکنگ کرنے کے لائسنس دیئے گئے اور ان کی مدد سے ایک جال بنایا گیا جس میں "ڈگریوں کے تحریک" جہاں والدین اور نوجوانوں کو فریب دیا گیا۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ ہمارے سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل نوجوان نام نہاد مہنگے تعلیمی اداروں کے طلبہ سے زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں۔ فرق صرف مشکل سے گھر کے انگلش بولنے کا ہے۔ پاکستان کا کارپوریٹ ورلڈ بھی انگریزی کے انگلش بولنے والوں کو ملازمت دینے میں ترجیح دیتا ہے چاہے ان کی ڈگریاں جعلی ہی ہوں۔

ایک حقیقی کی انٹرنیشنل تک میں ایگزیکٹ اسکینڈل کی آڑ ہوئے پر تحقیقات ایف آئی اے کی سطح پر بڑے بڑے بول جیسے بول سے لگتا ہے کہ شیطانی چکر چلانے کا سلسلہ شروع ہو چکا۔ ہم امید کرتے والے "نیک نام" نمودار نہیں سرکاری افسران و سیاست دان بہت جلد الزام کی گرفت میں آنے والے ہیں ان شاءاللہ۔



مشہور نو مسلم مریم جمیلہ سے پیار کرنے والے پاکستانی راہنما کا جذبات انگیز خاکہ

ماریہ خانم





حیرت انگیز جنگی معرکہ

بریگیڈیر (ر) سید لیاقت بخاری



بھارت ... کا سامنا

عاصم محمود



محمد ناصر خاں

فرزانہ نکہت

ناقابل فراموش سچا واقعہ



تحیر و اسرار میں لپٹی سحر انگیز کہانی

ممتاز مفتی

موسم برسات کا تحفہ آم

محمد خلیل چوہدری





ایران کے ممتاز صوفی شاعر

دور جدید میں بھی پاکستانی معاشرہ ان سے نہ بچ سکا



پرویز مشرف کے دور حکومت میں جب ٹی وی چینلوں کے لائسنس جاری ہوئے تو خوشی کا احساس ہوا کہ الیکٹرانک میڈیا ایک آزاد فضا میں فروغ پائے گا جس کی بدولت عوام کے تہذیبی اور سیاسی شعور میں اضافہ ہوگا۔ پی ٹی وی نے اپنی روایات کے ساتھ سفر کا آغاز کیا اس کے بعد چینل پر چینل کھلتے گئے اور ساتھ ہی ان میں بنیادی اخلاقیات نظر انداز ہونے لگے۔ "بریکنگ نیوز" کلچر نے ایڈیٹر کا منصب بری طرح متاثر کیا اور جلد بازی میں غیر مصدقہ خبریں نشر ہونے لگیں۔ ٹاک شوز میں ایسے ایسے طوفان اٹھائے جاتے ہیں کہ ذہنی سازش کے تحت ہیجانی انتشار پھیل رہا ہے۔ سیاست دان آپس میں اس طرح الجھنے لگے ہیں کہ ان کا وقار اور احترام اٹھتا جا رہا ہے۔ سنجیدگی اور شائستگی کی جگہ بدتمیزی اور بے ہودگی لیتی جا رہی ہے اور انتہائی نفرتوں کی جھلک سے ایک تحریکی پروگراموں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ بعض چینلوں پر اچھے پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور شعور میں اضافہ کرنے والے تجزیے بھی سننے میں آتے ہیں مگر الیکٹرانک میڈیا کو قوم کی آگاہی، ایمان اور اخلاق تربیت میں جو عظیم الشان کردار ادا کرنا چاہیے تھا، اس میں وہ بڑی حد تک ناکام رہا ہے۔ اس نے زیادہ تر ایسے مناظر پیش کیے جن سے دہشت گردی کو بڑھاوا ملا اور ریٹنگ ہی سب سے بڑی قدر قرار پائی۔

گزشتہ سال دو ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ٹی وی چینلوں کو اپنی طاقت کا نیا احساس دلایا اور ان کے طرز عمل میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ کراچی میں پاکستان کے معروف صحافی اور ٹی وی اینکر جناب حامد میر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جیو ٹی وی نے اس قاتلانہ حملے کا ذمے دار آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل ظہیر الاسلام کو ٹھہرایا اور ان کی تصویر دکھانے کے ساتھ یہ الزام بار بار دہرایا جاتا رہا۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ یہ پروگرام رکوانے میں ناکام رہی اور یہ امر انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ پاکستان بلکہ دنیا کی ایک طاقتور انٹیلی جنس ایجنسی پر سات آٹھ گھنٹوں کی یلغار سے مختلف اداروں اور شخصیتوں کو احساس دلایا گیا کہ نیوز چینل کس قدر طاقتور ہو گیا ہے چنانچہ ایک طرف بیشتر چھاؤنیوں میں "جنگ" اور "جیو" پر پابندی لگا دی گئی اس کی گاڑیاں بھی نذر آتش کی گئیں اور اشتہارات بند کرنے کی مہم بھی چلائی گئی۔ جناب میر شکیل الرحمان کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف اس ادارے میں جیو کے مدمقابل ایک ٹی وی چینل لانے کا فیصلہ ہوا۔ اس مقصد کے لیے ایک نام نہاد آئی ٹی کمپنی ایگزیکٹ کو چنا گیا جس نے بڑے بڑے صحافیوں پر پیسے کی بارش کا سلسلہ شروع کر دیا اور بڑے جگادری صحافی بھی کھنچے چلے آئے۔

تھے۔ راز دان کہتے ہیں کہ جناح ٹی وی چینل خرید کر اس کا نام "بول" رکھا گیا۔

ایگزیکٹ آئی ٹی کمپنی نے راولپنڈی اور کراچی میں عالیشان دفاتر تعمیر کیے جہاں بروقت بڑی تعداد میں نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ نیز بڑے شہروں میں "بول" کے اشتہار والی سیکڑوں ٹرانسپورٹ گاڑیاں گھومتی نظر آتی تھیں۔ اس کمپنی نے ناقابلِ تصور مشاہروں اور مراعات کے علاوہ نئی گاڑیوں کے عوض بڑے بڑے اینکرز پرسنز کی خدمات حاصل کیں۔ یہ کمپنی دعویٰ کرتی رہتی کہ وہ دنیا کی بہت بڑی آئی ٹی کمپنی ہے، مگر کسی صحافی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آئی ٹی میں اس کی ایجادات کیا ہیں اور اس نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے کس شعبے میں غیر معمولی مہارت حاصل کی ہے۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ بڑے بڑے معاملات میں تفتیش و تحقیق کی شہرت رکھنے والے صحافی بڑی آسانی سے اس کے فریب کا شکار ہو گئے۔ ایسا لگا کہ کوئی نادیدہ طاقت وہ کام کر رہی ہے جو جیو ٹی وی چینل سے چھوٹے کارندے بھی توڑ کر لا رہی تھی اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ ایک نئے طاقت ور چینل کے ذریعے اقتدار میں اپنے پسندیدہ عناصر داخل کر کے ان کا تحفظ کیا جائے گا۔

انہی دنوں جناب عمران خان کا اسلام آباد میں دھرنا شروع ہو گیا اور بیشتر ٹی وی چینل انھیں روزانہ صبح و شام کوریج دینے لگے۔ ان کے اندر زعم پیدا ہو گیا تھا کہ وہ حکومت کو گرا کر اور عمران خان کو وزیراعظم بنا کر دم لیں گے۔ کچھ ساعتوں کے لیے محسوس بھی ہوا کہ زلزلے کا آخری جھٹکا لگنے والا ہے، مگر یہ ہیجانی دور خیر و عافیت سے گزر گیا تاہم منظر نامے سے الیکٹرانک میڈیا کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا اور "بول" کو "لانچ" کرنے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ بدقسمتی سے ایگزیکٹ کے خلاف نیویارک ٹائمز میں ایک سنسنی خیز مضمون شائع ہو گیا جو عالمی سطح پر پاکستان کی رسوائی کا باعث بنا اور یہ راز فاش ہوا کہ یہ کمپنی جعلی ڈگریوں کا کاروبار کرتی ہے اور اس نے تین سو سے زائد جعلی یونیورسٹیاں بھی قائم کر رکھی ہیں۔ تب اسلام آباد میں وزارت داخلہ حرکت میں آئی اور تحقیقات کا عمل شروع ہوا۔ وہ بڑے بڑے سیٹھ جو اس گھناؤنے کاروبار میں شامل تھے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر رہے ہیں۔ جرائم کی فہرست دل دہلا دینے والی ہے۔ شفاف تحقیقات کے ذریعے تمام حقائق سامنے آنے چاہئیں تاکہ الیکٹرانک میڈیا میں پرورش پانے والے خطرناک رجحانات پر قابو پایا جا سکے اور دلوں میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ دولت کی ہوس انسان کو کتنی ہولناک گراوٹ سے دوچار کر دیتی ہے جبکہ بڑے کام وہی اولوالعزم کر سکتے ہیں جو اخلاقی طاقت سے لیس ہوتے ہیں۔ معاشرے کو جعلی شخصیتوں اور اداروں کی سخت نگرانی اور کڑا احتساب کرنا ہو گا اور ایسی ذہنیت کو شکست دینا ہو گی جو آئینی اور جمہوری طریقوں کے بجائے حکومت گرانے اور اپنے لیے اہل ہوس کو اکساتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں علم فروشی جو گل کھلا رہی ہے اس کی روک تھام بھی ازبس ضروری ہے۔

الطاف حسن قریشی

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

کے ساتھ خصوصی انٹرویو

انٹرویو پینل: الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی، کامران الطاف



اتوار کا دن اور رمضان شباب پر تھی۔ میں اتنی چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایوان صدر اسلام آباد سے فون تھا۔ صدر پاکستان کے سیکرٹری جناب احمد فاروق لائن پر تھے جن کے والد بزرگوار سے ہمارے دیرینہ مراسم چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ۲۰ رمضان کو ایوان صدر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں پورے ملک سے دانشوروں کو مدعو کیا گیا ہے جنہوں نے پاکستان بنتے دیکھا اور آزادی سے متعلق ہر واقعے کو جانا ہے۔ انہوں نے مجھے بھی صدر مملکت کی طرف سے شرکت کی دعوت دی۔ میں نے بتایا میری آنکھ میں تکلیف ہے اور دن کے وقت نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کہا ہم بھی اسی حساب سے رکھیں گے کہ آپ رات کے وقت تشریف لائیں۔ مگر جب فون موصول ہوا، اس دن میری طبیعت [illegible] تھی۔ میں معذرت کرنے ہی والا تھا کہ صدر صاحب کے پرنسپل سیکرٹری جناب فواد حسن فواد کا فون آ گیا جو شعبہ حکومت میں پیشہ وارانہ مہارت اور اعلیٰ اخلاق کی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہم آپ کے لیے [illegible] حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آدھ گھنٹے بعد اطلاع آئی کہ بندوبست ہو گیا ہے اور اب آپ رات میں [illegible] کے لیے [illegible] فون آیا کہ ملاقات چار گھنٹے لیٹ ہے اور ہم آپ والی پوزیشن کے بارے میں اطلاع دیتے رہیں گے۔

مجھے اس ملاقات کا بے چینی سے انتظار تھا کہ اس میں تاخیر ہوتی رہتی ہے۔ میں اپنے طور پر ملاقات [illegible] سے کئی بار پوچھتا رہا اور جواب یہی ملتا رہا کہ [illegible] کے ساتھ نہیں ہو سکتے کہ ملاقات کب ہو رہی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک صاحب نے اطلاع دیتے ہوئے جواب دیا کہ ملاقات پانچ بجے ہو رہی ہے۔ وقت کم تھا ہم اسی وقت روانہ ہو گئے۔ راستے



پی آئی اے کے ٹکٹ سے رابطہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تو ناکامی ہی رہی۔ مارچ کے ایک روز ایک صاحب نے آ کر انھوں نے
مجھ سے کہا کہ آپ اطمینان سے آ جائیے، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ پونے بارہ بجے کے وقت پہنچا تو ایک بلند قامت شخص وہاں
کھڑے تھے۔ انھوں نے بتایا فلاں کا فون ہوا ہے۔ میں نے کہا ان پر ولائت سے تو آئے ہو چکے ہیں، آرام بخش اور میں
محمد مشتاق کی دعوت پر اسلام آباد جا رہا ہوں۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے: جی ڈاکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ چند
منٹ بعد انھوں نے ٹکٹ لے کر بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا۔ آگے بڑھا تو سامان کی ایک بار چیکنگ ہوئی اور میں اس جگہ سے
آیا جہاں بورڈنگ کارڈ اور مجھے سامان پر ٹیگ اسٹیپل کر دی جاتی تھی۔ وہیں ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان سے بات میں نے
تعجب سے پوچھا تو مسکراتے ہوئے بولیں کہ اب سے آپ اس پابندی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا کہ آئی ڈی
کارڈ بھی آئی۔ مسافروں کی ... میں ایک مدت سے پابندی تھی یا جاتی کہ ... ٹیگ لگا کر آ گئیں۔ میں نے دل ہی دل
میں ان خاتون کا ... کا کام ہی صرف بورڈنگ کارڈ اور ٹیگ پر اسٹیپل لگانا تھا۔

میں نے ... پہنچا جہاں بورڈنگ کارڈ کی چیکنگ ہوتی اور شناختی دستاویز بھی جانچی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دو بار پہلے
مجھے شناختی دستاویز ... کے جہاز میں سوار ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون تھیں جو موبائل فون پر کسی سے
باتیں کر رہی تھیں۔ ... ان کی توجہ کا طالب ہوا ... میں نے پوچھا آپ کی اجازت کی ضرورت
تو نہیں ... اجازت مانگ رہی تھی۔ انھوں نے میرا بورڈنگ کارڈ دیکھے بغیر جہاز کے اندر جانے
کی اجازت دے دی۔ میں سوچتا رہا کہ ۱۹۹۳ء سے ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہوں ... ہر بار سامان کی اسکریننگ کا پانی اور



پوری تک ڈورا اور نیگ کی بار بار چیکنگ ہوتی جو بالکل غیر ضروری معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے محلے کا باشندہ آصف صدیقی کے بعد اس نسل کے غیر ضروری ہونے کا احساس ہوا ہے۔ اسی لیے یہ جو زبان پر آئی کہ ہمارے اداروں نے عوام پر جو غیر ضروری بوجھ ڈال رکھے ہیں انہیں اتارنے کا بھی جلد احساس ہو جائے۔ میں بہت خوش تھا کہ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور جناب شجاعت عظیم نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک عمر کا سفر کرلیا ہے اور ہوسکتا ہے وہ کسی مرحلے پر دینے کی تیاریاں کررہے ہوں۔

ایوان صدر پہنچا تو دوستوں سے مل کر بڑی شادمانی ہوئی۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق اور سابق صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ، مشیر خارجہ سرتاج عزیز، سابق اسپیکر قومی اسمبلی الٰہی بخش سومرو اور سابق ڈپٹی اسپیکر قومی اسمبلی جناب ظفر علی شاہ بھی شامل تھے۔ جسٹس (ر) محبوب احمد اور جسٹس (ر) خلیل الرحمان اور جسٹس (ر) آفتاب فرخ کے علاوہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) طلعت مسعود اور انجینئر اقبال ملک بھی مدعو تھے۔ بلتستان سے نائیک لطف اللہ آئے جن کی عمر ۱۰۰ سال تھی اور انہوں نے بلتستان کی آزادی میں حصہ لیا ہوا تھا۔ ممتاز صحافی مجیب الرحمان شامی اور زاہد ملک کی گفتگو نے بڑا حوصلہ دیا جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بلند قامت لیڈر نواب اسماعیل خان کے نواسے اور بانی نظر صاحبزادی عطیہ نے تاریخ سے شدید اپنی باتوں سے ایک سماں باندھ دیا۔ یہاں ایڈووکیٹ آزاد بن حیدر بھی موجود تھے جنہوں نے مسلم لیگ کی تاریخ مستند حوالوں سے لکھی ہے۔ یہ تقریب ڈھائی گھنٹے جاری رہی اور محسوس ہوا کہ تاسیس پاکستان کی روایت تازہ ہوئی ہے۔ جناب ممنون حسین کی کاوشوں سے ایوان صدر میں پاکستان سے محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور قومی تشخص کے جذبے انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ وہ اس وقت تقریب سے پہلے یوم پاکستان کے حوالے سے متعدد تقاریب منعقد کرچکے ہیں جن کا بنیادی مقصد مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے اہل علم و فضل ارباب



شعر و ادب اور اہلِ تصوف اور اقلیتوں کو آزادی کی خوشیوں میں شامل رکھنا اور ان سے استفادہ کرنا تھا۔ ہمیں سابق صدر آصف علی زرداری کے عہد میں بھی ایک دو بار یہاں آنے کا موقع ملا' تب فضا مختلف تھی۔ ان کی پرورش بے راہروی کے ماحول میں ہوئی جبکہ جناب ممنون حسین کی تربیت میں اخلاقی و اسلامی قدروں اور جہدِ مسلسل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ ان کا سفر بر چیش کش ٹھکرانے سے شروع ہوا اور الحمدللہ اب بھی جاری ہے۔

تقریب کے آغاز اور اختتام پر صدرِ مملکت نے جن خیالات کا اظہار کیا' وہ مختصر نہایت جامع اور فکر انگیز تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے میں بگاڑ کا سب سے بڑا سبب پاکستان کے مقاصد سے انحراف اور اخلاقی قدروں کی پامالی ہے۔ ہمیں معیاری تعلیم کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی تربیت پر خاص توجہ دینا ہوگی اور کرپشن کے خلاف مسلسل جہاد کرنا ہوگا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ پاکستان ایک سیاسی معاشی اور دفاعی طاقت کے طور پر اُبھر رہا ہے اور چین پاکستان راہداری سے اس خطے کی قسمت بدلنے والی ہے۔ امکانات ہماری دہلیز تک آ پہنچے ہیں اور ہمیں ان کو بروئے کار لانے کے لیے دن رات محنت اور دیانتداری کا چلن عام کرنا ہوگا۔ ان کا ایک ایک لفظ یقین کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور اُمید کے نور سے منور تھا۔ انہوں نے اعلان کیا میں نے کرپشن کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اور میں ہر محاذ پر اس ناسور کے خلاف لڑتا رہوں گا اور یہ خوشخبری دی کہ آذربائیجان بھی پاکستان کو بہت بڑی اقتصادی قوت بنانے میں مدد کرنے والا ہے۔ حاضرین کی طرف سے عمدہ تجاویز سامنے آئیں جن میں اس بات پر اتفاق پایا گیا کہ تعلیم کے ذریعے ہی حقیقی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس امر پر بھی اتفاق تھا کہ علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو اپنا اصل مقام دیا جائے کیونکہ تخلیقی عمل قومی زبان ہی میں ترقی پاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مقتدرہ قومی زبان کو مضبوط اور فعال ادارہ بنایا جائے اور حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے میڈیکل اور انجینئرنگ کے جو مضامین اردو میں منتقل کر دیے تھے اس عظیم الشان ذخیرے کا سراغ لگایا جائے۔

یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ جن مصنفین اور محققین نے قومی مشاہیر اور تحریکِ پاکستان پر تحقیقی کام کیا ہے ان کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ یہ اہم نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ ہر سطح پر قیادت کا فقدان پایا جاتا ہے' اس کا ایک بڑا سبب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ تنظیموں پر سالہا سال سے پابندیاں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ پہلے طلبہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے اور قابلیت کی بنیاد پر آگے بڑھتے تھے۔ یہ تقریری مقابلے پاکستان بھر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں منعقد ہوتے اور طلبہ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے۔ یوں تقریری مقابلوں میں فتح پانے والے طلبہ پورے ملک میں جانے پہچانے جاتے اور شہرت پاتے تھے۔ اس طرح قومی یک جہتی کو بہت فروغ ملتا، ٹیلنٹ نشوونما پاتے اور نوجوان نسل کو قومی زندگی میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا۔ آج سیاسی جماعتوں میں جہاں بھی کوئی جوہر دکھائی دیتا ہے' وہ طلبہ تنظیموں کی ہی پیداوار ہے۔ چنانچہ یہ لازم آتا ہے کہ طلبہ کی تنظیمیں بحال کی جائیں' تقریری مقابلوں کا ملک گیر سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جائے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے سازگار

ماحول فراہم کیا جائے۔ حکومت طلبہ سے مذاکرات کے ذریعے یہ معاہدہ طے کر سکتی ہے کہ وہ نظم و ضبط کے پابند رہیں گے۔ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مثبت استعمال اور ثقافتی روایات کی پاسداری کریں گے۔ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس لیے بنجر بنتا جا رہا ہے کہ ذہن سازی اور قیادت سازی کے فطری راستے بند چلے آ رہے ہیں۔

ایوان صدر میں خوشیوں کا سماں تھا اور چہروں پر ایک سرشاری عیاں تھی۔ ممنون حسین صاحب چالیس پچاس کے لگ بھگ مہمانوں میں گھل مل گئے اور فوٹو سیشن دیر تک جاری رہا۔ جب مجمع چھٹا تو میں نے ان سے انٹرویو کے لیے وقت مانگا اور کسی تامل کے بغیر ۲۱ مئی کو سات بجے شام کا وقت مقرر ہو گیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں جناب ممنون حسین کے ساتھ ہونے والی اپنی ملاقاتیں یاد کرنے لگا۔ دوسری طرف لاہور ٹیلی فون کر کے عزیزم طیب اعجاز قریشی اور عزیزی کامران الطاف قریشی کو انٹرویو میں شامل ہونے کے لیے بلایا۔ ان کے ساتھ عرشیان بھی آنے کے لیے تیار ہو گیا جو زمانہ طالب علمی ہی میں فوٹوگرافی کی خاص مہارت رکھتا ہے۔ اگلے روز جناب انعام الحق جاوید نے نیشنل بک فاؤنڈیشن آنے کی دعوت دی۔ وہاں گیا تو حیرتوں اور مسرتوں میں ڈوب گیا۔ انھوں نے کتابوں کا ایک ایسا خوبصورت عجائب گھر تیار کیا ہے جو روح کو آسودگی بخشتا ہے اور دل کے اندر کتاب کی محبت جاگزیں کرتا ہے۔ وہاں کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد علامہ اقبالؒ، ابوالاثر حفیظ جالندھری، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کے مجسمے دیکھے۔ ایک عجب نگار خانہ تھا اور جب باہر آیا تو احساس ہوا کہ جنت سے نکال دیا گیا ہوں۔ تبدیلی کے عمل کا اداروں میں بھی ظہور ہو رہا ہے۔

کراچی میں میرے سب سے عزیز دوست جناب نصیر احمد سلیمی رہتے ہیں۔ وہ پورے پاکستان میں عام طور پر اور سندھ میں بطورِ خاص ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے گھر پر بارہا قیام کیا اور ان کے ساتھ بڑی بڑی صحافتی مہمات سر کی ہیں۔ جناب ممنون حسین جب سندھ کے گورنر بنے اور پھر ایک ڈیڑھ سال بعد ہٹا دیے گئے تو نصیر سلیمی مجھے ان سے ملانے ان کے گھر لے گئے۔ یاد پڑتا ہے کہ برنس روڈ پر گلی میں ان کا درمیانے درجے کا گھر تھا۔ ان سے باتیں ہوئیں اور مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور انہیں کلاسیکی شعرا کے ہزاروں شعر یاد ہیں۔ ان کی سادہ طبیعت سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ کسی قسم کے احساس کہتری یا برتری میں مبتلا نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں۔ ان کی کشادہ پیشانی سے احساس ہوا کہ وہ عملی فراست اور غیر معمولی قوت ارادی کے مالک ہیں۔ دوسری ملاقات ڈیفنس میں ان کے کشادہ گھر پر ہوئی۔ اس وقت نواز شریف اور ان کا خاندان جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور جناب ممنون حسین مسلم لیگ کا پرچم بڑی جاں فشانی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہیں فیلڈ میں کام کرنے اور سیاسی کارکنوں سے تعلق استوار کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ خیالی پلاؤ پکانے سے مکمل اجتناب کرتے ہیں۔ یہ راز بھی کھلا کہ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے چھوٹے سے کاروبار پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ ان سے ایک ملاقات جناب حلیم صدیقی کی رہائش گاہ پر بھی ہوئی تھی جو ۱۹۹۷ء میں مسلم لیگ نون کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اس ملاقات میں جناب ممنون حسین سے ان کی تعلیم کے بارے میں باتیں ہوئیں اور انہوں نے بتایا کہ آئی بی اے (IBA) میں داخلہ پانے والوں میں ان سے ایک

جناب ممنون حسین کی تربیت میں اخلاقی و اسلامی اقدار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے

سال سینئر تھے اور انہوں نے وہاں سے ایم بی اے کیا ہے۔ ان کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ انہیں سیاست اس لیے پسند نہیں کہ کارکن عزت نفس سے اکثر محروم رہتے ہیں اور انہیں سیاسی فیصلوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ حالات کی سنگینی کے باوجود وہ پُرامید تھے کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا، باطل کا چہرہ فق ہوگا اور حق غالب آئے گا۔

☆☆

ہم سات بجے شام ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ دس منٹ بعد مغرب کی اذان ہوئی اور ہم نے صدر مملکت کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں آ بیٹھے۔ صدر صاحب کی کرسی کے ایک جانب پاکستان اور دوسری طرف صدر کا پرچم تھا اور اوپر قائداعظم کی تصویر۔ اے ڈی سی نے بتایا آپ کے لیے آدھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اتنے میں جناب فاروق عادل آ گئے۔ میں نے کہا، آدھ گھنٹے میں تفصیلی انٹرویو نہیں لیا جا سکے گا۔ انھوں نے کہا آپ وقت کی فکر مت کریں، ہمارے صدر محترم موقع و محل کی اہمیت خوب سمجھتے ہیں۔ وہ کھلے ذہن کے آدمی ہیں۔ صدر مملکت تشریف لے آئے، تو ہم تعظیماً کھڑے ہوئے اور اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ کچھ اس طرح چل نکلا کہ الفاظ کا دریا بہنے لگا۔ میں نے ان سے کہا، آپ کے خیالات جاننے سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کن کن مراحل سے گزر کر اس منصب جلیلہ تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے کسی لیت و لعل کے بغیر کہنا شروع کیا:

''میں اس سال پیدا ہوا جب منٹو پارک میں قرارداد لاہور منظور ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۴۰ء کا سال تھا اور میری پیدائش آگرہ کی ہے۔ تعلیم کی عمر تک پہنچتے وقت ہمارے خاندان میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔''

ان کے ابتدائی جملوں ہی نے ہمیں چونکا دیا۔ قدرتی طور پر پوچھا کس نوعیت کا واقعہ تھا۔ انہوں نے تفصیل بتانا شروع کی:

''میرے کزن ایک اسکول میں پڑھتے اور شاید آٹھویں جماعت کی ٹیوشن لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مضمون میں وہ پاس نہیں ہو سکیں گے۔ ان کے استاد نے انھیں پاس کرا دیا۔ اس پر میرے والد صاحب کے ذہن میں یہ تاثر بیٹھ گیا کہ اسکولوں کے معاملات میں بڑی خرابی ہے اس لیے انھوں نے ہمیں اسکول میں داخل ہی نہیں کرایا۔ تعلیم کی اہمیت وہ خوب سمجھتے تھے چنانچہ نہایت اچھے اور قابل اساتذہ ہمیں پڑھانے کے لیے گھر پر مقرر کر دیے گئے۔ وہ اس قدر زیادہ پڑھاتے کہ کبھی کبھی ہمیں یہ احساس ہوتا کہ ہمارے والد بڑے ظالم ہیں۔ یہ تو ہمیں کھیلنے کودنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ صبح سے شام تک بس پڑھتے رہو۔ کوئی سات آٹھ اساتذہ پڑھانے آتے۔ ایک انگریزی کے ایک عربی، فارسی پڑھاتے، دوسرے تاریخ پڑھاتے تھے۔ ایک ریاضی کے لیے مخصوص تھے۔ ایک صاحب صرف تختی لکھنے کی مشق کراتے۔ پھر انھوں نے مولوی عبدالغفور کو ہمارا اتالیق مقرر کر دیا۔ وہ چار وقت کی نمازیں ہمیں جماعت کے ساتھ پڑھانے لے جاتے۔ کھیل کود کے لیے جو وقت ملتا، وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل کر گزار لیتے۔ کیونکہ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ممانعت تھی۔ پھر یہ ہوا کہ عصر اور مغرب کے درمیان مولوی عبدالغفور ہمیں پارک یا دریا کے کنارے سیر و تفریح کرانے لے جاتے۔ وہاں کے پیچھے بڑے اچھے ہوتے جو ہم بڑے شوق سے کھاتے تھے۔''

"کیا آپ کراچی کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے پیچھے کا ذکر آنے پر پوچھ لیا۔

انھوں نے آہستگی سے کہا۔ جی ہاں ہم کراچی آ گئے تھے۔ دراصل میری زندگی کہانی در کہانی ہے۔ ہوا یہ کہ جب پاکستان کا اعلان ہوا تو اس سے دو تین ماہ قبل میرے دادا اظفر حسین اور والد حاجی اظہر حسین کے درمیان تبادلہ خیال ہوا کہ ابھی آثار ایسے ہیں کہ شہر میں قتل و غارت بہت ہوگا۔ دادا جان نے والد صاحب سے کہا تم یہاں سے کسی مسلم ریاست میں چلے جاؤ' چنانچہ میرے والد دو تین ماہ تیاری کر کے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں اپنا کاروبار شروع کیا۔ پھر وہ ہمیں بھی لے کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔"

جناب ممنون حسین چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے واقعات بیان کرتے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا آپ کے والد کا کاروبار کیا تھا انھوں نے بتایا:

"ان کی جوتوں کی فیکٹری تھی۔ دراصل آگرہ جوتے کے کاروبار میں مشہور تھا۔ میرے دادا اور والد کے الگ الگ کارخانے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب حیدر آباد دکن میں پولیس ایکشن ہوا تو والد صاحب بہت پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ ہمارا یہاں آنا بے کار ثابت ہوا۔ تب ہمارے دادا پھر ہمیں لینے حیدر آباد دکن آئے۔ ہم وہاں سے آگرہ اور بعدازاں کراچی منتقل ہو گئے۔ اس دوران ہمارے والد صاحب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جائیداد نہیں بنانی چاہیے۔ یہی تربیت ہمیں بھی ملی۔



"ہم نے کراچی میں دو اپارٹمنٹ لے لیے تھے لیکن یہ ذہن میں بیٹھ گیا تھا کہ کوئی بڑی جائیداد بنانے کی ضرورت نہیں حالانکہ ہم نے پاکستان کی تاریخ میں یہ دیکھا کہ جن لوگوں نے اپنے فاضل پیسے جائیداد میں لگائے' ان کی مالی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھیں۔ زینب عبداللہ ان کا نام تھا' وہ یوپی کی رہنے والی تھیں۔ وہ ایک دن میرے والد صاحب کے پاس آئیں۔ یہ غالباً ۵۴ء یا ۵۵ء کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ حاجی صاحب! میں زمین خرید رہی ہوں جو میری ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ اس میں سے آدھا حصہ آپ لے لیں۔ وہ دس ہزار گز کا پلاٹ ہے۔ مجھے ہسپتال اور اپنا مکان بنانا ہے اور میرے لیے پانچ ہزار گز کافی ہیں۔ والد صاحب نے پوچھا زمین کی قیمت کتنی ہے۔ انھوں نے بتایا تین روپے فی گز۔ والد صاحب نے کہا آپ لے لیجیے اور میں صبح پندرہ ہزار روپے بھیج دوں گا۔ رات کو انہیں خیال آیا کہ ہم نے تو یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ جائیداد نہیں بنائیں گے۔ دوسرے دن صبح فجر کی نماز پڑھ کر سیدھے ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میرے لیے زمین مت خریدیے کہ میں نے تو یہ عہد کر رکھا ہے جائیداد نہیں بناؤں گا۔"

مجھے جناب ممنون حسین کی زندگی پر رشک آنے لگا۔ ان کی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے۔ غریب

پڑھانے کے لیے ساتھ اساتذہ مقرر ہوں' نماز کی پابندی کا خیال رکھا جاتا ہو اور والد صاحب کو جائیداد بنانے کا ذرا بھی شوق نہ ہو۔ اس لڑکے کی تعلیمی اور اخلاقی بنیادیں کس قدر مستحکم ہوں گی' اس کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو باطن کی عظمت کا ادراک رکھتے ہیں۔ ممنون صاحب کی طالب علمی کا زمانہ اگرچہ نت نئے تجربات میں گزرا' مگر ہر تجربہ ان کی خداداد صلاحیتوں کو صیقل کرتا گیا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"جب ۲۰۰۳ء میں میرے دوسرے بیٹے کی شادی کا موقع آیا تو ہم پرنس روڈ کے اپارٹمنٹ سے شفٹ ہوئے۔ اس وقت ڈیفنس میں پلاٹ سستے تھے۔ یہ تقریباً ۲۰۰۱ء کی بات ہوگی کہ ہم نے وہاں ایک پلاٹ خریدا اور اس پر مکان بنا کر شفٹ ہوئے۔ ایک دن بڑا عجیب واقعہ پیش آیا جو بظاہر معمولی سا تھا' مگر اس سے میری زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی۔ ہمارے والد صاحب نے آرام باغ میں ہمیں کورڈ نیٹ (Covered net) لگا دیا تھا کہ ہمیں کرکٹ کا شوق تھا اور آرام باغ کا گراؤنڈ چھوٹا تھا۔ جب کوئی بڑا اسٹروک مارتا' تو گیند باہر جا گرتی۔ وہاں فرنیچر کی مارکیٹ تھی اور دکان داروں سے کئی مرتبہ جھگڑا ہوا' لہٰذا انہوں نے ہمیں کورڈ نیٹ لگا دیا۔ آس پاس کے لڑکے کھیلنے آنے لگے۔ ہم نے آرام باغ کرکٹ کلب بنائی اور سب اکٹھے کھیلتے تھے۔ ہمارے ایک دوست شریف الحسن جو بعد میں یونین ٹیکساس میں وائس پریذیڈنٹ بنے' ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم ان کو شفو شفو کہتے تھے۔ اسے انگریزی بولنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز اس نے انگریزی کا جملہ کہا تو میں نے کہا یہ جملہ غلط ہے۔ اس نے جواب میں کہا میں نے میٹرک کیا ہے اور تم تھرڈ پڑھتے ہو' مجھے کیا سکھا رہے ہو؟ تب ایک دم احساس ہوا کہ یہ تو بڑی خطرناک بات کہہ رہا ہے اور ہمیں بھی میٹرک کر کے آگے پڑھنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یہ ۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے۔"

جناب ممنون حسین ایک اچھے داستان گو کی طرح چھوٹی چھوٹی تفصیلات بڑے اثر انگیز انداز میں بیان کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا اس احساس کا نتیجہ کیا نکلا۔ انہوں نے رواں لہجے میں بتانا شروع کیا:

"میں اور میرے بڑے بھائی اختر حسین جو میرے ساتھ پڑھتے تھے' جامع کلاتھ بازار گئے اور میٹرک کا نصاب خریدا۔ غور سے مضامین کا جائزہ لیا۔ ہم نے جنرل سائنس نہیں پڑھی تھی' مگر باقی سب مضامین ہمیں آتے تھے۔ ہم نے داخلہ بھیج دیا اور سائنس کو رٹا لگانے لگے۔ اگر ہم بارہ گھنٹے روزانہ پڑھتے' تو آٹھ گھنٹے صرف سائنس پڑھتے تھے۔ ہم نے اختیاری مضامین تاریخ اور عربی رکھے۔ قدرت کی حکمت دیکھیے کہ ۱۹۵۳ء میں میرے والد صاحب ہم دونوں بھائیوں کو عالم بنانا چاہتے تھے' چنانچہ ہمیں ایک مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ ہم نے وہاں تقریباً ۱۹۵۵ء تک ڈھائی پونے تین سال درس نظامی پڑھا۔ یہ وہی مدرسہ تھا جو آج کل دارالعلوم نعیمیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہمارے استاد مولانا محمد نعیمی تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی تقریب میں مولوی صاحب آتے تو کہتے کہ ملا میاں آؤ۔ ہم نے جی میں ٹھان لی کہ ہم ملا نہیں بنیں گے اور مدرسے کو خیرباد کہہ دیا۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ میٹرک کی عربی بہت آسان لگی۔ ہم دونوں بھائیوں نے اچھی سیکنڈ ڈویژن میں پرائیویٹ طور پر میٹرک امتحان پاس کیا اور

زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔''

جناب ممنون حسین کی زندگی کے واقعات داستان ہوشربا کی طرح بڑے دلچسپ اور تغیر آشنا تھے۔ قدرت انہیں کسی بڑے کام کے لیے تیار کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے واقعات جنم لے رہے تھے جو ان کے اندر خودداری اور خود اعتمادی کے اوصاف کی پرورش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں کوئی تعطل پیدا نہیں ہونے دیا اور بات جاری رکھی:

''ہم کاروباری لوگ تھے اس لیے کسی کامرس کالج میں داخلہ لینے کا فیصلہ ہوا۔ اس زمانے میں کراچی میں گورنمنٹ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس سب سے اچھا اور بہت مشہور کالج تھا۔ ہم وہاں پہنچے اور داخلے کا فارم بھر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ سلطانہ بیگم جو ایک پروفیسر اور علی گڑھ یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی تھیں ہمارا انٹرویو کر رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا تم نے اسکول کے خانے میں کسی اسکول کا نام درج نہیں کیا۔ میں نے بتایا ہم اسکول ہی نہیں گئے۔ ''اسکول نہیں گئے کیا مطلب؟'' انہوں نے تفصیل پوچھی تو پوری کتھا سنا دی۔ وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئیں، اٹھ کر چلی گئیں اور کالج کے تین چار پروفیسر اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ کہنے لگیں دیکھیے یہ مخلوق ہے جو کبھی اسکول ہی نہیں گئی۔ مجھے ان کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے بعد پروفیسر مسعود الحسن نے مارک شیٹ اور ہمارا فارم دیکھا اور کہا یہ اسکول گئے یا نہیں گئے، ان کی مارک شیٹ یہ بتاتی ہے کہ ہمیں ان کو داخلہ دینا چاہیے۔ اس طرح ہمیں داخلہ مل گیا اور ہم نے وہاں سے بی کام آنرز کیا۔ یہ واحد بیچ (Batch) تھا جس نے کامرس فیکلٹی میں آنرز کیا۔''

جناب ممنون حسین ہمیں ایک اور حیرت کدے میں لے آئے تھے۔ میرے اندر یہ معلوم کرنے کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ اس بیچ کو کیا خصوصیت حاصل تھی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے ایک اور راز افشا کیا:

''ایوب خان نے انٹر کے بعد ڈگری کورس تین سال کا کر دیا تھا اور طلبہ اس کے خلاف شدید احتجاج کر رہے تھے۔ انہوں نے آپشن دیا کہ جو طلبہ چاہیں تو ڈگری کے بعد ایم اے میں داخلہ لے لیں۔ ہم نے سوچا ہمیں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا ہے اور ایڈوانس اکاؤنٹنٹ کی کلاس تیسرے سال میں ہے اس لیے تین سال مکمل کرتے ہیں چنانچہ تین سال مکمل کیے اور بی کام آنرز کر لیا۔ پھر ہمارے گروپ میں سے کسی نے کہا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کے بجائے ہم ایم بی اے کرتے ہیں۔ ابھی ہم اس فیصلے پر ہی غور کر رہے تھے کہ کسی نے شوشہ چھوڑا کہ سی ایس ایس کرتے ہیں۔ سلیبس دیکھا اور کتابوں پر نظر ڈالی تو ہمیں محسوس ہوا کہ یہ امتحان بڑی آسانی سے پاس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا میرے کزن نے چھ آٹھ مہینے پہلے سی ایس ایس کیا ہے چلو ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ ہم ان کے پاس گئے اور بہت ساری باتیں پوچھیں۔ آخر میں دریافت کیا تنخواہ کتنی ہے؟ انہوں نے شاید چار سو یا ساڑھے چار سو روپے بتائے۔ میں نے کہا یہ تو بہت کم ہے۔ کہنے لگے ہمیں مکان اور ملازم ملتا ہے اور دوسری سہولیات میسر آتی ہیں۔ میں نے پھر بھی یہی کہا کہ تنخواہ کم ہے۔ کہنے لگے بہت آرام سے اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب نے میرا ہاتھ دبایا اور کہا کچھ اور بھی معاملات ہوتے ہیں جن سے گزارا ہو جاتا ہے تم تفصیل میں مت جاؤ۔ ہم واپس آ گئے اور فیصلہ کیا کہ ایسی ملازمت اختیار نہیں کریں گے جس کی زندگی کے ذرائع واضح اور شفاف نہ ہوں چنانچہ آئی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں آئی بی اے میں داخلہ بڑا مشکل تھا۔''

والد صاحب کے دل میں بہت جلد یہ بات بیٹھ گئی کہ زندگی میں جائیداد نہیں بنانی

مجھے خوشی ہوئی کہ ممنون صاحب سی ایس پی افسر نہیں بنے ورنہ وہ بھی کان نمک میں جانے کے بعد نمک ہو جاتے۔ اسی لمحے مجھے احمد فاروق جیسے باشعور اور باتدبیر اعلیٰ افسروں کا خیال آیا جو ایوان صدر کا نظم و نسق نہایت احسن طریق سے چلا رہے ہیں اور عوام کو آسانیاں بہم پہنچانے کے بارے میں اپنا ذہن استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا آئی بی اے میں داخلہ بہت مشکل کیوں تھا؟ انھوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

''یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ آئی بی اے کے داخلہ ٹیسٹ کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور اور راولپنڈی کے علاوہ چٹاگانگ، ڈھاکہ اور کھلنا میں بھی ہوتے تھے۔ پانچ ہزار امیدواروں میں سے انہوں نے ایک سو طلبہ کو داخلہ دیا اور ان میں ہم بھی شامل تھے۔ دو تین مہینے خوب شوق سے پڑھا۔ فرسٹ ٹرم امتحان میں نمبر بھی بڑے اچھے آگئے' لیکن وہاں ماحول ایسا تھا کہ جماعت سے فارغ ہو، لنچ کرو اور پھر لائبریری میں پہنچ جاؤ۔ ایک باب اسی دن پڑھا کے دوسرا باب پڑھاتے اور چند ہفتوں میں پوری کتاب پڑھانے کے بعد دوسری کتاب شروع کر دیتے۔ ہمارے استاد یہ بھی دیکھتے کہ کون سے طلبہ لائبریری سے کتابیں لیتے اور گھر جا کر پڑھتے ہیں۔ ہم کالج میں کم پڑھنے والوں میں شمار ہوتے تھے لیکن نمبر ہمیشہ اچھے آجاتے۔ بس آخری دو تین مہینے بہت زیادہ محنت کی جاتی۔ کرکٹ کھیلتے' ٹیم میں ہمیں بلایا جاتا اور کبھی کبھی کلاس بھی چھوڑ دیتے' لیکن یہ خیال رکھتے کہ حاضری ۷۵ فیصد سے کم نہ ہونے پائے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں کہ ہر وقت پڑھتے رہو اور کھیلنے یا باہر نکلنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا۔ میرے دوست خواجہ قطب الدین جو بعد میں سینیٹر بنے' وہ میرے ہم جماعت تھے۔ ہم نے سوچا یہاں سے جان چھڑائی جائے کہ ہم غلط جگہ آگئے ہیں۔

''ہم کراچی یونیورسٹی پہنچ گئے' کیونکہ اس زمانے میں آئی بی اے کراچی یونیورسٹی کا حصہ تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے رجسٹرار نجم الحسن کو بلایا اور انہیں بتایا کہ یہ لوگ آئی بی اے سے یونیورسٹی کے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں آنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حساب کتاب لگایا اور بتایا کہ آپ کا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ ہم نے کہا سال ضائع نہیں ہونا چاہیے اور ہم واپس آئی بی اے آگئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہاں سے ایم بی اے کیا اور پھر دو برس رہ کے عملی تربیت کا مرحلہ مکمل کیا۔ اس کے بعد میں اپنے والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا۔ اسی دوران ایک حیران کن واقعہ رونما ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں مسلم لیگی راہنما عبدالخالق اللہ والا قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ ان سے ہمارے خاندانی تعلقات چلے آرہے تھے۔ میں ہر الیکشن میں ان کا چیف آرگنائزر رہا۔ انہوں نے کہہ سن کر مجھے کراچی مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکرٹری بنوا دیا جبکہ زین نورانی صدر تھے۔''

ممنون حسین صاحب نے ایک بار پھر تجسس پیدا کر دیا۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا جو بے حد پر سکون تھا اور پوچھا کیا اس واقعے نے بھی آپ کی زندگی کو ایک نئے تجربے سے آشنا کیا۔ انہوں نے تفصیلات بتاتے ہوئے میرے ذہن میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ وہ کہہ رہے تھے:

"دو سال بعد مجھے احساس ہوا یہ میری فیلڈ نہیں اور سیاست پیسے والوں کا کام ہے۔ میں دیکھتا تھا کہ جو سیاسی گھرانے یا سیاسی لیڈر ہیں ان کے دو چار لوگ خاص ہوتے ہیں جن کو وہ فنانس کرتے ہیں۔ یہ "خاص لوگ" محض خیالی سیاسی باتیں اور جوڑ توڑ کرتے اور بیکار وقت گزارتے ہیں۔ چنانچہ میں نے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد کاروبار میں بہت زیادہ فعال ہو گیا اور آگے چل کر ۱۹۹۹ء میں کراچی چیمبر آف کامرس کا صدر منتخب ہوا۔ اس دوران عبدالخالق صاحب ڈپٹی میئر کراچی، ایم پی اے اور ایم این اے رہے اور کوئی آٹھ دس مرتبہ میونسپل کونسلر کا الیکشن لڑ چکے تھے۔

وہ پہلی بار ووٹ مانگنے والد صاحب کے پاس آئے تو ان سے کہا آپ اپنے بیٹے سے کہیے کہ میرے لیے کام کرے۔ ہم جوان تھے اور ہمارے اندر کام کرنے کا شوق بھی تھا۔ ہم ساتھیوں نے مل ملا کر جو کام کیا، اس کی بدولت ان کو کراچی میونسپل الیکشن میں سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ یہ ایوب خان کے مارشل لا ۱۹۵۸ء سے پہلے کی بات ہے۔ ہم میٹرک کر کے فارغ ہوئے تھے۔ ان کے دل میں یہ بات پختہ ہو گئی کہ یہ بڑے زبردست کام کرنے والے نوجوان ہیں اور ان کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ آخر میں یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ میں والد صاحب سے چھٹی لے کر تقریباً ڈیڑھ دو بجے ان کے دفتر میں بیٹھ جاتا جہاں نقشے لگے ہوتے کہ کہاں کہاں پولنگ اسٹیشن ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک فہرست ہوتی کہ کتنے الیکشن دفاتر ہم نے کھولے ہیں اور وہاں کا کون کون انچارج ہے۔ میں کارکنوں کو روزانہ تحریری ہدایات جاری کرتا کہ آپ آج فلاں فلاں دفاتر میں جائیں۔ اس طرح سے مجھے عملی سیاست میں بڑا تجربہ ہوا۔



۱۹۹۳ء میں صدر غلام اسحاق خان کے ہاتھوں جب میاں نواز شریف برطرف کیے گئے تو وہ کراچی آئے۔ کسی نے انہیں بتایا کہ فیڈریشن چیمبر آف کامرس نے آپ کے ہٹائے جانے پر جو ہڑتال کی اپیل کی، وہ سلطان چاؤلہ اور خواجہ قطب الدین کے کہنے پر ہوئی تھی۔ خواجہ قطب الدین میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ہماری رفاقت کو تقریباً ۴۵ سال بیت چکے۔

"خواجہ قطب الدین اور مجھے پیغام ملا کہ میاں صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ کراچی میں خواجہ ناصر سلطان کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم ان سے ملنے گئے انہوں نے کہا مجھے کسی نے بتایا ہے کہ فیڈریشن نے جو ہڑتال کی اپیل کی، آپ دونوں کے کہنے پر ہوئی۔ آپ مجھے جانتے نہیں تو اپیل کا کیسے خیال آیا؟ میں نے کہا ہمارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پہلا بزنس دوست وزیراعظم آیا ہے جسے ناجائز طور پر ہٹا دیا گیا ہے اس لیے ہم نے فیڈریشن سے ہڑتال کی اپیل کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور ہم واپس چلے آئے۔ دوسرے دن پھر ٹیلی فون آیا کہ میاں صاحب بلا رہے ہیں۔ ہم دونوں پھر پہنچے۔ انہوں نے کہا آپ کے جانے کے بعد مجھے لوگوں نے بتایا کہ آپ سیاست میں بڑے سرگرم رہے ہیں اور مسلم لیگ کے عہدے دار بھی رہ چکے ہیں

میں نے کہا، یہ بات درست ہے، مگر میں عبدالخالق اللہ والے کے لیے سرگرم رہا ہوں۔ کہنے لگے، آپ سیاسی اعتبار سے تجربے کار ہیں اس لیے آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ میں ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ خواجہ قطب الدین نے کہا ہم آپ کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ یوں ہم مسلم لیگ میں آ گئے۔ میاں صاحب کو احساس ہوا کہ کراچی اور سندھ میں یہ بڑے کام کے لوگ ہیں جو عملی سیاست کا تجربہ رکھتے ہیں، چنانچہ ہماری اہمیت مزید بڑھتی گئی۔ وہ کبھی کبھی معاشی پالیسی کے بارے میں بھی ہم سے مشورہ کرتے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ یہ سمجھدار ہیں اور پڑھے لکھے بھی اور معاشیات کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ یوں ان کے ساتھ ہمارا تعلق قائم ہو گیا۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو سندھ سے قومی اسمبلی کی ۱۲ اور صوبائی اسمبلی کی ۱۸ نشستیں ملیں۔ بعد ازاں آزاد اور کچھ دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح ہم ۳۰ نشستوں تک پہنچ گئے۔ پھر لیاقت جتوئی نے جوڑ توڑ کر کے ایم کیو ایم کو ساتھ ملا کر ایوان میں اکثریت حاصل کر لی۔ ایم کیو ایم، مسلم لیگ، نیشنل لیگ اور جتوئی نے صوبائی حکومت بنائی۔ سینیٹ کے الیکشن کا موقع آیا، تو میاں صاحب نے کہا میں آپ دونوں میں سے کسی کو ایک سینیٹر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے فوراً خواجہ صاحب کا نام دے دیا، کیونکہ طالب علمی کے زمانے سے میں ہمیشہ ان کی لیڈرشپ میں کام کرتا آیا تھا۔ اس طرح وہ سینیٹر بن گئے۔"

صدر مملکت جناب ممنون حسین اس قدر دلچسپ انداز میں حقائق بیان کر رہے تھے کہ ہم سب دم بخود تھے اور حیران و ششدر بھی کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دولت پر اعلیٰ روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام چلن یہ ہے کہ بڑے کا ذرا موقع ملے تو قریبی دوست کی ٹانگ کھینچ کر پیچھے ہٹا دیتے اور خود عہدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ انہوں نے دوستی کا بھی حق ادا کیا اور اپنے آپ کو عہدے کی ہوس میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ اس نفسا نفسی کے عہد میں ان کی بے نفسی ہمارے اذہان پر گہرا نقش ثبت کر گئی۔ انہوں نے چائے لانے کا اشارہ کیا اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۷ء میں میاں صاحب ایوان صدر میں حلف اٹھانے کے بعد ہمارے پاس آئے۔ کہنے لگے میں لاہور جا رہا ہوں کل تک آؤں گا اور آپ دونوں کل مجھ سے ہوائی اڈے پر ضرور ملیں۔ اس سے پہلے انھوں نے یہ کہا کہ مجھے اپنی تجاویز دیجیے گا۔ چنانچہ ہم نے ایک پیپر تیار کر لیا جو ہم ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہم مقررہ وقت پر ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ صرف کرنل طاہر خلیل ہمیں جانتے تھے انہوں نے ہمیں وی آئی پی روم میں بٹھا دیا۔ میاں صاحب سے ملنے لوگ اندر جا رہے تھے لیکن ہمیں کسی نے لفٹ نہیں کرائی۔ اتنے میں دیکھا ایک آدمی دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے میرا اور خواجہ صاحب کا نام لیا اور کہا، میاں صاحب بلا رہے ہیں جو جہاز سے اترنے والے ہیں۔ ہم تیز تیز چلتے ہوائی جہاز کے قریب پہنچے اور قطار میں لگ گئے جس میں سرکاری افسر زیادہ تھے۔ میں نے دیکھا بہت سارے سرکاری افسران ایک دوسرے سے ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہیں۔ میاں صاحب جہاز سے اترے، سب سے ہاتھ ملایا اور مجھے اور خواجہ صاحب کو گاڑی میں بیٹھنے کے لیے

کہا۔ خود آگے بیٹھے اور میں، خواجہ صاحب اور اسحاق ڈار، ہم تینوں پیچھے بیٹھ گئے۔ میاں صاحب نے پوچھا کیا آپ نے تجاویز تیار کر لی ہیں۔ مجھے یاد ہے ہمارا پہلا مشورہ یہ تھا کہ سٹیٹ بینک کے گورنر یعقوب کو ہٹا دینا چاہیے' کیونکہ وہ ٹھیک آدمی نہیں' مگر میاں صاحب نے اس وقت نہیں بتایا۔ ڈار صاحب بھی ہماری تجویز سے متفق نہیں تھے۔ بعد میں ان کو احساس ہوا اور ڈیڑھ سال بعد انہیں ہٹایا۔ میاں صاحب ایک دن کہنے لگے آپ نے تو بہت پہلے مشورہ دیا تھا' لیکن اس وقت ہم نہیں سمجھ پائے تھے۔

ہم وہاں سے پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے۔ وہاں سرتاج عزیز صاحب ہم سے آن ملے۔ مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ ہم واپس کراچی آ گئے۔ اس کے بعد سندھ میں میاں صاحب جب بھی آتے ہم ہر جگہ ان کے ساتھ جاتے۔ پانچ چھے ماہ بعد میاں صاحب نے کہا کہ ہر شخص میرے سر پر کھڑا رہتا اور کہتا ہے، مجھے یہ بنا دو جبکہ آپ کچھ کہتے ہی نہیں۔ ہم نے کہا ہم اسی میں بہت خوش ہیں کہ آپ مشورے لیتے ہیں۔ کہنے لگے آپ اسلام آباد آ جائیں۔ میں نے کہا میں اسلام آباد نہیں آ سکتا' کیونکہ میرا تو بہت چھوٹا سا کاروبار ہے جسے میں خود دیکھتا اور خود چلاتا ہوں۔ اسلام آباد آ گیا' تو میرا کاروبار کون دیکھے گا؟ کہنے لگے اچھا پھر آپ کراچی میں کوئی ذمے داری لے لیجیے۔ ایک روز بعد لیاقت جتوئی کا ٹیلی فون آیا کہ میاں صاحب کی ہدایت آئی ہے کہ آپ کو ایڈوائزر لگایا جائے۔

''یوں میں سندھ حکومت میں مشیر بن گیا۔ ۱۹۹۸ء میں جب حکیم محمد سعید شہید کر دیے گئے، تو صوبائی اسمبلی معطل اور لیاقت جتوئی کی حکومت ختم ہوئی اور ہم بھی فارغ ہو گئے۔ کچھ روز بعد میاں صاحب کا فون آیا اور ایک ادارے کا نام لیتے ہوئے کہا آپ اس کے سربراہ بن جائیں اور براہِ راست مجھے رپورٹ کریں۔ یوں ہماری آپ کی قربت بھی رہے گی۔ میں ایک دم چونکا اور کہا، یہ تو انٹیلی جنس کا ادارہ ہے اور اس شعبے میں میرا کوئی تجربہ نہیں۔ کہنے لگے آپ نے مینجمنٹ پڑھی ہے اور آپ کو صرف انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے تین دن سوچنے کے لیے دیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ یہ بات آپ کسی کو بتائیں گے نہیں۔ دو روز بعد میاں صاحب کراچی آئے۔ میں نے فیصلہ سنا دیا کہ میں یہ منصب نہیں لوں گا کہ یہ میرے مزاج کے مطابق نہیں۔ میاں صاحب کے ساتھ ہم ایئرپورٹ گئے۔ اس دن میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے سرکاری افسر جھک جھک کر مجھے سلام کر رہے ہیں۔

''جب ہم ہوائی اڈے سے باہر نکلے' تو سندھ میں آئی بی کے سربراہ میرے نزدیک آئے اور کہنے لگے ''خداحافظ باس!'' میں ایک دم چونکا اور اس سے پوچھا تمہیں کیسے اس بات کا علم ہوا۔ اس نے کہا یہ بات سب کو معلوم ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے کہا یہ پاورفل آدمی ہوتا ہے اور تمام لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ میاں صاحب میرے فیصلے پر ہنسے اور کہنے لگے آپ ایک دم گھبرا گئے یا نروس ہو گئے۔ بہرحال انہوں نے مجھ پر ذمے داری نہیں ڈالی۔''

جناب ممنون حسین کی کہانی طلسم ہوشربا کی کہانی معلوم ہوتی تھی۔ انہیں جو منصب پیش کیا گیا' ایسے حاصل کرنے کے لیے لوگ کیا کیا جتن نہیں کرتے؟ مگر ان کی شخصیت کی پرورش جن اصولوں پر ہوئی' ان کا تعلق امانت' صداقت اور قناعت سے عبارت ہے۔ جب تک انسان اپنے نفس پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں کرتا' وہ خواہشات کی وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ممنون صاحب کی فطرت نے ایک غیر موزوں عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا جو روح کو تازگی بخشنے والی ایک تابندہ مثال ہے۔ ان کی باتیں سن کر بڑا لطف آ رہا تھا اور ان کے رویے اور فکر کی رفتار میں جو سبق ہے جو دیا، وہی انہوں نے باقی ماندہ زندگی سنانے میں گزار دیا۔

''بالائی آمدنی'' کا سنا، تو میں نے سی ایس ایس میں جانے سے انکار کر دیا

''اس کے بعد کراچی چیمبر آف کامرس کا الیکشن آ گیا۔ روایت یہ ہے کہ ایک سال اردو بولنے والا صدر بنتا ہے، ایک سال میمن اور ایک سال پنجابی۔ اب اردو سپیکنگ کی باری تھی۔ میں چیمبر کے معاملات سے کٹا ہوا تھا' کیونکہ قومی سیاست میں زیادہ مصروف رہنے لگا تھا' مگر منیجمنٹ کمیٹی کا رکن تھا۔ میرے گروپ نے کہا، خیال ہے کہ آپ کو صدر بنایا جائے۔ میں نے کہا مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ حیران ہوئے کراچی چیمبر کا صدر پاکستان کی بزنس کمیونٹی کا وزیراعظم ہوتا ہے، آپ کیا بات کر رہے ہیں؟ میں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میں صدر نہیں بننا چاہتا۔ ہمارے اردو گروپ کے چیف کو بڑا عجیب لگا۔ انہوں نے دو دن بعد پھر میٹنگ کے لیے بلایا اور صورت حال کا جائزہ پیش کیا کہ پندرہ پندرہ ارکان کے دو گروپ بن گئے ہیں اور ہماری کامیابی کا فقط ایک ہی امکان ہے کہ آپ امیدوار بن جائیں۔ اس طرح دوسرے کچھ لوگ بھی ہمیں ووٹ دے دیں گے ورنہ ہمارا آدمی صدر نہیں بن سکے گا۔ میں نے مشورہ دیا کسی بڑے بزنس مین کو بناؤ' میرا تو ایک چھوٹا سا کاروبار ہے۔ مجھے یاد ہے کہ قاسم عثمان کانڈا والا ایک چھوٹا بزنس مین تھا۔ ایک دفعہ صدر بنا، میں نے کئی بڑے کاروباری لوگوں کو اسے ذلیل کرتے دیکھا، اس لیے میں صدر نہیں بننا چاہتا کہ کوئی مجھے ذلیل کرے۔ ایک صاحب نے کہا جناب! وہ اس لیے ذلیل کیے جاتے تھے کہ بہت کم پڑھے لکھے تھے جبکہ آپ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، مجال ہے کوئی آپ کو ذلیل کرنے کی حماقت کرے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے انکار پر سب ناراض ہو رہے ہیں۔ تب خواجہ قطب الدین نے بھی یہی مشورہ دیا امیدوار بن جاؤ کہ یہ ہمارے پرانے ساتھی ہیں۔ چنانچہ میں نے اعلان کر دیا کہ میں کراچی چیمبر کی صدارت کا امیدوار ہوں۔

''اس کے ایک دو گھنٹے بعد مجھے لطیف ابراہیم جمال کا ٹیلی فون آیا۔ پوچھنے لگے منیجمنٹ کمیٹی کی پوزیشن کیا ہے۔ میں نے کہا پندرہ ہمارے لوگ ہیں اور پندرہ دوسرے گروپ کے ہیں۔ انہوں نے کہا دوسرے گروپ کے نام لکھواؤ۔ میں نے ٹیلی فون پر ان کے نام لکھوا دیے۔ کچھ دیر بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ آج رات میرے گھر کھانے کی دعوت ہے اس میں ضرور آؤ۔ میں ان کے گھر پہنچا۔ انہوں نے پندرہ میں سے دس ارکان کھانے پر بلا رکھے تھے۔ انہوں نے میری حمایت کا اعلان کیا۔ اس طرح ہم پندرہ سے پچیس ہو گئے۔ بعد ازاں باقی پانچ بھی ہمارے ساتھ آ ملے، یوں میں کراچی چیمبر آف کامرس کا صدر بن گیا جبکہ لوگ انتخاب میں لاکھوں روپے خرچ کرتے تھے۔

''ابھی مجھے ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا اور میں ایک دن منیجمنٹ کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا کہ سیکرٹری دوڑتا ہوا آیا کہ میاں صاحب کا ٹیلی فون ہے۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا۔ پرائم منسٹر صاحب لائن پر آئے تو بولے آپ سے ضروری کام ہے۔ آپ چار بجے کی پرواز سے اسلام آباد آ جائیں۔ آٹھ بجے آپ کی میرے ساتھ میٹنگ طے ہے۔ میں نے خواجہ قطب الدین کو فون کیا اور میاں صاحب کے بلاوے پر مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ میں ہوائی اڈے پہنچا۔ معین الدین حیدر بھی اسی پرواز سے اسلام آباد جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ باتیں چل نکلیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے پہلے دنوں

میاں صاحب کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ میں نے کہا کئی موضوعات تھے جن میں ایک موضوع آپ کی ذات سے متعلق تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ گورنر صاحب کی پرفارمنس کیسی ہے۔ میں نے بتایا پرفارمنس تو اچھی ہے، لیکن وہ سیاسی آدمی نہیں، اس لیے سیاسی لوگ ان سے خوش نہیں رہتے۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے رہے۔ میں نے کہا، میں نے جو کہا تھا، وہ آپ کو بتا دیا۔

جب ہم ہوائی جہاز سے اترے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں نے کہا کہ مجھے تو پارلیمنٹ لاجز میں خواجہ صاحب کے فلیٹ میں قیام کرنا ہے۔ بولے میں آپ کو سندھ ہاؤس سے بجھوا دوں گا۔ پہلے ہم سندھ ہاؤس پہنچے اور انھوں نے اپنی گاڑی میں مجھے وہاں بجھوایا۔ میں آٹھ بجے وزیراعظم ہاؤس پہنچا ہی تھا کہ اندر سے بلاوا آ گیا۔ اس سے پہلے میں نے دیکھا کہ معین الدین حیدر ملاقات کر کے جا رہے ہیں۔ میاں صاحب نے اندرون سندھ کے بارے میں دو چار منٹ کی بات کی۔ اس کے بعد کہنے لگے، میں نے آپ کو سندھ کا گورنر بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور میں نے نوٹیفکیشن تیار کر رکھا ہے۔ آپ اجازت دیں تو اس پر دستخط کر دوں۔ میں نے کہا آپ مجھے جو بھی حکم دیتے ہیں، میں اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ بسم اللہ کر کے انہوں نے دستخط لیے اور [illegible] صاحب کو نوٹیفکیشن پر صدر مملکت سے دستخط کروانے کے لیے کہا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ ہم نماز پڑھنے باہر گئے تو مسجد میں بہت سارے وزرا کھڑے تھے۔ میاں صاحب نے کہا جو لوگ پوچھ رہے تھے کہ ممنون صاحب کون ہیں، وہ دیکھ لیں کہ ممنون صاحب یہ ہیں۔ جاوید ناصر بھی نماز پڑھنے آتے تھے۔ جمعے کی نماز کے بعد میاں صاحب نے ایک ایسا جملہ کہا جس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ وہ جنرل صاحب کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے کہ آپ نے ڈاڑھی رکھ کے اپنے اندر جو خصوصیات پیدا کی ہیں، یہ سب بغیر ڈاڑھی والے ممنون حسین میں موجود ہیں۔ میں نے ٹوکا، میاں صاحب! آپ کیا بات کر رہے ہیں! ہفتے کے دن میں نے حلف لیا اور یوں میں گورنر بن گیا۔



"میں صوبائی حکومت چلاتا اور گورنر کی حیثیت سے زیادہ کام تعلیم پر کرتا رہا۔ سندھ کی یونیورسٹیوں میں اصلاحات کی سخت ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر سندھ کی کسی یونیورسٹی میں اکاؤنٹنٹ سسٹم نہیں تھا، چنانچہ ایک سسٹم بنایا اور باقاعدہ طور پر تمام یونیورسٹیوں میں رائج کیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر کام وائس چانسلر کرتا ہے، چنانچہ حکم دیا کہ پرو وائس چانسلر مقرر کیا جائے جو یونیورسٹی کا انتظام چلائے۔ وائس چانسلروں کی میٹنگ میں جب میں نے پرو وائس چانسلر کی تجویز رکھی، تو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ظفر زیدی نے مخالفت کر دی اور کہا کہ اس سے اختلافات پیدا ہوں گے۔ میں نے کہا اس کا حل یہ ہے کہ ہر وائس چانسلر اپنا پرو وائس چانسلر خود مقرر کرے۔ اس کے باوجود ظفر زیدی مخالفت کرتے رہے لیکن میں نے پرو وائس چانسلر کا نظام قائم کر دیا۔ اس

کے علاوہ ایک وائس چانسلر کو برطرف بھی کیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلے گیارہ سال سے سینئر پروفیسر کے طور پر تنخواہ لے رہا تھا اور پچھلی حکومت نے بعد میں اسے وائس چانسلر بھی بنا دیا۔ وہ ان گیارہ برسوں میں صرف دو سال پاکستان میں رہا اور بار بار امریکا جاتا رہا۔ میں بڑا پریشان ہوا، اس کا ریکارڈ دیکھا اور اسے ہٹایا اور اس کے خلاف ایک انکوائری کمیٹی بنا دی۔ وہ امریکا فرار ہو گیا۔ جب آٹھ دس سال بعد نئی حکومت بنی تو ۲۰۰۸ء میں پھر آ گیا اور اسے دوبارہ وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ اب تو وہ ریٹائر ہو گیا ہے۔"

ہم نے چائے کی دو چار چسکیاں لیں اور گورنر سے صدر مملکت کے منصب تک پہنچنے کی روداد سننے کے لیے ممنون حسین صاحب کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی گفتگو اس قدر دلنشیں اور دلکش تھی کہ ہر موڑ ایک نئے سنگ میل کا سراغ دیتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کے بعد والے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

"جب میاں صاحب جدہ چلے گئے، جاوید ہاشمی مسلم لیگ کے قائم مقام صدر بنے۔ انہوں نے مجھ سے جنرل سیکرٹری سندھ مسلم لیگ بننے کا کہا۔ یہ تو حلیم صدیقی دوسری طرف جا چکے تھے۔ میرے خیال میں وہ مارشل لا لگتے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے، گو بظاہر پارٹی کے ساتھ تھے۔ جب میاں صاحب کا کیس چل رہا تھا، میں دیکھتا کہ روز ان کا سیاسی کارکنوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں میاں صاحب سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ میں نے ایک دن حلیم صاحب سے کہا کہ آپ یہ کام چھوڑ دیں اور اب یہ ذمے داری میری ہے۔ میاں صاحب سے ملنے کے لیے جتنے بھی لوگ آئیں گے ان کو میں ہینڈل کروں گا۔ وہ کام میں نے اپنے ذمے لے لیا اور ایک سسٹم بنایا۔ وہ بڑا احتساب عدالت تھا، جج کا کرنل انچارج بڑا بدتمیز آدمی تھا جو مجھے ہر وقت ذلیل کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اسے معلوم تھا کہ میں سابق گورنر ہوں، اگر اسے ذلیل کروں گا تو یہ بھاگ جائے گا۔ میں اسے حد سے زیادہ برداشت کرتا رہا۔ میں نے ایک سسٹم بنایا۔ وہ مجھے روزانہ ملاقاتیوں کے ۳۳ کارڈ دیتا، جبکہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ ۱۰۰ ملاقاتی آ جاتے۔ میں صبح ۳۳ آدمیوں کو کارڈ دیتا اور ان سے درخواست کرتا کہ لنچ ٹائم پر آپ مجھے کارڈ واپس دے دیں گے۔ اس دوران آپ میاں صاحب سے مل لیجیے اور کارروائی بھی دیکھ لیں۔ ٹی ٹائم سے لنچ ٹائم تک اگلے ۳۳ آدمی بھیج دیتا اور لنچ ٹائم میں ان سے کارڈ واپس لے لیتا۔ کئی لوگ کارڈ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خوشامد کرتا کہ بھئی دوسرے لوگ بھی آئے ہوئے ہیں۔ اس طرح نظام عمدگی سے چلایا۔ اس دوران میرے پاس ایک صاحب آئے جو ملٹی نیشنل کمپنی کے پاکستانی چیف ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے کہا: آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آ جائیے۔

"وہ آئی بی اے کے گریجوایٹ تھے۔ پیشے سے متعلق باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے کہ جب کوئی ڈکٹیٹر آتا ہے تو اپنی نئی ٹیم بناتا ہے۔ ایوب خان آئے انھوں نے اپنی ایک نئی ٹیم بنائی جس میں سے ذوالفقار علی بھٹو نکلے۔ ضیاء الحق صاحب آئے انھوں نے ایک ٹیم بنائی، اس میں سے میاں نواز شریف نکلے۔ مشرف صاحب بھی ایک نئی ٹیم بنا رہے ہیں اور اس کے لیے آپ کا نام بہت اچھا ہے۔ کور کمانڈر کراچی آپ کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ آپ کا بہت اچھا تاثر ہے۔ اب نئی ٹیم بن رہی ہے۔ میری آپ سے

ایک گزارش ہے کہ آپ گھر بیٹھیے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نئی ٹیم کا حصہ ہوں گے۔ میں نے جواب دیا میں آپ پر دو باتیں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ مجھے جو گھر سے تربیت ملی اور اساتذہ نے جو سکھایا، وہ یہ ہے کہ جب اپنے ساتھیوں پر مصیبت کا وقت آئے، تو مضبوطی سے ان کے ساتھ کھڑے رہو جبکہ آپ کہہ رہے ہیں کہ میں گھر بیٹھ جاؤں۔ کیسے گھر بیٹھ جاؤں؟ دوسری بات یہ کہ میں میاں صاحب کی اس لیے عزت نہیں کرتا کہ وہ ہمارے لیڈر ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے پرکھا ہے اور انہیں ایک نفیس انسان پایا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ فرشتے ہیں، بس ایک اچھے آدمی ہیں۔ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ وہ برا آدمی ہے، میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ وہ مایوس ہو کے چلے گئے۔

''اب پچھلی ادھوری بات مکمل کرتے ہیں۔ جاوید ہاشمی نے کہا کہ آپ جنرل سیکرٹری سندھ مسلم لیگ بن جائیے۔ میں نے جواب دیا میں نے کبھی آرگنائزیشن میں کام نہیں کیا۔ ہاشمی صاحب اس کے لیے آپ کسی دوسرے آدمی کا انتخاب کر لیجیے۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ میاں صاحب بات کریں گے جو اس وقت جدہ میں تھے۔

''میاں صاحب نے مجھ سے کہا ممنون صاحب! یہ ذمے داری اب آپ ہی کو اٹھانا ہوگی۔ میں نے کہا آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یوں میں جنرل سیکرٹری ہو گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ قائم مقام صدر بھی بنا دیا گیا۔ میں نے پورے سندھ کے دورے کیے۔ لوگ جو گھروں میں بیٹھ گئے تھے، انہیں فعال کیا۔ کڑی آزمائش کے دور میں مسلم لیگ کو متحرک رکھا۔ اس وقت کی جو میری محنت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہزار بارہ سو مسلم لیگی کارکنوں کو نام سے جانتا ہوں۔ صدر بننے سے پہلے جو دور گزرا ہے، تب مہینے میں دس سے پندرہ دن میں اندرون سندھ گزارتا تھا۔ میرا اتنا قریبی تعلق کارکنوں سے رہا کہ لوگ رات کے دو بجے بھی مجھے فون کرتے تھے۔ انہیں یہ بات بڑی اچھی لگتی تھی کہ میں خود ٹیلی فون اٹھاتا ہوں۔ غوث علی شاہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ لندن میں تھے۔ میاں صاحب ۲۰۰۵ء میں لندن پہنچے تو وہاں ہم ایک ساتھ مل کے بیٹھے۔

''میں پاکستان سے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے گیا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں اور ۲۰۰۶ء میں بھی شریک ہوا۔ غوث علی شاہ کہنے لگے کہ آپ قائم مقام صدر ہیں، اس لیے عہدیداروں کا تقرر نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا آپ نوٹیفکیشن پڑھ لیجیے جس میں لکھا ہے As long as Mr. Ghous Ali Shah, the President of the Sindh Party is out of the Country, Mr. Mamnoon Hussain, the Acting President will use full powers of the president. میں نے کہا شاہ جی! اللہ کا واسطہ آپ سیاست دیکھیں، آپ کو کیا معلوم کون کیا کر رہا ہے۔ آپ پہلے جیل میں تھے بعد میں یہاں آ گئے۔ آپ کو زمینی حقائق کا کچھ علم نہیں۔''

جناب ممنون حسین واقعات کی کڑیاں ملاتے جا رہے اور فسانۂ آزاد کی طرح دلچسپی قائم رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایثار کیشی اور وضع داری کا ایک درخشندہ باب رقم کیا اور ان کی پوری جدوجہد میں بے نفسی کا جوہر غالب رہا۔ وہ اب ''ہوم رن'' میں داخل ہو رہے تھے:

''۲۰۱۳ء میں پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا۔ شاید کوئی ضمنی انتخاب ہونے والا تھا۔ میں پارلیمانی بورڈ کا رکن تھا، اس لیے مجھے

بلایا گیا۔ یہ غالباً جولائی کی بات ہے۔ میں اجلاس کے بعد اسلام آباد میں رک گیا کہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ ایک شام میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا کہ صدارتی انتخاب کا اچانک اعلان ہو گیا ہے۔ کچھ نام ٹیلی ویژن اور اخبارات میں آنے شروع ہوئے۔ کوئی پانچ چھے نام آئے اور پھر کم ہونے لگے۔ اس دوران میرے دوست احباب اور ایک دن میری بیوی نے کہا میاں صاحب سے جا کر ملو۔ میں نے کہا کہ کبھی وہ بلائیں گے تو چلا جاؤں گا۔ وہ مصروف آدمی ہیں، میں خواہ مخواہ انہیں پریشان کیوں کروں؟ میں نہیں گیا، پھر دیکھا کہ صرف دو نام رہ گئے ہیں۔ ایک سرتاج عزیز کا اور ایک میرا۔ ایک دن میاں صاحب کا فون آیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں کراچی جا چکا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ آئیے، کچھ ضروری کام ہے آپ سے۔

میں چلا گیا انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو صدارتی انتخابات میں امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے جواب میں شکریہ ادا کیا۔ اس وقت وہاں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ میاں صاحب انھیں مخاطب کر کے کہنے لگے کہ ہم جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں، ان سب میں زیادہ پڑھے لکھے ممنون صاحب ہیں۔ کیا ناقابل تسخیر اور قابل رشک کمٹمنٹ ہے اس شخص کی! پارٹی، دوستوں اور اپنے لیڈروں کے ساتھ بھی اس کا یہی رویہ ہے۔ 30 جولائی کو صدارتی الیکشن ہوا۔ اب میں آپ کے سامنے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر کی حیثیت سے بیٹھا ہوں۔"

طیب اعجاز قریشی نے سوال کیا، آپ کا خاندان آج بھی جوتوں کا بزنس کرتا ہے؟ انھوں نے بتایا، وہ اب ٹیکسٹائل کے بزنس میں آ گئے ہیں۔ خواتین کے کپڑوں کو تیار اور پرنٹ کرانا اور ہول سیل میں بیچ دینا یہ ہمارا بزنس ہے۔ اس کی سب سے بڑی مارکیٹ اعظم کلاتھ مارکیٹ لاہور ہے۔ وہاں لوگوں کے ساتھ میرے کاروباری مراسم ہیں۔ جب میں گورنر بنا تو تجارت سے الگ ہو گیا اور بزنس اپنے بھائی اور بیٹے کے سپرد کر دیا۔

دو گھنٹے ہم صدر پاکستان کا فسانۂ زیست سنتے رہے جس میں کمال درجے کی جاذبیت، معنویت اور بلا کی دلکشی تھی۔ ایک کھرے اور سچے آدمی کی نہایت دلکش تصویر۔ وہ دینی علوم، انتظامی صلاحیت، سیاسی بصیرت اور اعلیٰ قدروں کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی کی بدولت پورے قد سے کھڑے ہیں۔ میں نے دل میں کہا ممنون حسین صاحب یہ تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ پارلیمانی نظام حکومت میں صدر مملکت سیاسی طور پر غیر جانب دار اور وحدت وفاق کی علامت ہوتا ہے۔ ایوان صدر میں جو تقریبات ہو رہی ہیں، ان میں تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد مدعو کیے جاتے ہیں۔ سیاسی غیر جانب داری کا یہ فن کا بہت کٹھن مرحلہ ہے جس میں صدر ممنون حسین اپنے رب کے حضور اور عوام کے سامنے ضرور سرخرو ہوں گے۔ اُن کے حالات زندگی کے بیانیے میں بہت سے الجھے ہوئے سوالات کے جواب آ گئے ہیں اور یہ پیغام بھی کہ حقیقی عظمت کا سرچشمہ دولت کی فراوانی کے بجائے کرداری قوت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جس کی نیک بندوں پر بارش ہوتی رہتی ہے۔ ہم نماز عشا ادا کر کے صدر مملکت کے گرم جوش مصافحے کے بعد ایوان صدر سے رخصت ہوئے۔ آج تک ان کی ذکاوت اور شرافت کا ایک نشاط انگیز سحر طاری ہے۔ ●●●





تیسرا حصہ

حیوانی آنتوں اور پیٹ بوتلوں کا بزنس کیجیے

ایسے کاروبار کرنے کے قیمتی گر جانیے جنھیں معمولی سرمائے سے شروع کر کے خوشحالی کی راہ پر گامزن ہونا ممکن ہے

طیب طارق

اگلی نشست کے لیے جب غنی میرے گھر آیا، تو اس کے ساتھ کچھ اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ یہ میرے ہم جماعت بھی کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں اور میری ہی طرح مشکل حالات سے گزر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان لڑکی، حرا تو بہت جذباتی تھی۔ کہنے لگی "میرے خیال میں عورتیں بھی اسی طرح کامیاب کاروبار کر سکتی ہیں جس طرح مرد کرتے ہیں۔ شوہر کے وفات پانے یا والد نہ ہونے کی صورت میں خواتین کو خود میدان عمل میں اتر کر کاروبار کرنا چاہیے۔ ملازمت کرنا اچھی بات ہے۔ لیکن کاروبار میں جس طرح آپ خاندان کی کفالت کرنے کے علاوہ اپنے خوابوں کو تعبیر دے سکتے ہیں، ملازمت میں عموماً ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ اب کاروبار میں خواتین کے حوالے سے رویے بدل رہے ہیں۔ اب بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی سربراہ خواتین ہیں۔ انڈیا میں پیپسی جیسی بڑی کارپوریشن کی سربراہ ایک خاتون تھی جو حال ہی میں تبدیل ہوئی۔ اسی طرح دنیا میں بے شمار کامیاب کمپنیاں خواتین چلا رہی ہیں۔ دا می میں خون ٹیسٹ کرنے والی ایک کمپنی کو جو وہاں انقلاب برپا کر رہی ہے ایک نوجوان لڑکی نے شروع کیا۔

اسی طرح آئی ٹی کے میدان میں ایک نوجوان لڑکی نے

tradesy.com کے نام سے ویب سائٹ بنائی۔ "ای بے" کی طرح اس ویب سائٹ پر بھی لوگ اپنے پرانے جوڑے بیچتے یا خریدتے ہیں اور بدلے میں وہ ان سے نو فیصد کمیشن لیتی ہے۔ اسی کاروبار سے اس نے کروڑوں ڈالر کما لیے۔ اس کا شمار اب امریکا میں چوٹی کی ویب سائٹس میں ہونے لگا ہے۔ آئی ٹی انقلاب کے بعد، تو اب خواتین کے لیے گھر بیٹھ کر رقم کمانے کی بے شمار راہیں کھل چکیں۔ میں تمہیں ایک مصری عورت کے جوش و جذبے اور ہمت کے بارے میں بھی واقعہ سناتا ہوں۔ آج سے تقریباً بیس پچیس برس پہلے مصر میں اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ چند دن بعد سوگ ختم ہوا اور روٹی کے لالے پڑے تو اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

بہن بھائی کوئی تھے نہیں کہ ان سے وہ مدد مانگتی اور رشتے داروں، محلے والوں سے وہ مانگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس زمانے میں مصری عورت کے کام کرنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ جو عورت کام کرتی، محلے دار اور رشتے دار اس سے سماجی طور پر قطع تعلق کر لیتے۔ اس نے بہت سوچا کہ وہ کیا کرے مگر کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے لگا کہ اب بھیک مانگنی پڑے گی۔ پھر اس نے ایک انقلابی فیصلہ کیا۔ یہ کہ وہ مرد بن کر مردانہ معاشرے میں کام کرے اور عزت سے اپنے اور بچی کے لیے حلال رزق کمائے گویا مرد کا روپ دھار کر ان جیسے کپڑے پہنے، سر پہ پگڑی باندھے تھوڑی مردانہ آواز نکالے اور مردوں کے ساتھ مزدوری کرے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

۲۵ سال تک وہ محنت مزدوری کرتی رہی اور اس کے ساتھی اسے مرد ہی سمجھتے رہے۔ آخر جب لوگوں کو یہ پتا چلا کہ وہ عورت ہے، تو سب نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔ یہ بات میڈیا میں بھی پھیل گئی۔ اسے پھر مصری حکومت کی طرف سے بھی تمغہ جرأت ملا۔ دنیا بھر کے میڈیا میں اس کی ہمت اور عظمت کے چرچے ہونے۔

حرا کہنے لگی "طیب بھائی! آپ تو بہت اچھی باتیں بتاتے ہیں۔ کیا میں مستقل طور پر اس نشست کا حصہ بن سکتی ہوں؟"

میں نے حرا سے کہا "کیوں نہیں، میں تو چاہوں گا کہ تم سب اس نشست کا حصہ ہو تا کہ اچھی باتیں زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔ اگلی نشست ہم نے آئی ٹی کے موضوع پر ہی کرنی ہے اور اس میں سب کے لیے کام کی بہت سی باتیں ہوں گی۔ بے شمار آئیڈیاز ہوں گے اور تم میں سے اگر کوئی آئی ٹی کا ماہر نہیں تب بھی وہ یہ کام کیسے کر سکتا ہے، یہ بھی تمھیں بتاؤں گا۔

سائیج کیسنگ کا کاروبار

میں نے پھر گفتگو کا رخ اصل موضوع کی طرف موڑتے ہوئے کہا "علی تمھیں پتا ہے، پچھلی نشست میں جس بکرے کی تم تکہ بوٹی کر کے آئے، یہی بکرا اپنے ناکارہ اعضا سے تمھیں کروڑ پتی بنا سکتا ہے۔ ساتھ تم نے جو ڈیڑھ لیٹر بوتل پی، اس کے ٹکڑے ایکسپورٹ کر کے تم اپنی قسمت بدل سکتے ہو۔"

یہ سن کر علی اور اس کے دوستوں کی مارے شوق اور حیرت کے آنکھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے "طیب بھائی! وہ کیسے؟"

میں نے کہا "جیسا کہ میں نے پچھلی نشست میں ذکر کیا تھا، پاکستان سے اس وقت جانوروں خصوصاً بکرے اور بھیڑ وغیرہ کی ۲ ارب روپے مالیت کی انتڑیاں سالانہ باہر جا رہی ہیں۔ اس کاروبار کے سب سے بڑے ایکسپورٹرز کوکو ٹریڈرز (coco traders) کو پچھلے سال تقریباً ۸۲ کروڑ روپے کی ایکسپورٹ پر اس شعبے میں بہترین ایکسپورٹرز کا ایوارڈ ملا تھا۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ کام شروع کرنے کے لیے نہ تو بہت زیادہ سرمایہ چاہیے اور نہ کوئی مشین۔ یہ مکمل طور پر ہاتھ کا کام ہے جسے انجام دینے میں آپ کو صرف ذہانت اور افرادی قوت درکار ہوتی ہے۔

علی کے ایک دوست نے بیچ میں لقمہ دیا "یقیناً یہ بہت ذہین کاروباری لوگ ہیں۔ ہمیں تو کاروبار کی الف ب کا بھی علم نہیں۔" میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس

سے سوال پوچھا: تم جانتے ہو کوور یڈرز والے کون لوگ تھے؟ وہ کہنے لگا نہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ قصاب تھے اور بالکل ان پڑھ! ان کو کہیں سے پتا لگا کہ یہ کام ہو رہا ہے۔ انھوں نے بھی اللہ کا نام لے کے شروع کیا۔ آغاز میں تھوڑا نقصان اٹھایا لیکن ہمت نہیں ہاری، اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا اور دوبارہ میدان میں اتر گئے۔ آج ان کی تیسری نسل ہے جو اس کاروبار کی بدولت سنور گئی۔ اب انھوں نے ایک غیر ملکی کمپنی کے ساتھ مل کر [illegible] ایکسپورٹ کرنے کا پلانٹ بھی لگا لیا۔ تم تو پڑھے لکھے ہو [illegible] کیا ہوا ہے، جدید دنیا کا علم بھی رکھتے ہو تو پھر تم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے؟ یہی بات مجھے اردو ڈائجسٹ کے طیب اعجاز قریشی نے بھی بتائی جو اس رسالے کے مدیر منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب کاروباری بھی ہیں۔ ان کی کمپنی پاکستان میں پھل اور سبزیاں ایکسپورٹ کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ہے۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے بڑوں نے جب یہ کام شروع کیا، تو انھیں آغاز میں تھوڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن پھر وہ ایسے سنبھلے کہ کچھ ہی برسوں میں پاکستان بھر میں سبزیوں اور پھلوں کے سب سے بڑے ایکسپورٹر بن گئے۔ انھوں نے مجھے کاروبار کے کچھ راز بتائے جو میں آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔

طیب قریشی نے بتایا اصل بات یہ ہے کہ کاروبار میں کامیابی کی ترکیب کے جو اجزا ہیں، ان کا خیال رکھو، تو کاروبار کی بلندیاں مدد کریں گی۔ ان بنیادی اجزا میں شامل پہلا بنیادی جز ہے محنت۔ سخت محنت سے کبھی مت گھبراؤ، کاروبار کو کام مت سمجھو بلکہ اس سے لطف اٹھاؤ، تم کبھی نہیں تھکو گے۔ دوسرا جز ہے، مستقل مزاجی! کاروبار میں اگر تمھیں پہلی بار نقصان ہو، تو مت گھبراؤ اور یہ نہ کہو کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ غلطیوں سے سیکھو اور دوبارہ نئے جذبے اور یقین کے ساتھ کام کا آغاز کرو۔

تیسرا اہم جز ہے احتیاط! کاروبار میں اگر آپ کو شروع ہی میں خدانخواستہ نقصان ہو جائے تو آپ اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے بہتر ہے، شروع میں تھوڑی رقم یا چھوٹی سطح سے کام شروع کیا جائے۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تب بھی تا کہ اگر نقصان ہو، تو کم اور آپ کا اعتماد بھی بحال رہے۔ نوجوانی میں جب انسان



کاروبار شروع کرے، تو اسے لگتا ہے کہ کچھ ہی عرصے میں دنیا فتح کر لے گا۔ لیکن نقصان ہو جائے، تو وہ دھڑام سے زمین پر آ گرتا اور ایسا مایوس ہوتا ہے کہ پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔

چوتھا اہم جز ہے [illegible]! کاروبار میں مسلسل اپنے حریفوں پر نظر رکھو کہ وہ کیا بیچ رہے ہیں اور میں کیا نئی چیز دے سکتا ہوں۔ ماضی میں، میں نے کیا غلطیاں کی تھیں اور اب ان سے کیسے بچ سکتا ہوں۔ اپنی حکمت عملی اور ماضی کی غلطیوں کو مسلسل تجزیے کی گرفت میں رکھنا کہ آپ کا کاروبار بلندیوں کی طرف گامزن ہو سکے۔

اب ہم اس کاروبار پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔ بکرے اور گائے کی انتڑیاں یورپی ممالک میں ساسیج کیسنگ (Sausage Casing) بنانے کے کام آتی ہیں۔ سیخ کباب نما ساسیج یورپی ممالک اور جاپان میں ایک مرغوب غذا اور ویسے ہی مقبول ہے جیسے ہمارے ہاں روٹی سالن یا انڈے شامی کباب والا برگر۔ ساسیج بکرے، گائے یا خنزیر کے گوشت سے بنتا ہے۔ اس گوشت کو ایسی چیز میں لپیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے جسے ساتھ ہی کھایا جا سکے۔ اس لیے گائے اور بکرے کی انتڑیوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ انتڑیوں کی صفائی کر کے انھیں ڈبوں میں بند کر باہر بھیجا جاتا ہے۔

ساسیج کیسنگ کے کاروبار میں اس وقت سب سے بڑے درآمد کنندہ جرمنی، جاپان، ہالینڈ، پولینڈ، فرانس، اٹلی اور اسپین ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً سب ہی یورپی ممالک میں اس کی ایکسپورٹ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے پانچ بڑے خریدار ممالک جرمنی، رومانیہ، اسپین، اٹلی اور پولینڈ شامل ہیں۔ ساسیج کیسنگ میں چین سب سے بڑا برآمد کنندہ ملک ہے جس کی ایکسپورٹ ۲۰۱۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایک کھرب روپے تھی۔ دوسرے بڑے ایکسپورٹر ملکوں میں جرمنی، برازیل، امریکا، مصر اور ہالینڈ شامل ہیں۔

اس کاروبار کا اضافی فائدہ یہ ہے کہ ہم سب سے بڑے ایکسپورٹر، چین کا نہ صرف مقابلہ کر بلکہ اس سے اچھا ریٹ دے سکتے ہیں۔ وہ ایسے کہ یہ کام مکمل طور پر افرادی قوت پہ انحصار کرتا ہے، اس میں مشین کا کوئی کردار نہیں۔ چین میں اب افرادی قوت مہنگی ہو رہی ہے جبکہ پاکستان میں نسبتاً سستی ہے لہٰذا ہم چینی کمپنیوں سے بہتر ریٹ دے سکتے ہیں۔ اگر محنت کی جائے، تو آئندہ برسوں میں چین کی ایکسپورٹ کے ایک بڑے حصے کو ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے انتڑیوں کے کاروبار کی فزیبلٹی رپورٹ بنائی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو ریٹ چینی کمپنیوں نے اسے دیے، اتنے ہی یا اس سے بہتر ریٹ اسے پاکستانی کمپنیوں سے ملے۔

بہرحال، کاروباری دنیا میں ہر مصنوعہ کو اس "سیٹک کوڈ" (standard international trade classification code) سے پہچانا جاتا ہے یا اس کے ایچ ایس کوڈ (Harmonized System) سے۔ جانوروں کی انتڑیوں والی مصنوعہ کا سیٹک کوڈ ۲۹۱۹۳ ہے۔ اقوام متحدہ نے کاروبار کے حوالے سے ایک ویب سائٹ www.comtrade.un.org بنا رکھی ہے۔ اس سے کسی بھی مصنوعہ کے سیٹک کوڈ کے اعداد و شمار معلوم کر لیجیے۔ اس کوڈ کو پہلے گوگل کے ذریعے انٹرنیٹ پر سرچ کریں اور ویب سائٹ میں دیے گئے طریق کار کے مطابق درج کر کے معلومات لے لیں کہ اس کی تجارت کی مالیت کیا ہے اور پاکستان سے کتنی ایکسپورٹ ہوتی ہے۔

پاکستانی مارکیٹ میں کام کا طریق کار یہ ہے کہ ساسیج کیسنگ کا خام مال جسے پنجابی میں "روڑھا" بولا جاتا ہے، مذبح خانوں سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ مذبح خانے والے اسے "بیوپاریوں" یعنی مڈل مین کو بیچتے ہیں جو آگے اس کی صفائی کر کے ایکسپورٹرز کو بیچ دیتے ہیں۔ ایکسپورٹر انتڑیوں کو اپنی فیکٹری میں لا کے دوبارہ صفائی کرتے ہیں۔ معیار کے لحاظ سے خراب انتڑیاں الگ ہو جاتی ہیں۔ پھر انھیں کولڈ اسٹور میں رکھا جاتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ڈرموں میں پیکنگ کر کے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

یہ خام مال تین طرح کی کوالٹی رکھتا ہے: اے، اے بی اور بی سی۔ نیز اس کے مختلف ڈایا میٹر یا قطر ہوتے ہیں مثلاً ۲۴/۲۲، ۲۲/۲۰، ۲۰/۱۸، ۱۸/۱۶ اور ۲۶/۲۴۔ ان ہی کی بنیاد پر مال کے ریٹ اور معیار کا تعین ہوتا ہے۔ پنجاب سے زیادہ تر اے بی کوالٹی ملتی ہے۔ خیبر پختونخوا اور افغانستان سے زیادہ تر اے کوالٹی ملتی ہے جسے گوشت کہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ

اے کوالٹی زیادہ تر بھیڑ کے بال میں سے ملتی ہے۔ بھیڑ یا دنبہ زیادہ تر خیبر پختونخوا اور افغانستان میں پایا جاتا ہے۔ باہر کے ملکوں میں زیادہ مانگ اے کوالٹی اور اے بی کوالٹی کی ہے۔ قطر کے حساب سے زیادہ مانگ ۱۸/۲۰ اور ۲۰/۲۲ کی انتڑیاں رکھتی ہیں۔

عالمی مارکیٹ میں ان کے ریٹ کا "ہینک" کے حساب سے تعین ہوتا ہے۔ ایک ہینک ۹۲ میٹر کا ہوتا ہے۔ ہینک اس سے چھوٹا یا بڑا بھی ہو سکتا ہے لیکن عموماً یہی سائز چلتا ہے۔ آنتوں کی صفائی میں تین طرح کے عمل اپنائے جاتے ہیں۔ ۱۔ ہر ہینک کو پانی سے گزار کر یہ چیک کیا جاتا ہے کہ کسی بھی ہینک یا اس کے حصے میں سوراخ نہ ہو۔ جو سوراخ والا حصہ ہو اس کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ ۲۔ ان کو اے، اے بی اور بی سی کے حساب سے الگ کیا جاتا ہے۔ ۳۔ نمک لگا کر کوالٹی کے حساب سے مختلف بوریوں میں بند کر کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر ایکسپورٹ سے پہلے پلاسٹک کے ڈرموں میں بند کر باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

نمک اس لیے لگایا جاتا ہے کہ وہ آنتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس سارے کام میں سب سے مشکل کوالٹی کی پہچان ہے جس کے لیے آپ کے ساتھ کوئی تجربے کار آدمی ہونا چاہیے یا آپ نے خود تقریباً چھے مہینے یہ کام کر رکھا ہو۔ پچھلے سال اے بی کوالٹی اور ۲۰/۱۸ قطر کا ایکسپورٹ ریٹ ۵ سے ۵.۵ ڈالر کے درمیان تھا۔ خریدنے کا ریٹ ۳۵۰ روپے کے قریب تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ اس میں بنیادی منافع تقریباً ۳۲ فیصد ہوا۔ جو کم مانگ والے قطر ہیں، ان میں منافع اس سے بھی زیادہ ہے۔

حق نے اپنے قہوے کا دوسرا کپ انڈیلتے ہوئے پوچھا: طیب بھائی یہ بتائیں کہ اس کو شروع کیسے کیا جا سکتا ہے؟

میں نے اسے بتایا: یہ کام شروع کرنے کے لیے تمھیں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی: ۱۔ افرادی قوت ۲۔ جگہ۔ ۳۔ خام مال خریدنے کے لیے پیسا۔ جس طرح ہر کام کے لیے انڈسٹریل ایریا موجود ہے، اسی طرح اس کام کے لیے بھی لاہور میں رنگ روڈ پہ بتی چوک کے قریب گندے نالے کے اوپر پانچ چھے فیکٹریاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ پور کانجراں میں جہاں مذبح خانے ہیں، وہاں بھی اس کی فیکٹریاں موجود ہیں۔ ان دونوں جگہوں سے تم ان کے حوالے سے معلومات لے اور جا کے فیکٹریاں دیکھ سکتے ہو۔ بہرحال ان جگہوں پر آٹھ دس مرلے کا ایک گھر کرائے پر لے کر کام شروع کرنا ممکن ہے۔

ان جگہوں پر مکان لینے کا اس لیے کہا کہ مارکیٹ میں جگہ لینے کے بے شمار فائدے ہیں۔ ایک تو آپ کو بے شمار تجربہ کار لوگ مل جاتے ہیں جن سے آپ مدد لے سکتے ہو۔ دوسرے آپ کو افرادی قوت مل جاتی ہے۔ تیسرے بہت سے ایسے لوگ جو اپنا خام مال بیچتے ہیں، وہ ایسی منڈیوں میں لازمی آتے ہیں۔ ان کو بھی کہیں نہ کہیں سے سن گن ہو جاتی ہے کہ ایک نئی فیکٹری کھل گئی ہے۔ تو وہ آپ کے پاس بھی آتے ہیں۔ یوں آپ کو خام مال لینے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس مکان میں بڑے کمرے کو اپنا پروڈکشن ہال بناؤ جہاں رودے کی صفائی ہوگی۔ پروڈکشن ہال کے لیے کمرے میں تین چار چیمبر بنانے پڑیں گے اور پانی کی سپلائی کا مستقل بندوبست ہے۔ اس نظام کے لیے آپ کو ایک عمدہ ڈرم اور ایک چھوٹا جنریٹر لینا پڑے گا۔ میرا خیال ہے شروع میں بغیر جنریٹر کے بھی کام چلایا جا سکتا ہے کہ ٹینکی ٹلوائی جائے تا کہ بجلی جانے کی صورت میں پانی آتا رہے۔ اس کے علاوہ آپ کو میزیں لینا پڑیں گی جن پر [illegible] جا سکے۔ چھوٹے ٹب اور ڈرم بھی خریدنے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ دفتر کے سیٹ اپ کے لیے ایک عمدہ کمپیوٹر، پرنٹر، ٹیلیفون اور ایک کرسی میز کی ضرورت ہوگی۔ یہ ہوگئی آپ کی فیکٹری تیار!

میرا خیال ہے ان تمام چیزوں پر آپ کا [illegible]

لاکھ روپے خرچ اٹھے گا بشمول پانی کے نظام اور چیمبر بنوانے کے۔ اب رہی مزدوروں کی بات، تو اس کے لیے آپ کو تجربہ کار مزدور مارکیٹ ہی سے ملیں گے۔ انھیں تھوڑی سی بہتر تنخواہ دے کر آپ اپنی طرف لا سکتے ہیں۔ ان ہی میں سے کسی کو سپروائزر بنا کر اس سے کام سیکھو اور کاروبار کے گر بھی۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ فیکٹری بن گئی، مزدور آ گئے، تو کام کا آغاز کیسے کیا جائے؟ اگر آپ اپنی پوری توجہ ایکسپورٹ کی طرف لگاتے ہو تو بھی پہلا آرڈر ملنے میں تقریباً چھے مہینے لگیں گے۔ اب اس عرصے میں آپ مزدوروں کی تنخواہیں، دفتر کا کرایہ اور فیکٹری کا کرایہ کہاں سے نکالو گے؟ پھر دوسرا اہم مسئلہ یہ کہ اگر آپ کو اپنے مال کی صحیح پہچان نہیں اور آپ نے غلط مال باہر بھیج دیا، تو نقصان اپنی جگہ، کمپنی کا نام بھی بدنام ہوگا۔



ان مسائل کا بہتر حل ہے کہ آپ خام مال مذبح خانوں سے لے کر پہلے مرحلے میں بیوپاری بن کر ایکسپورٹرز کو بیچو۔ تقریباً آٹھ دس ماہ تک مقامی مارکیٹ میں کام کرنے کے بعد اللہ کا نام لے کر ایکسپورٹ کی طرف آ جاؤ۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ جب آپ مال مقامی ایکسپورٹرز کو دیں گے تو تھوڑے ہی عرصے میں مار کھائے بغیر مال کی کوالٹی سمجھ لو گے۔ اگر بالفرض مار کھاتے بھی ہو یعنی کوئی مزدور یا مال خریدنے والا آپ کو دھوکا دیتا بھی ہے، تو بھی بڑے نقصان سے بچ جاؤ گے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آپ کی فیکٹری کا خرچہ نکلتا رہے گا۔ تھوڑی بہت آپ کی اپنی کمائی بھی ہوگی اور جب تک ایکسپورٹ کا آرڈر نہیں ملتا، تب مزدوروں کی تنخواہیں وغیرہ مقامی مارکیٹ سے کما کر نکالتے رہو گے۔ تیسرا یہ کہ اس دوران آپ اپنے کام کی باریکیوں کو جان جاؤ گے اور ایکسپورٹ کے لیے مکمل تیار ہو گے۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مہینے کسی فیکٹری میں کام سیکھو اور پھر اپنا کام شروع کرو۔

علی نے پوچھا: طیب بھائی آپ نے پہلے مختلف کاروباری شعبوں کی تنظیموں کی ویب سائٹوں کا ذکر کیا تھا، تو کیا اس سیکٹر کی تنظیم بھی کوئی ویب سائٹ رکھتی ہے؟ اور کیا یورپی ممالک کی تنظیم کی ویب سائٹ کا بھی آپ کو پتا ہے؟

میں نے کہا ''ہاں بالکل پتا ہے: پاکستان کے ساسیج کیسنگ کے ایکسپورٹرز کی نمائندہ تنظیم (pakistan all animal natural sausage casings association) ہے جس کی ویب سائٹ www.pansca.org ہے۔ یہاں سے تم رکن کمپنیوں کا پتا لے سکتے ہو۔ اسی طرح یورپی ممالک سے ساسیج کیسنگ کی نمائندہ تنظیم (European Natural Sausage Casing Association) ہے جس کی ویب سائٹ www.ensca.eu ہے۔ جا کر تمام رکن ممالک کی ویب سائٹس اور ان کی تنظیموں کی رکن کمپنیوں کا پتا لے لو۔ اس کے علاوہ ساسیج کیسنگ کی عالمی ٹریڈرز کی تنظیم کا ویب سائٹ ایڈریس www.insca.org ہے۔ وہاں سے بھی تم رکن کمپنیوں کا پتا لے سکتے ہو۔

عام بوتلوں کے ٹکڑے

میری گفتگو ختم ہوئی، تو تیمور نے سوال پوچھا کہ کم قیمت کے علاوہ اور کس طریقے سے اس مارکیٹ میں بین الاقوامی حریفوں کا مقابلہ کرنا ممکن ہے؟ دوسرے آپ نے عام پلاسٹک والا بوتل کے ٹکڑوں کا ذکر کیا۔ کچھ اس کے بارے میں بھی بتائیے کہ وہ کہاں اور کیسے ایکسپورٹ ہو رہے ہیں۔

میں نے کہا ''پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ممالک کی حلال مارکیٹ میں ساسیج کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چونکہ اس میں خنزیر کی کیسنگ بھی استعمال ہوتی ہے، اس لیے مسلمان اسے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی ساسیج کیسنگ کو بطور حلال مصنوعہ مارکیٹ کرو اور حلال سرٹیفکیٹ لے لو تو یہ آپ کو اضافی فائدہ دے گا۔

اس کے علاوہ یہودیوں کا یورپ میں اچھا خاصا زور ہے اور وہ بھی اپنے کھانے میں کافی محتاط رہتے ہیں۔ ان کی زبان میں حلال کو کوشر کہا جاتا ہے اور حلال اشیا کوشر کے زمرے میں آتی ہیں۔ پاکستان میں ابھی تک کسی کے پاس کوشر کا سرٹیفکیٹ نہیں۔ اگر آپ سرٹیفکیٹ جاری کرنے والی کسی اچھی ساکھ کی حامل عالمی کمپنی سے کوشر سرٹیفکیٹ حاصل کر لو تو یہ نہ صرف کمپنی کی ساکھ بڑھانے گا بلکہ آپ کو اپنی مصنوعات کی فروخت بڑھانے میں بہت آسانی ہوگی۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پلاسٹک والی کولا بوتل کو پیٹ بوتل کہتے ہیں۔ پیٹ (PET) پلاسٹک کی ایک قسم ہے۔ ان کو ٹکڑوں میں توڑ کر ری سائیکلنگ کر کے اس سے دوبارہ پیٹ بوتلیں بنتی ہیں۔ پاکستان سے یہ ٹکڑے یا فلیک چین ایکسپورٹ ہوتے ہیں۔ چین فی الوقت اس مال کا دنیا میں سب سے بڑا خریدار ہے۔ اس کے علاوہ یہ مشرقی یورپ کے ملکوں کو بھی ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں جہاں ان کی بہت مانگ ہے۔

ان بوتلوں کو پہلے گرم پانی میں ڈالا جاتا ہے تاکہ اگر زہریلے کیمیکل ہوں، تو ان کا اثر ختم ہو جائے۔ پھر انھیں ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ انھیں توڑنے کے لیے ایک مشین لگتی ہے جسے کرشر کہا جاتا ہے۔ ایک کرشر مشین دو سے تین لاکھ روپے میں ملتی ہے۔ تم اسے خرید سکتے ہو یا کوئی بھی مقامی مکینک رستری تمھیں یہ مشین تیار کر دے گا۔ اس مشین کے علاوہ دو گودام، ایک خام مال یعنی سالم بوتلوں اور دوسرا تیار شدہ مال یعنی پیٹ فلیک کے لیے چاہیے ہوگا۔ کچھ افرادی قوت بھی درکار ہوگی۔ دوسرا حل یہ ہے کہ تم کسی مینوفیکچرر سے جس کے پاس کرشر کی مشین ہو، تیار شدہ مال لے کے اسے ایکسپورٹ کر دو۔ جب تمہارا کام چل نکلے، تو تم اپنی مشینیں لگا لو۔

اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اس وقت پاکستان میں کون لوگ یہ کام کر رہے ہیں، تو گوگل پر pet bottle flake exporter pakistan لکھ کر سرچ کرو۔ تمھیں کافی کمپنیوں کا ڈیٹا مل جائے گا۔ ملتان کی ایک کمپنی ساسیج کیسنگ اور پیٹ بوتل فلیک، دونوں ایکسپورٹ کرتی ہے۔ اس کی ویب سائٹ http://www.multanhide group.com/mi/sheepcasing.htm سے تمھیں متعلقہ معلومات، تصاویر اور عالمی مارکیٹنگ کا اچھا فلو چارٹ مل جائے گا۔

اسی طریقے سے تم ہینڈی کرافٹ یعنی دستکاریوں اور مختلف ثقافتی مصنوعات کو جدت دے کر بھی ایکسپورٹ کر سکتے ہو۔ اس کے لیے فیکٹری لگانے کی ضرورت نہیں۔ بس تمھیں یہ پتا ہونا چاہیے کہ انڈین ایسی مصنوعات کا کیا ریٹ دے رہے ہیں۔ تم کیا ریٹ دے سکتے ہیں اور یہ مصنوعات تمھیں اچھے ریٹ پر وافر کہاں سے ملیں گی۔

اس وقت پاکستان سے سنگ مرمر کی مختلف اشیا مثلاً ٹیبل لیمپ، ٹیبل کلاک اور پتھر کی بنی مختلف اشیا ایکسپورٹ کی جا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی مختلف اشیا ایکسپورٹ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً میں مظفر آباد کی مدینہ مارکیٹ گیا۔ وہاں کے

بتاؤں گا کہ بنی ہوئی خوبصورت قالین وال ہینگنگ جو پنج ستارہ ہوٹلوں نے اپنے ریستوران یا کمروں میں لگائی ہوتی ہیں، چار ہزار روپے کی مل گئی۔ یہ اگر ایکسپورٹ کی جائے تو کم از کم ۱۵ سے ۲۵ ہزار روپے کی فروخت ہوگی۔ اسی طرح وادی کاغان جاتے ہوئے راستے میں شینو اور جرید کے قصبے آتے ہیں جہاں خیبر پختونخوا حکومت نے دیار اور اخروٹ کی لکڑی کی بنی اشیا کا ڈسپلے سنٹر اور فیکٹری بنائی ہوئی ہے۔ وہاں سے آپ اچھی اور خوبصورت اشیا بیرون ممالک فروخت کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں گلگت بلتستان سے لے کر سندھ اور بلوچستان تک دستکاری اور ہینڈی کرافٹ کے خوبصورت نمونے پائے جاتے ہیں۔ مناسب کام کر کے انھیں باہر ایکسپورٹ کیا جا سکتا ہے۔

عالمی آن لائن ویب سائٹس مثلاً amazon.com اور ebay.com پر بھی اپنی آن لائن دکان بنا کر ان چیزوں کو با آسانی فروخت کرنا ممکن ہے۔ پاکستان کی ایک کمپنی thebluesaint.com انھیں آن لائن فروخت کر رہی ہے۔ ان کی ویب سائٹ پر جا کر تم ان کی مصنوعات دیکھ سکتے ہو۔ لاہور میں ڈیوس روڈ پر پاکستان ہینڈی کرافٹ کی ایک دکان ہے جہاں سے تم ایسی مصنوعات کی ایکسپورٹ کے مزید آئیڈیاز لے سکتے ہو۔ جو کمپنیاں یہ کام کر رہی ہیں ان کی معلومات تم ٹریڈ ڈیویلپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان کے کسی بھی دفتر سے لے لو یا ان کی ویب سائٹ پر جاؤ اور دفتر کا پتا لے کر ان کے پاس چلے جاؤ۔ آن لائن دکان بنانے کے حوالے سے تفصیل میں تمھیں تب بتاؤں گا جب آن لائن کاروبار کے موضوع پر بات کریں گے۔

میری بات ختم ہونے پر تراب نے تبصرہ کیا کہ ہم لوگوں کو گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر کے لیے کہیں نہ کہیں جانا چاہیے۔ تب ہمارا ارادہ یہ ہوگا کہ ان جگہوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی ثقافت کو سمجھنے اور کاروبار کے لیے ان کی اشیا پرکھنے والا بھی ہونا چاہیے۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتوں سے نوازا ہے جن کی منفرد اشیا ہم دنیا بھر میں بیچ کر نہ صرف اپنا بھلا بلکہ انھیں بنانے والے کاریگروں کا معیار زندگی بھی بلند کر سکتے ہیں۔

(ہم اس مضمون کے حوالے سے قارئین کی آرا کے منتظر رہیں گے۔ آرا دینے یا مضمون نگار سے کاروبار سے متعلق کوئی سوال پوچھنے کے لیے اس ای میل پر رابطہ کریں: tayyab.tariq@urdu-digest.com۔
نیز بذریعہ فون رابطہ کرنے کے لیے اس نمبر پر میسج یا کال کیجیے: ۰۳۳۳-۴۷۷۷۳۸۹)

گلگت بلتستان انتہائی خوبصورت علاقہ ہے جہاں سے خشک خوبانی، شہد، میوہ جات اور اسی طرح کی دوسری اشیا بے شمار ملکوں کو ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں۔ وہاں کی روایتی ثقافتی مصنوعات تو ایکسپورٹ کے نقطہ نظر سے قیمتی خزانہ ہیں۔ اسی طرح سندھ اور جنوبی پنجاب کی روایتی کاشی کاری، مخصوص سندھی ڈیزائن کے برتن وغیرہ یہ سب مخفی خزانہ ہیں۔ ضرورت صرف دریافت کی ہے۔

علی کے ایک دوست نے پوچھا "طیب بھائی بس ایک آخری سوال ہے بتائیے، پاکستان سے اور کیا کچھ چیزیں ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں؟"

میں نے جواب دیا: پاکستان سے اتنی چیزیں ایکسپورٹ ہو سکتی ہیں جتنی تمھارے ذہن میں آ جائیں۔ فی الوقت پاکستان سے جو چیزیں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں اور جن کے کاروبار میں کم سرمایہ لگتا ہے ان میں چمڑے کی بنی جوتیاں، آلو کے چپس، تیار شدہ (ریڈی میڈ) کپڑے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں شامل ہیں۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ علی کے گھر سے فون آ گیا۔ انھوں نے اجازت مانگی اور یوں یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

وہ اُسے زندگی سے پیاری تھی

چھابڑی والے کا صدقہ

فالسے بیچنے والے ایک لڑکے کا
روح پرور قصہ، وہ اپنی کُل کائنات
بچانے کے لیے جان پر کھیل گیا

نیلم احمد بشیر



گرمی اُس دن کچھ زیادہ ہی زوروں پر تھی۔ مئی کا مہینہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی سورج کی شعاعیں گھر سے باہر نکلتے ہی بے دم کیے دیتی تھیں۔

میں حسب معمول سودا سلف لینے بازار میں ایک سے دوسری دکان کے چکر لگا رہی تھی۔ گوشت، سبزی، دودھ اور دیگر ضروری اشیا کی خریداری کے بعد بھی میرے پاس کچھ وقت بچ گیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ درزی کی دکان کا چکر لگاؤں یا نہیں کہ میری نظر ایک فالسہ فروش پر جا پڑی۔

"میٹھے میٹھے فالسے! باجی جی فالسے لے لیں!" مجھے دیکھتے ہی اس نے زور سے آواز لگائی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، ایک کھڑی گاڑی کے پیچھے سے اپنی سائیکل نکالے چودہ پندرہ سالہ لڑکا، فالسوں کی چھابڑی سجائے کھڑا تھا۔ کالے کالے ننھے منے کھٹے میٹھے فالسے ہرے ہرے پتوں میں سجے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میرے منہ میں پانی آ گیا۔

"کیا بھاؤ دے رہے ہو؟" میں نے فالسوں کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کھا کر تو دیکھیں باجی جی! بھاؤ کی فکر نہ کریں!"

اُس نے مجھے چکھنے کی دعوت دے کر ترازو سنبھال لیا اور پوچھا "کتنے تولوں؟"

"پہلے یہ تو بتاؤ، کتنے روپے چھٹانک دے رہے ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"آپ کے لیے پانچ روپے باجی جی! بالکل مفت ہی

سمجھے نا۔ ویسے میں دوسروں کو تیس روپے دے رہا ہوں!'' اس نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔

''میں نے تو شربت بنانا ہے۔ اگر ایک کلو لوں، تو چار روپے لگاؤ گے؟'' میں نے بھی چالاکی دکھائی۔

''اچھا اگر ڈیڑھ کلو لے لیں، تو چار روپے کر دوں گا!'' وہ فالسے ترازو میں ڈالتے ہوئے بولا ''شربت کے لیے، ڈیڑھ کلو سے کم کیا لینا۔ یہاں تو بیگمات چار پانچ کلو لے کر جاتی ہیں مجھ سے۔ شربت بنا کر فریزر میں رکھ لیتی اور سارا سال استعمال کرتی ہیں۔''

اب اس نے میری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا چلو بھئی ڈیڑھ کلو ہی کر دو۔ مگر ذرا جلدی!'' میں نے بحث سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ گرمی میں کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔

فالسے تولتے ہوئے اس نے پسینہ پونچھنے کے لیے سر پر بندھے صافے کا ایک پلو زور سے اپنے چہرے پر رگڑا۔ تبھی میں نے اس کے لباس پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ معمولی کپڑے کا جوڑا پسینے سے بھیگ کر تن بدن سے چپک رہا تھا۔

''بیٹا! یہ تم نے اتنی گرمی میں اتنا موٹا جوڑا کیوں پہن رکھا ہے؟ ململ کا یا ویل لون کا کوئی پتلا کرتا کیوں نہیں پہن لیتے، جس میں گرمی کچھ کم لگے؟'' مجھ سے رہا نہ گیا۔

''باجی جی کیا کریں! پتلا کرتا بنائیں، تو وہ زیادہ دیر نہیں چلتا۔ ہم تو ایسا لباس پہنتے ہیں جو کئی سال نکال دے۔ گرمی میں تو یوں بھی کپڑے بار بار دھلتے ہیں جی! اس لیے پتلے کپڑوں کا نخرہ ہم غریب لوگ کہاں برداشت کر سکتے ہیں جی!'' اس کے جواب سے میں لاجواب ہو گئی۔

''اچھے اچھے موٹے موٹے دانے ڈالنا بیٹا! یہ کچلے ہوئے مریل دانے مجھے نہیں چاہئیں!'' میں نے ایک فالسہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''باجی جی! جاتی بہار کا تحفہ ہے۔ آدھا کلو اور نہ کر دوں!'' وہ زبردستی مجھے مزید فالسے بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔

''بس بس اتنے ہی کافی ہیں!'' میں نے اسے منع کیا اور پوچھا۔

''اچھا یہ بتاؤ جب فالسوں کا موسم ختم ہو جائے گا تو کیا بیچو گے؟ پھر کیا کرو گے؟''

''اللہ ہمیں روزی دینے والا ہے جی۔ دیکھیں نا فالسہ گیا، تو شہتوت، جامن، آم اور دوسرے پھل آ جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے، چھابڑی میں کچھ بھی لگا لیں گے۔ اصل سہارا تو ہماری یہ چھابڑی ہے جی۔ یہ ہماری ماں ہے، ہمیں پالتی ہے، اسے خالی، تو نہیں رکھیں گے نا!'' اس نے بڑے فخر سے اپنی پنکچر سائیکل پر مضبوطی سے ٹکی چھابڑی کو دھیرے سے ٹھوکا دیا اور فالسوں پر برے خوشنما پتے سجانے لگا۔

اس لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے یہ پوری دھرتی ایک وسیع و عریض چھابڑی ہے جو کسی نہ کسی طریقے اور رنگ میں ہمیشہ سے ہم سب کا پیٹ پالتی چلی آئی ہے۔ اس نے کبھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔

''دن بھر میں کتنا کما لیتے ہو تم؟''

''بس جی پچاس ساٹھ روپے، تو بچ ہی جاتے ہیں۔ دال روٹی چل جاتی ہے، شکر ہے اس باری تعالیٰ کی ذات کا۔ گھر میں کھانے والے سات جی ہیں اور میں اکیلا کمانے والا ہوں گھر والوں کا!''

وہ فخریہ انداز میں بولتا چلا گیا۔ اور میں سوچنے لگی کاش یہ بچہ اس وقت اسکول میں بائرن اور کیٹس کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پڑھ رہا ہوتا۔ شام کو ہونے والے کسی کرکٹ کا ٹینس ٹورنامنٹ کی تیاری کرتا یا گرمی کی چھٹیوں میں اپنے والدین کے ساتھ ''ورلڈ ٹور'' پر جانے کے منصوبے بناتا۔

میں نے اسے پیسے دیے اور ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی گاڑی کی طرف چل دی۔

یکا یک میرا دل زور سے دھڑکا۔ اسے پتا نہیں چل سکا لیکن میں نے دیکھا کہ جس کھڑی گاڑی کے پچھلے حصے سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، وہ یکایک پیچھے چلنا شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ فالسہ فروش کو گاڑی چلنے کا علم ہوتا، وہ اسے ایک جھٹکے سے نیچے گرا چکی تھی۔

بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی اور اسے گھسیٹ کر دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ معصوم محنت کش گاڑی تلے کچلا جائے گا۔ سر پر باندھا صافہ کھل کر اس کی سائیکل تلے روندا گیا۔ مگر گرتے گرتے بھی اس نے ایک ہاتھ اپنی سائیکل پہ جمائے رکھا اور وہ کھڑی رہی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ ملی۔ میں ٹھہری ازل کی ڈرپوک۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ بچ گیا۔ اور اس کی چھابڑی بھی محفوظ رہی۔ یہ سوچ کر دل دہل اٹھنے لگے کہ غریب محنت کش بچہ اگر کچلا جاتا تو اس کے گھر والوں کا کیا حشر ہوتا۔

وہ کپڑے جھاڑتا، مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ذرا پیچھے دیکھ کر ریورس کیا کریں! ابھی فالسے والے کو نیچے دینے لگی تھیں! گاڑی چلانے سے پہلے کم از کم ہارن ہی دے دیا ہوتا!" میں نے گاڑی چلانے والی خاتون سے درشت لہجے میں کہا۔

"قصور ان لوگوں کا ہے۔ گاڑیوں کے پیچھے ٹیک لگا کر سودا بیچنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بہر حال میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ ویسے بھی ان لوگوں میں کوئی سمجھ نہیں ہوتی۔" وہ اپنی صفائی میں بولنے لگی اور پھر گاڑی بھگا لے گئی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا بیٹا؟"

کون سے نبی کہاں دفن ہیں؟

۱۔ حضرت آدمؑ ...... سری لنکا میں
۲۔ حضرت نوحؑ ...... اردن میں
۳۔ حضرت حوّا ...... یمن میں
۴۔ حضرت صالحؑ ...... لبنان میں
۵۔ حضرت لوطؑ ...... عراق میں
۶۔ حضرت ابراہیمؑ ...... اسرائیل میں
۷۔ حضرت اسحاقؑ ...... فلسطین میں
۸۔ حضرت یعقوبؑ ...... فلسطین میں
۹۔ حضرت یوسفؑ ...... فلسطین میں
۱۰۔ حضرت ایوبؑ ...... عمان میں
۱۱۔ حضرت شعیبؑ ...... شام میں
۱۲۔ حضرت اسماعیلؑ ...... سعودی عرب میں
۱۳۔ حضرت محمد ﷺ ...... مدینہ طیبہ (سعودی عرب)

(مرسلہ: طارق خلیل شاہ، منڈی بہاؤالدین)

"ہاں جی بالکل فٹ کلاس، کچھ بھی تو نہیں ہوا!" وہ بے فکری سے بولا۔

میں بمشکل سے اس کی جان بچی، مگر وہ یوں پرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"دیکھو بیٹا، گھر جا کر کوئی صدقہ وغیرہ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے آج تمھاری جان بچا لی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں باجی جی! صدقہ تو ضرور دوں گا۔ میری چھابڑی بچ گئی ورنہ نجانے کیا سے کیا ہو جاتا۔"

وہ سائیکل پر اپنی چھابڑی کو بڑے پیار سے تھپکیاں مارتا ٹھنڈے میٹھے فالسے کی صدا لگاتا چل دیا۔

"ہم اپنے حصے کی شمع جلا چکے"

اُردو ڈائجسٹ کے شمارہ مئی کی تعارفی تقریب کا احوال

محمد اسلم لودھی

ڈاکٹر ہارون رشید چودھری لاہور کے ممتاز سماجی راہنما گزرے ہیں۔ وہ فاؤنٹین ہاؤس کے سربراہ رہے۔ جہاں نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا مرد و زن کا علاج ہوتا ہے۔ مرحوم ساری عمر انسانیت کی خدمت کرتے رہے اور یہی کارِ خیر انجام دیتے وفات پا گئے۔ ان کا

ایک خوبصورت قول ہے: "تاریکی کو کوسنے دینے سے بہتر ہے کہ آپ شمع جلا دیجیے"۔

۵۵ سال قبل اسی قول کو عملی شکل دیتے ہوئے قریشی برادران نے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت ایسا کوئی رسالہ نہ تھا جو علم و ادب کے جدید موضوعات عام فہم انداز میں عوام الناس تک پہنچا اور سمجھا سکے۔ اسی لیے پاکستانیوں کی اکثریت علمی و ادبی تحریروں سے یکسر بے خبر تھی۔ اردو ڈائجسٹ نے سہل زبان میں تحریریں شائع کر کے نہ صرف یہ کمی پوری کی بلکہ عوام کو سیاسی سطح پر بھی باشعور بنا دیا۔

19 مئی 2015ء کو اکادمی ادبیات (پاکستان) لاہور کے مرکزی دفتر میں اردو ڈائجسٹ شمارہ مئی کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض ممتاز شاعر اور دانشور، جناب ڈاکٹر اختر شمار نے انجام دیے۔ صدارتی ایوارڈ یافتہ مصور، خطاط، ماہر اقبالیات اور ادیب جناب اسلم کمال مہمانِ خصوصی کی حیثیت



سے شریک ہوئے۔ جبکہ مقررین میں جناب ابصار عبدالعلی، ڈائریکٹر حمید نظامی پریس انسٹیٹیوٹ، ممتاز کالم نگار قاضی محمد منشا، سیکرٹری اکادمی ادبیات محمد جمیل اور محمد اسلم لودھی شامل تھے۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ادیبہ و شاعرہ عمرانہ مشتاق کے سپرد تھے۔

ٹھیک پانچ بجے سہ پہر تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ یہ سعادت حافظ قاری احمد ہاشمی نے حاصل کی۔ اسٹیج سیکرٹری محترمہ عمرانہ مشتاق نے تعارفی تقریب کے انعقاد پر مختصر روشنی ڈالی اور پھر منیجر تعلقات عامہ اردو ڈائجسٹ، محمد اسلم لودھی کو اسٹیج پر اظہار خیال کے لیے بلایا۔ انھوں نے تقریب کے انعقاد کے مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم میڈیا کے دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ بات جو کبھی مہینوں بعد بھی لوگوں تک نہیں پہنچتی تھی، ذرائع ابلاغ کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت چند سیکنڈوں میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نے ۵۵ سال پہلے اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے جو قندیل روشن کی تھی، اس کی روشنی آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ذہن و دل کو روشن اور منور کر رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو ڈائجسٹ کا نام ہر سطح پر معتبر حوالہ بن چکا۔ جس نے یہ ڈائجسٹ نہیں پڑھا، وہ بھی اس کے نام سے واقف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ڈائجسٹ سے وابستہ دو عظیم ادبی اور صحافتی شخصیات ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور جناب الطاف حسن قریشی نے اپنے لہو سے اس پودے کی آبیاری کی ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، مالی پریشانیوں سے عہدہ برآ ہوئے لیکن اپنے مقصد اور عزم سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔

یہی وجہ ہے، نسل در نسل پڑھا جانے والا اردو ڈائجسٹ آج بھی ہر خاندان میں فرد کی حیثیت سے مقبول عام ہے۔ یہ وہ ڈائجسٹ ہے جس کو دادا بھی شوق سے پڑھتے ہیں اور پوتا بھی پڑھنے کا اتنا ہی ذوق رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ڈائجسٹ دنیا بھر میں اردو پڑھنے والوں کے خاندانوں کا ایک اہم فرد تصور کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد انہوں نے اردو ڈائجسٹ شمارہ مئی کے چیدہ مضامین پر مختصر روشنی ڈالی جسے سامعین نے بے حد سراہا۔

اس کے بعد قاضی محمد منشا کو اظہار خیال کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے لیے آج کا دن مسرت آلود فضائے بسیط سے پوری طرح لبریز ہے کہ مجھے اس شہرہ آفاق ڈائجسٹ پر گفتگو کرنے کا شرف بخشا گیا ہے جس نے پاکیزہ معاشرے کی تشکیل میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور قومی زبان اردو کو فروغ دیا۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ جناب الطاف حسن قریشی کا اس ملت پاکستانیہ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے حق گوئی اور بے باکی کی ایسی لازوال داستانیں رقم کی ہیں جن کا تذکرہ حکومت کے ایوانوں سے لے کر ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اصحاب فکر و دانش کی زبان پر رہتا ہے۔

جناب الطاف حسن قریشی نے شمارہ مئی میں حالات و واقعات کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ آپ نے اپنے قلم کی قوت سے ظلمت کدہ آمریت میں وہ چراغ جلائے ہیں کہ ان کی لو آج بھی ہمارے سینوں میں عزم و ہمت کی قندیلیں روشن رکھے ہوئے ہیں۔ محمد منشا قاضی نے مزید کہا کہ اردو ڈائجسٹ کے صدر نشین ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ ان کی قائم کردہ کاروان علم فاؤنڈیشن ملک و ملت کی خدمت کے دس سال پورے کر چکی۔ الحمدللہ اس کی طرف سے پانچ ہزار سے زائد کم وسیلہ مگر باصلاحیت طلبہ و طالبات کو ساڑھے آٹھ کروڑ روپے سے زائد وظائف دیے جا چکے۔ اردو ڈائجسٹ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جہالت کی تاریکیوں کو علم و عرفان کی روشنی سے دور بھگانے میں مصروف ہے۔

حمید نظامی پریس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب ابصار عبدالعلی نے بہترین معیار اور اردو زبان کے فروغ میں اردو ڈائجسٹ کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس نے کردار اور

شخصیت سازی میں بہت اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ شعور کی آنکھ کھولتے ہی ہمارے ہاتھوں میں اردو ڈائجسٹ تھا جس کا مطالعہ نہ صرف ہمیں ذہنی و قلبی تسکین بخشتا بلکہ اس کی بدولت ہمیں نئی دنیاؤں سے تعارف بھی حاصل ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ آئین میں درج ہونے کے باوجود آج تک اردو زبان کو وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکا جو اسے حاصل ہونا چاہیے تھا۔ کسی بھی قوم کی ترقی کی داستان اٹھا کر دیکھیں تو قومیں اپنی زبان کی ترویج ہی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

صدارتی ایوارڈ یافتہ مصور اور ممتاز دانش ور جناب اسلم کمال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ڈائجسٹ سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے یہ ادبی و علمی ڈائجسٹ کا میں مستقل قاری ہوں۔ اس ڈائجسٹ نے بطور خاص قومی زبان اردو کے نفاذ اور ہر شعبے میں ترویج میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو ڈائجسٹ ایسا موقر جریدہ ہے جس کا اسلوب بعض دیگر جرائد نے بھی اپنایا۔ اپنے آغاز سے آج تک حق گوئی اور بے باکی کا علمبردار چلا آرہا ہے۔ ماضی میں یہ جریدہ سنسر اور بندش سمیت دیگر مشکلات کا شکار بھی رہا ہے لیکن مشکلات کتنی بھی زیادہ اور تلخ کیوں نہ ہوں اردو ڈائجسٹ سے وابستہ شخصیات نے ہمت اور حوصلہ نہیں ہارا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ وہ ڈائجسٹ ہے جو ہر گھر کا محبوب ترین ہے اور آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا نصف صدی پہلے تھا۔ اس کے پرانے شمارے بھی اپنے اوراق پارینہ میں صدیوں کی تاریخ اپنے دامن میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

سیکرٹری اکادمی ادبیات محمد جمیل نے کہا کہ اکادمی ادبیات کے مرکزی دفتر میں اردو ڈائجسٹ کی پہلی تعارفی تقریب کا انعقاد یقیناً ہمارے لیے اعزاز کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم اور اردو ڈائجسٹ یکساں طور پر اردو ادب اور قومی زبان کے فروغ کے لیے اپنی اپنی سطح پر کاوشیں کر رہے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ اردو پڑھنے والوں میں ایک معتبر نام اور حوالہ ہے۔

صدر مجلس ڈاکٹر اختر شمار نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو ڈائجسٹ کے بہترین معیار اور خوبصورت تحریروں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو ڈائجسٹ ہر دور میں مقبول عام رہا ہے۔ وقتی طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے اپنا سفر جاری رکھا جو لائق تحسین ہے۔ بطور خاص یہ نوجوان نسل کے لیے یہ ڈائجسٹ مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے تمام مقررین کی تقاریر کو سراہتے ہوئے اردو ڈائجسٹ کے شمارہ مئی کے چیدہ چیدہ مضامین کے بارے میں گفتگو کی۔

انہوں نے کہا، یوں تو تمام مضامین ہی قابل تعریف ہیں لیکن سب سے زیادہ محمد اسلم لودھی کا اپنے والد کے حوالے سے مضمون "مجھے اپنے باپ پر فخر ہے" نے مجھے متاثر کیا۔ یہ مضمون بطور خاص ہماری نوجوان نسل کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ والدین اور بچوں میں بڑھتی ہوئی دوریوں کو اسی طرح کم کیا جا سکتا ہے کہ بچے اپنے والدین کا دل کی گہرائیوں سے احترام کریں اور ان کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے سیکھیں۔ جو نوجوان اپنے والدین کا احترام کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو رہتا ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ مجھے جناب طیب اعجاز قریشی کا ادارتی نوٹ بھی اچھا لگا۔ بے شک ادارتی نوٹ کی شکل میں یہ مضمون بہت مختصر تھا لیکن اس میں چینی ثقافت، روایات، ترقی، اصول پسندی اور پاکستان سے والہانہ محبت کے اظہار، چین کی تاریخ، لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں بے شمار معلومات ملتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مضمون پڑھنے کے بعد چین کی جانب سے پاکستان میں بنائے جانے والے اقتصادی راہداری منصوبوں کی اہمیت کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ دور حاضر میں سب سے معتبر جریدہ ہے جس سے ہر سطح کے قارئین وابستہ ہیں۔ نوجوان نسل کو اپنے کردار کو سنوارنے اور روشن مستقبل کے لیے اردو ڈائجسٹ کے تجربے پر اعتماد کرنا ہوگا۔ یہی وقت کی آواز ہے۔

◆◆◆

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

• 560 روپے کی غیر معمولی بچت پایئے • اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے



اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے

معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنایئے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام __________ فون نمبر __________

پتا __________ ای میل __________

میں ماہ __________ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب کی کسی بھی برانچ میں جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ __________ دستخط __________

اردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن مینیجر۔ سمن آباد۔ لاہور۔ 54500۔ پاکستان۔ فون نمبر: +92-42-35290738 +92-42-37589957
ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: +92-42-35290731

محسنِ پاکستان

کیا صاحبِ کمال ہے عبدالقدیر خاں
اک شخص بے مثال ہے عبدالقدیر خاں

محسن ہے قوم کا تو محافظ وطن کا ہے
سب خواب ہیں، خیال ہے عبدالقدیر خاں

ہمدرد، خوش مزاج، خلیق اور صلح جو
ہر طرح خوش خصال ہے عبدالقدیر خاں

کرتا ہے اک زقند میں طے کتنا فاصلہ
شیرِ ببر کی چال ہے عبدالقدیر خاں

اک دشتِ بے اماں میں درندوں کے درمیاں
انسانیت کی ڈھال ہے عبدالقدیر خاں

ماضی کی غفلتوں کی تلافی کے واسطے
فردا ہے اور حال ہے عبدالقدیر خاں

غوری ہے جس کے ذہنِ رسا کا کمالِ فن
وہ عبدِ ذوالجلال ہے عبدالقدیر خاں

اس کی صدا پہ سارے زمانے کے کان ہیں
ایٹم، غزل، غزال ہے عبدالقدیر خاں

جس کے مقابلے میں ہیں گوہر بھی سب خزف
دھرتی کا ایسا لال ہے عبدالقدیر خاں

پرچے میں امتحان کے اس ملک و قوم کے
اک لازمی سوال ہے عبدالقدیر خاں

ممکن نہیں کہ کوئی اُسے زیر کر سکے
ہیرو ہے، لازوال ہے، عبدالقدیر خاں

ناصرؔ! میری نظر میں ہے وہ باعثِ سکوں
اک پیکرِ جمال ہے عبدالقدیر خاں

(ناصر زیدی)

غزل

دل کو کر دیتی ہے ناشاد رُلا دیتی ہے
ایسے آتی ہے کوئی یاد رُلا دیتی ہے

رنج سے لیتا ہے انسان مگر بعض اوقات
ایسی پڑ جاتی ہے افتاد رُلا دیتی ہے

اپنی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہی نہیں
جب ہو تکلیف میں اولاد، رُلا دیتی ہے

دل سے نکلے ہوئے الفاظ اثر رکھتے ہیں
دل سے نکلی ہوئی فریاد رُلا دیتی ہے

کوئی دکھ، دکھ نہیں لگتا جو میسر ہو تو
شادمانی بھی تیرے بعد رُلا دیتی ہے

میرے شعروں میں یہ تاثیر خدا بھرتا ہے
اس قدر ملتی ہے جب داد رُلا دیتی ہے

ناز کرتا ہے بہت میرے وطن تجھ پہ وحیدؔ
پر تیری حالت برباد رُلا دیتی ہے

(وحید احمد زمان، لاہور)

ایک مختلف قسم کی عبادت

جو تمام اسلامی عبادات میں اپنے نظامِ تربیت کے باعث منفرد مقام رکھتی ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی

روزے کے سوا دوسری جتنی عبادتیں ہیں وہ کسی نہ کسی ظاہری حرکت سے ادا کی جاتی ہیں۔ مثلاً نماز میں آدمی اٹھتا بیٹھتا، رکوع اور سجدہ کرتا ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حج میں ایک لمبا سفر کر کے جاتا اور پھر ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زکوٰۃ بھی ایک شخص [illegible] را لیتا ہے۔

ان سب عبادتوں کا حال چھپ نہیں سکتا۔ اگر آپ ادا کریں تب بھی دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر ادا نہیں کرتے تب بھی لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف روزہ ایسی عبادت ہے جس کا راز اللہ اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ نہ کھائے پیے۔ مگر چھپ کر پانی پی جائے یا کچھ چوری چھپے کھا پی لے، تو اللہ کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔ سب یہی سمجھتے رہیں گے کہ وہ روزے سے ہے جبکہ حقیقت میں وہ روزے سے نہ ہوگا۔

روزے کی اس حیثیت کو سامنے رکھو، پھر غور کرو کہ جو شخص حقیقت میں روزے رکھے۔ اس میں چوری چھپے کچھ نہیں کھاتا پیتا، سخت گرمی کی حالت میں بھی جبکہ پیاس سے حلق چٹخا جاتا ہو، پانی کا ایک قطرہ حلق سے نیچے نہیں اتارتا۔ سخت بھوک کی حالت میں بھی جبکہ آنکھوں میں دم آ رہا ہو، کوئی چیز کھانے کا



ارادہ تک نہیں کرتا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے پر کتنا ایمان ہے۔

کس قدر زبردست یقین کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت چاہے ساری دنیا سے چھپ جائے، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتی۔ کیسا خوفِ خدا اس کے دل میں ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف اٹھاتا ہے، مگر صرف اللہ کے ڈر کی وجہ سے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے روزے کو توڑنے والا ہو۔ کس قدر زبردست یقین ہے اس کو آخرت کی جزا و سزا پر کہ مہینا بھر وہ صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے بارہ بارہ گھنٹے کے روزے رکھتا ہے اور اس دوران کبھی ایک لحظے کے لیے بھی اس کے دل میں آخرت کے متعلق شک کا شائبہ تک نہیں آتا۔

اگر اسے اس بات میں ذرا بھی شک ہوتا کہ آخرت ہوگی یا نہ ہوگی اور اس میں عذاب و ثواب ہوگا یا نہ ہوگا تو وہ کبھی اپنا روزہ پورا نہیں کر سکتا۔ شک آنے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ آدمی اللہ کے حکم کی تعمیل میں کچھ نہ کھانے پینے کے ارادے پر قائم رہ جائے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ہر سال کامل ایک مہینا تک مسلمان کے ایمان کو مسلسل آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اور اس آزمائش میں آدمی جتنا پورا اترے، اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ یہ گویا آزمائش کی آزمائش ہے اور تربیت کی تربیت! آپ جب کسی شخص کے پاس امانت رکھوائیں، تو گویا اس کی ایمانداری کی آزمائش کرتے ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں پورا اترے اور امانت میں خیانت نہ کرے، تو اس کے اندر امانتوں کا بوجھ سنبھالنے کی اور زیادہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ امین بنتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی مسلسل ایک مہینے تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے تک آپ کے ایمان کو کڑی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ جب آزمائش میں آپ پورے اترتے ہیں، تو آپ کے اندر اس بات کی مزید قابلیت پیدا ہونے لگتی ہے کہ اللہ سے ڈر کر دوسرے گناہوں سے بھی پرہیز کریں۔ اللہ کو عالم الغیب جان کر چھپ کر بھی اس کا قانون توڑنے سے بچیں اور ہر موقع پر قیامت کا وہ دن آپ کو یاد آ جائے جب سب کچھ کھل جائے گا اور بغیر کسی رو و رعایت کے بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا بدلہ ملے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا:

> اگر کوئی تم پر احسان کرے، تو پہلے حق کا شکر ادا کرو پھر اس شخص کا کیوں کہ خدا نے اسے تم پر مہربان کیا ہے۔
> (بایزید بسطامیؒ)

ترجمہ: ''اے اہل ایمان، تمھارے اوپر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔'' (سورۃ البقرہ:۱۸۳)

روزے کی ایک دوسری خصوصیت بھی ہے، وہ یہ کہ اس کے ذریعے مسلمان طویل مدت تک شریعت کے احکام کی لگاتار اطاعت کرتا ہے۔ نماز کی مدت ایک وقت میں چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت سال بھر میں صرف ایک وقت آتا ہے۔ حج میں البتہ لمبی مدت صرف ہوتی ہے، مگر اس کا موقع عمر بھر میں ایک دفعہ آتا ہے اور وہ بھی سب کے لیے نہیں۔

اس کے برخلاف روزہ ہر سال پورے ایک مہینے تک شب و روز شریعت محمدیؐ کے اتباع کی مشق کراتا ہے۔ صبح سحری کے لیے اٹھو، ٹھیک فلاں وقت پر کھانا پینا چھوڑ دو۔ دن بھر فلاں کام کر سکتے ہو اور فلاں فلاں نہیں۔ شام کو ٹھیک فلاں وقت پر افطار کرو، پھر کھانا کھا کر آرام کرو، پھر تراویح کے لیے دوڑو۔

اس طرح ہر سال کامل مہینا بھر صبح سے شام تک مسلمان کو مسلسل فوجی سپاہیوں کی طرح پورے قاعدے اور ضابطے میں باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ پھر گیارہ مہینے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جو تربیت ایک مہینا میں مسلمان نے حاصل کی ہے، اس کے اثرات ظاہر ہوں۔ اور جو کمی پائی جائے وہ پھر دوسرے سال کی تربیت میں پوری ہو جائے۔ (از خطبات)

◆◆◆



ہزار ہا برس قدیم

روزے کی تاریخ

مذاہبِ عالم میں روزے رکھنے کے ہمہ رنگ رسم و رواج

رضوان علی

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بنی نوع انسان کو خبر دی ہے: "اے ایمان والو! تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

یہ آیت ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام سے قبل آنے والے مذاہب کے لوگوں پر بھی روزے فرض کیے تھے تاکہ انھیں متقی و مسلمان بنایا جا سکے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ روزے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ مشہور عالم دین، علامہ سید سلمان ندویؒ اپنی کتاب "ارض القرآن" میں رقم طراز ہیں:

"قدیم مصر میں مصری بعض مذہبی میلوں کے دوران روزے رکھتے تھے۔ تاہم یہ روزے ان پہ فرض نہ تھے۔ اسی طرح قدیم یونان میں صرف خواتین مذہبی میلوں کے موقع پر روزے رکھتیں۔ زرتشتی مذہب میں پروہتوں پر فرض تھا کہ وہ روزے رکھیں۔ عام لوگ اس سے مستثنیٰ تھے۔"

قدیم ہندوؤں میں بھی مذہبی لحاظ سے مخصوص دنوں میں بھوکا رہا جاتا۔ ہندوؤں کے کئی فرقے ہیں، چناں چہ ہر فرقہ سال کے مخصوص دنوں میں روزہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر دیوی درگا کے پیروکار ہر سال ماہ اکتوبر میں اس سے وابستہ مذہبی میلا، "نورات" منعقد کرتے ہیں۔ یہ میلا نو راتیں دس دن جاری رہتا ہے۔ اس دوران درگا کے لاکھوں پیروکار روزے رکھتے ہیں۔ وہ صبح سے شام تک جو کے پیالے

رہتے ہیں۔

ہندو پیر اور منگل کو مقدس دن سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے درمیان دونوں میں روزے رکھنا عام ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر وہ دن بھر بھوکے پیاسے رہیں تو دیوتا ان کے من کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ اسی لیے ہندو ذوق و شوق سے روزے رکھتے ہیں۔

قدیم یونان میں فلسفیوں نے روزے کو طبی لحاظ سے مفید پایا۔ چناں چہ سقراط اور افلاطون جسمانی اور ذہنی تندرستی، چستی کے لیے روزے رکھتے۔ فیثا غورث اپنے طلبہ کو حکم دیتا کہ وہ ہفتے میں ایک دن ضرور صبح تا شام بھوکے پیاسے رہیں۔

بدھ مت بھی دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔ اس کے پیروکاروں پر روزے فرض نہیں۔ تاہم بھکشوؤں میں عبادت کرنے والے کئی بلکہ طویل عرصہ بھوکے پیاسے رہتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا کہ نفس کو شدائد زندگی کا عادی بنایا جائے۔

جین مت، بدھ مت کی شاخ ہے۔ اس کے پیروکار زیادہ باقاعدگی سے روزے رکھتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر فلسفہ عدم تشدد راسخ ہو جائے۔ جینی ۸ سے ۳۰ یا ۳۰ دن کے روزے رکھتے ہیں۔ یہ روزے دن کے اوقات یا رات کو رکھے جاتے ہیں۔ رات کا روزہ غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک جاری رہتا ہے۔

آسمانی مذاہب میں یہودیت پہلا مذہب ہے۔ اس کے بانی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی، مگر وہ اب اصل شکل میں موجود نہیں۔ اسی لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہودی ماضی میں کس طرح روزے رکھتے تھے۔

بہرحال آج یہودی سال کے مختلف دنوں میں روزے رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم "یوم کپور" ہے۔ اس دن تقریباً ہر بالغ یہودی مرد اور عورت روزہ رکھتا ہے۔ صرف شدید بیمار ہی اس فرض سے بری ہیں۔

یوم کپور یہود کا مقدس ترین دن ہے۔ یہ یہودی کیلنڈر کے

کام کی باتیں

☆ عافیت تنہائی میں ہے اور سلامتی خاموشی میں۔

☆ بہت سے زمین پر چلنے پھرنے والے مردہ ہیں اور بہت ایسے ہیں جو قبروں میں مدفون ہونے کے باوجود زندہ ہیں۔

☆ جوانمرد وہ ہے کہ اسے ایک نعمت میسر ہو اور اس کے بھائی کو ہزاروں تو وہ اپنی ایک نعمت بھی بھائی کو دے ڈالے۔

☆ بیدار آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب وہ یادِ حق کرے، تو سر سے پاؤں تک متاثر نظر آئے۔

ساتویں مہینے دسویں تاریخ کو آتا ہے۔ اس دن یہودی "۲۵ گھنٹے" کا روزہ رکھتے ہیں۔ یہ روزہ غروب آفتاب سے شروع ہوتا اور اگلے دن سورج ڈھلنے پر کھولا جاتا ہے۔

یہ دن دراصل یہود کا یوم توبہ ہے۔ اس دن یہودی باجماعت اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور توبہ کرتے ہیں۔ نیز آنے والے وقت میں نیکیاں کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

اس دن یہودی کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ازدواجی تعلقات سے بھی دور رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کام کرنے سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ روزے کا بیشتر وقت معبد میں گزارتے ہیں یا گھر بیٹھے عبادت کرتے ہیں۔

اشکنازی یہودیت میں یہ رواج ہے کہ میاں بیوی رسم نکاح سے قبل روزہ رکھتے ہیں۔ جبکہ اس دن کو ذاتی یوم کپور سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں پریشانی یا غم میں گرفتار یہودی بھی روزہ رکھتے ہیں تاکہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

بائبل کی کتابوں ... اشعیا، زکریا اور دانیال میں روزوں

سے متعلق احکام و قواعد بیان ہوتے ہیں۔ چونکہ عیسائی بھی بائبل کو اپنی مذہبی کتاب مانتے ہیں۔ لہٰذا عیسائیوں میں بھی روزے رکھنے کا رواج ہے۔ تاہم ہر عیسائی فرقے کے باشندے اپنے طور طریقوں سے روزے رکھتے ہیں۔

عیسائی دنیا میں سب سے مشہور ''چلہ روزے'' (Lent) ہیں۔ اس موقع پر بیشتر عیسائی فرقوں مثلاً رومن کیتھولک، لوتھری، میتھوڈسٹ، انجیلکن، کیلونسٹ وغیرہ کے پیروکار چالیس دن تک جزوی روزے رکھتے ہیں۔ یہ وہ مخصوص دن ہیں جن میں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو یہود کے ہاتھوں ظلم و ستم برداشت کرنا پڑا۔

چین کے مقامی مذاہب میں تندرستی و صحت پانے کے لیے روزے رکھنے کا رواج ہے۔ جبکہ سکھ مت شاید واحد مذہب ہے جس میں پیروکاروں کو روزہ نہ رکھنے کی تلقین ہوئی ہے۔ سکھ مت کے گروؤں کا دعویٰ ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کو کوئی جسمانی و روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

بہائی مذہب کے پیروکار ہر سال ۲ مارچ تا ۱۹ مارچ کے دنوں میں روزے رکھتے ہیں۔ یہ روزے ۱۵ سے ۷۰ سال کے بالغ پر فرض ہیں۔ اسلام کی طرح بہائی مت میں بھی روزہ دینی ارکان کا ایک اہم رکن ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں روزے کو جو اہمیت و فضیلت دی گئی ہے، وہ کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لیے قرآن و سنت میں رمضان اور روزوں سے متعلق کئی ہدایات، احکام اور احادیث موجود ہیں۔ ہمارے دین میں روزہ انسان کو جسمانی و روحانی بیماریوں سے بچانے والی بہترین ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزہ ایک ڈھال ہے۔ وہ مسلمان کو بدی سے بچاتا ہے۔ اس لیے روزہ رکھنے والے کو چاہیے کہ وہ فحش گوئی سے دور رہے، غصے میں اپنی آواز بلند نہ کرے۔ اگر کوئی اس سے الجھنے کی سعی کرے، تو نرمی سے کہہ دے، میں روزے سے ہوں۔ اور تم سے جھگڑا نہیں چاہتا۔'' (صحیح مسلم)

حرام و ناحق مال کھانے کی ممانعت

روزہ رکھنے اور روزوں کے درمیان کھانے پینے سے باز رہنے کے حکم کے زیر سایہ ایک اور قسم کے کھانے کی ممانعت آتی ہے اور وہ ہے ''لوگوں کے مال ناحق طور پر کھانا'' اس کی شکل یہ ہے کہ عدالت میں مقدمہ دائر کیا جانے اور قرائن و حالات اور دستاویز کے سلسلے میں حاکم کو مغالطہ میں مبتلا کیا جائے اور چرب زبانی اور حجت بازی سے اسے دھوکا دیا جائے تاکہ وہ ان حالات کے مطابق فیصلہ کرے جو اس کے سامنے آئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے۔ یہ ممانعت حدود اللہ کے ذکر اور اللہ سے تقویٰ کی دعوت کے بعد کی گئی تاکہ خشیت الٰہی کا، جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے ارتکاب سے انسان کو روکتی ہے، سایہ اور اثر برقرار رہے۔

ولاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھآ الی الحکام لتاکلو فریقا من اموال النّاس بالاثم وانتم تعلمونO

''اور تم لوگ آپس میں اپنے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، نہ انھیں حکام کے پاس لے جاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ حق تلفی کرکے ہڑپ کرلو، جانتے بوجھتے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول، اردو ترجمہ سید معروف شاہ شیرازی، (ترتیب: خرم مراد)

رمضان کریم

اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کو رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس ماہِ مبارک میں انسانیت کی راہنمائی کے لیے آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔ چناں چہ احمد اور مردویہ کی روایت کے مطابق صحف ابراہیم رمضان کی پہلی رات میں نازل ہوئے۔ تورات، رمضان کی ساتویں رات کو نازل ہوئی۔ انجیل رمضان کی تیرہویں رات میں اور قرآن شریف پچیسویں رات میں نازل ہوا۔

تاریخ اسلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک جہاد اور فتوحات کا مہینہ رہا ہے۔ اس ماہِ مقدس میں جہاد کا پرچم بار بار بلند ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو فتح و کامرانی سے نوازا۔ رمضان المبارک کی مناسبت سے تاریخ اسلام کے کچھ اہم واقعات درج ذیل ہیں۔

غزوات و فتوحات

۱۔ ہجرت نبویؐ کے صرف سات ماہ بعد رمضان المبارک میں آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی قیادت میں بحر احمر کے ساحل کے قریب العیص مقام کی طرف ۳۰ سواروں کا سریہ بھیجا تاکہ وہ ابوجہل کی سرکردگی میں شام جانے والے قافلے کو روک سکے۔

۲۔ ۱۷ رمضان ۲ھ میں رسالت مآبؐ کی زیرِ قیادت صحابہ کبار کے لشکر نے میدانِ بدر میں مشرک سپاہ سے نبرد آزمائی کی۔ اس لشکر کا سب سے بڑا ہتھیار اللہ اور رسولؐ پر پختہ ایمان، ان کی سچی محبت اور نصرتِ الٰہی پر یقین کامل تھا۔ تعداد کی کمی، اسلحہ کی قلت اور مشرک فوج کی مادی برتری کے باوجود مسلمانوں نے فتح پائی اور کفار مکہ کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

۳۔ ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ کو رسول اکرمؐ اپنے ۱۰ ہزار مجاہدوں کی معیت میں مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور یہ سال عام الفتح (فتح کا سال) کہلایا۔

۴۔ ۸ رمضان ۹ھ کو آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام غزوۂ تبوک سے فتح و نصرت سے ہم کنار ہو کر مدینہ منورہ میں داخل



ہوئے۔ آپ نے اپنی اس جنگی نقل وحرکت سے رومی افواج کو مرعوب کردیا تھا، نیز جزیرۃ العرب کے شمال میں آباد قبائل میں اپنی دعوت بھی پھیلائی۔

۵۔ ۱۳رمضان المبارک ۱۵ھ کو امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ فلسطین تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے شام کا علاقہ فتح کرنے کے لیے مسلم افواج خوں ریز جنگیں کرچکی تھیں۔ بیت المقدس شہر کے نگران بطریق، یعنی مذہبی پیشوا نے شہر کی کنجی امیرالمومنین کے حوالے کی۔ آپ نے شہر میں داخل ہوکر باشندگانِ شہر کو جان و مال کی امان لکھ دی۔

۶۔ یکم رمضان ۲۰ھ کو امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے عہد ہی میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں مصر فتح ہوا۔

۷۔ ۲۳رمضان ۳۱ھ میں خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں مسلمانوں نے ساسانیوں (ایرانیوں) پر مکمل فتح پائی۔ اُن کا سپہ سالار اور بادشاہ یزدگرد ہلاک ہوا۔

۸۔ یکم رمضان المبارک ۹۱ھ کو نوجوان سردار، طریف بن مالک المبری نے تنگنائے ہرقل ..... جو بعد میں جبل الطارق کہلائی ..... عبور کی اور اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ اسپین کے ساحل پر اترا۔ اُن کا یہ عمل اُن عظیم جنگوں کی تمہید ثابت ہوا جو آئندہ برس طارق بن زیاد کی قیادت میں لڑی گئیں۔

۹۔ ۴رمضان ۹۲ھ کو مسلمانوں نے طارق بن زیاد کی کمان میں اسپین کا شہر القوط فتح کرلیا۔ اسپینی کمانڈر مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔

۱۰۔ ۱۰رمضان ۹۶ھ میں محمد بن قاسم راجا ہاتھیوں پر مشتمل راجا داہر کے بہت بڑے لشکر سے نبرد آزما ہوا۔ اس نے دشمن پر دریائے سندھ کے کنارے فتح پائی۔

۱۱۔ ۹رمضان ۲۱۲ھ کو مسلمان جزیرہ صقلی اطالوی جزیرے سسلی کے ساحل پر اترے اور اسلام پھیلانے کی خاطر وہاں کا اقتدار سنبھال لیا۔

۱۲۔ ۹رمضان ۴۷۹ھ کو مرابطیوں کے لشکر کے سپہ سالار یوسف بن تاشفین نے فونس ششم، شاہِ قشتالہ کی زیر کمان فرنگی فوجوں کو شکست فاش دی۔ فونس ششم اپنے لشکر کے صرف ۹ افراد سمیت جان بچانے میں کامیاب ہوا۔

۱۳۔ ۲۵رمضان ۵۸۴ھ کو صلاح الدین ایوبیؒ نے قلعہ صفد پر قبضہ کیا۔ اس میں موجود صلیبیوں کو باہر نکال دیا گیا۔ اس طرح سلطان نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے وجود سے پاک کرنے کی خاطر راستہ ہموار کردیا۔

۱۴۔ ۲۶ رمضان ۵۸۴ھ کو صلاح الدین ایوبیؒ نے معرکہ حطین میں صلیبیوں کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ ان کا سپہ سالار ارناط گرفتار ہوا۔ یہ معرکہ مشرق وسطی سے صلیبی وجود کے خاتمے کا آغاز ثابت ہوا۔

۱۵۔ ۱۰رمضان ۶۴۸ھ کو مصری ملکہ شجرۃ الدر (الملک الصالح کی اہلیہ) نے معرکہ المنصورہ میں فرانسیسی بادشاہ معروف لوئس نہم پر فتح پائی۔ لوئس نہم گرفتار ہوا اور اس کے لشکر کا بڑا حصہ مارا گیا۔ یہ ساتویں صلیبی جنگ تھی۔

۱۶۔ ۲۶رمضان ۶۵۸ھ کو مصری حکمران سیف الدین قطز اور بیبرس اوّل نے اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں سے لڑائی لڑی۔ انھیں فتح عظیم حاصل ہوئی، جب کہ تاتاریوں کو بہت بری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۷۔ ۹رمضان ۶۶۶ھ کو سپہ سالار بیبرس بندقداری نے شمال شام کا شہر انطاکیہ فتح کرلیا۔ صلیبیوں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ اس کے بعد علاقے میں صلیبیوں کے قدم کبھی نہ جم سکے۔

اہم واقعات

۱۔ رمضان ۲ھ میں عید الفطر سے دو دن پہلے فطرانہ فرض ہوا۔

۲۔ رمضان ۳ھ میں آنحضرت ﷺ نے اُم المساکین زینب بنت خزیمہ سے شادی کی۔ یہ ام المساکین کہلائی

کہلاتی ہیں۔

۳۔ رمضان ۶ھ میں قحط پڑا۔ آپ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی۔

۴۔ ۲۵ رمضان ۸ھ کو حضرت خالد بن ولید نے آنحضرتؐ کے حکم پر عزیٰ کا بت پاش پاش کردیا۔

۵۔ رمضان ۹ھ کو ثقیف کا وفد بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوا اور قبول اسلام کا اعلان کیا۔

۶۔ رمضان المبارک ۴۰ھ میں حضرت حسن بن علیؓ نے اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خلافت سنبھالی۔

۷۔ ۲۵ رمضان ۴۸ھ کو عقبہ بن نافع نے القیروان شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رومیوں اور صقلیوں کے حملوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کی محفوظ پناہ گاہ بن سکے۔

۸۔ ۹ رمضان ۹۲ھ کو موسیٰ بن نصیر نے اندلس پہنچنے کے لیے سمندر عبور کیا تاکہ وہ قریب سے قریب طارق بن زیاد کے لشکر سے مل سکے اور دونوں مل کر اندلس کی اسلامی فتوحات کو مکمل کرسکیں۔ اس ملک میں اسلام پھیلائیں اور صدیوں تک قائم رہنے والی تہذیب کی بنیاد رکھیں۔

۹۔ ۲۹ رمضان ۱۳۲ھ کو عباسی حکمران نے عبداللہ بن علی نے دمشق پر قبضہ کیا تاکہ وہ اموی سلطنت کے خاتمے اور ایک مضبوط اسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کرسکے۔

۱۰۔ ۱۵ رمضان ۱۳۸ھ کو اموی شہزادے عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس پہنچنے کے لیے سمندر عبور کیا تاکہ وہ وہاں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم کرے، جس میں مشرقی تہذیب کا جلال و جمال منعکس ہو۔

۱۱۔ رمضان ۳۶۱ھ میں فاطمی سپہ سالار، جوہر صقلی نے قاہرہ میں جامع الازہر کی عمارت مکمل کرائی۔

۱۲۔ ۱۸ رمضان ۴۸۳ھ کو مراکش کا سلطان یوسف بن تاشفین اندلس کے مسلمانوں کی پراگندہ جمعیت کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے وہاں موجود طوائف الملوکی کو ختم کردیا۔

۱۳۔ ۲۵ رمضان ۵۴۴ھ کو مشہور اسلامی فلسفی، مفسر اور عالم فخرالدین رازی پیدا ہوئے۔

۱۴۔ لیلۃ القدر رمضان المبارک ۱۰۳۸ھ میں عظیم اسلامی مورخ، احمد بن محمد المقری التلمسانی نے اپنی قابل فخر کتاب نفح الطیب مکمل کی۔

۱۵۔ ۲۷ رمضان ۱۳۶۶ھ (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اللہ کرے کہ یہ حقیقی معنوں میں اسلامی مملکت بنے اور قائم و دائم رہے۔

وفیات

۱۔ چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۲۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے منگل کی رات ۱۷ رمضان ۵۸ھ کو وفات پائی۔

۳۔ امام مجاہد، عبداللہ بن مبارک نے ماہ رمضان ۱۸۱ھ میں رومیوں کے مقابلے میں جہاد میں شرکت کے بعد، عراق میں دریائے فرات کے کنارے واقع شہر ہیت میں وفات پائی۔

۴۔ رمضان ۲۰۸ھ میں سیدہ نفیسہ بنت الحسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب نے وفات پائی۔ آپ کا مزار قاہرہ میں ہے۔

۵۔ رمضان ۳۱۶ھ میں شیخ مصر، ابوالحسن بنان الحمال الواسطی نے وفات پائی۔ آپ کے زہد و عبادات میں ضرب المثل سمجھے جاتے ہیں۔

۶۔ رمضان ۵۳۹ھ میں امیر المومنین یوسف بن تاشفین، سلطان المغرب اپنے رب سے جا ملے۔ معرکہ زلاقہ کی فتح کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

۷۔ ۱۳ رمضان ۵۹۷ھ کو متعدد کتب کے مصنف ابو الفرج بن الجوزی نے وفات پائی۔





رحم و کرم، بخشش و عطا اور

غم خواری و تعاون کا مہینا

اس مہینے صاحب استطاعت شخصیات دکھی انسانیت کی مدد کرنے سے جنت الفردوس میں اپنی جگہ پکی کرا سکتی ہیں

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی



آپ چند منٹ قبل افطار سے فارغ ہوئے ہیں۔ لذیذ کھانا کھا اور سخت پیاس کے بعد شیریں پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دو خوشیوں کا تذکرہ فرمایا ہے، ان میں ایک مسرت یہ ہے۔ فرمایا:

"روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت۔"

اس مبارک مہینے کے دوران خوشی کی تکمیل رمضان کی شاموں میں اکٹھے مل بیٹھنے سے ہوتی ہے۔ وجہ یہی کہ خاندان کے سارے افراد بیک وقت ایک دسترخوان پر عموماً رمضان شریف ہی میں اکٹھے ہو پاتے ہیں۔ اگر کسی خاندان کا کوئی بچہ غائب ہو جائے، تو اس کا رنج بھی جتنا رمضان میں محسوس ہوتا ہے، کسی اور وقت یا مہینے میں محسوس نہیں ہوتا۔

اے روزہ دارو! تم ان دنوں کی ہر شام یہ پاکیزہ لذت محسوس کرتے ہو جس سے تمھارے دل و دماغ خوشی و مسرت سے لبریز ہوں اور تم بے اختیار ہو کر خدا کی حمد کرتے، شکر بجا لاتے ہو اور اس مسرت و خوشی کو باقی رکھنے کے لیے دعا کرتے ہو..... مگر تمھارا کیا خیال ہے، یہ نعمتیں کیسے ہمیشہ باقی رہ سکتی ہیں؟

نعمتوں کا شکر صرف زبان سے ادا نہیں ہوتا بلکہ تمھیں ایسا ذریعہ اختیار کرنا چاہیے جس سے اس نعمت میں تمھارے وہ بھائی بھی شریک ہو جائیں جنھیں شرکت کرنے سے حالات نے روک رکھا ہے..... دنیا میں ایسے کئی غریب و محتاج ملتے ہیں جن سے دل و دولت والے زیادہ ذہین، باہمت، علم دان، دانش مند نہیں۔ لیکن زمانے کی گردشوں اور حکومت کی بے اعتنائیوں نے انھیں غم و اندوہ، فکر و پریشانی، بدحالی و بے کسی

کے شکنجے میں جکڑ دیا ہے، جن کے درد سے وہ کراہ اور بلبلا رہے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں، جن پر عام دنوں میں رحم و کرم، بخشش و عطا ضروری اور واجب ہے، تو ماہِ رمضان میں زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی رشتے ان کے ساتھ بھلائی کرنا ضروری قرار دیتے اور ان کے آنسو اور مصائب دور کرنا لازم بتاتے ہیں، تو مسلمان پر ان کے ساتھ نیکی کرنا زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اسے ان کی خوشحالی کی فکر اور ان کے ساتھ غم خواری کرنے میں مسرت اور سعادت محسوس کرنی چاہیے۔

کیا آپ نہیں جانتے کہ اس طرح کے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں؟ تم انھیں وہ پیشہ ور نہ خیال کرو جو تمھارے دروازے کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے اور سڑکوں اور گلیوں میں بااصرار تمھیں روک کر تنگ کرتے ہیں۔ بے کس محتاج وہ باپ ہیں جو اپنی کمائی سے اتنا بھی حاصل کر پاتے جس سے بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ وہ عورتیں ہیں جو اپنے شوہر و مددگار سے محروم ہو چکی ہیں۔ جن کی غیرت نے انھیں گھر گھر اور در در دستِ سوال دراز کرنے یا دکان و کارخانے میں محنت و مزدوری کرنے سے باز رکھا ہے۔

وہ بچے ہیں جن کے ماں باپ کو موت نے جدا کر دیا اور اب وہ بے یار و مددگار ہو چکے، وہ پناہ گزین اور پردیسی ہیں جن کو کسی زبردست ظالم، بے ہنگم سیاست، کمزور دل ارادہ اور کھلی خیانت اور بدعہدی نے بے گھر کر دیا، اور وہ غربت و ذلت کا شکار ہو گئے، آسمان ان کی چھت اور زمین فرش بن چکی، اب وہ ہم سے بھیک طلب کر رہے ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں لیکن ہم انھیں ذلت و خواری کی زندگی میں تڑپا رہے ہیں۔

یہی لوگ ہیں جنھیں نعمت خداوندی ان دنوں میں یاد کرانا چاہتی ہے۔ میں تمھیں ان پر صدقہ و خیرات کرنے کے لیے نہیں کہتا اور نہ سخاوت کرنے کو کیونکہ یہ عرفِ عام میں احسان کی قسمیں ہیں..... لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ انھیں اخوت کی لذت، دینی تعلق، نسبی رشتہ، اور پڑوس کی نعمت کا احساس دلا کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔ یہ لوگ بدحالی و پریشانی کی اس حد کو نہ پہنچتے اگر تمھاری کوتاہی اور سوسائٹی کی بے اعتنائی نہیں ہوتی۔

اگر یہ لوگ تمام دنوں میں زندگی کی تلخی اور محرومیت کی چبھن محسوس کرتے ہیں، تو رمضان میں انھیں اس کا کہیں زیادہ احساس ہوگا۔ اے لوگو! یہ تمھارے پڑوسی ہیں، کوئی شخص ایسا نہیں، جس کے محلے میں ایک یا کئی خاندان اس طرح کے بے کس، بدحال نہ ہوں۔ آپ ان کے دکھ درد کا اندازہ کیجیے، جس وقت آپ اپنے ہاتھوں میں مختلف ترکاریاں، پھل، میوہ جات اور مٹھائیاں لے کر اپنے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔

ہر شام کو آپ کے گھروں سے لذیذ کھانوں کی خوشبو میں اڑ کر فضا میں پھیل جاتی ہیں۔ انھیں تمھارے بچے سیر ہو کر سڑکوں اور گلیوں میں اٹکھیلیاں کرتے اور خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر باپ کے سینے سے آہ و حسرت نکلتی ہے، ماں کی پلکوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور بچہ بھوک سے گریہ وزاری کرتا ہے۔ تم ہر روز خوش حالی میں افطار اور وہ لوگ بدحالی میں شام کرتے ہیں۔

عبرت انگیز واقعہ

ایک باپ بڑا دولت مند اور مالدار تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اچھے کھانے اور اچھی پوشاک کا عادی بنا دیا۔ کچھ دنوں بعد اس کی قسمت کا ستارہ غروب ہوا اور وہ تنگدست و بدحال ہو گیا۔ ماہِ رمضان آیا۔ اس کے پاس اخراجات کے ذرائع نہیں تھے اور وہ اپنی خودداری اور شرم کی وجہ سے کسی سے صدقہ یا قرض نہیں طلب کرتا تھا..... چناں چہ اپنے گھرانے کے افطار کے لیے وہ زیتون، نمک اور روٹی سے زیادہ اور کچھ مہیا نہیں کر سکا۔

اس کے بچوں نے پہلے اور دوسرے دن صبر و قناعت کر لی مگر تیسرے دن سب سے چھوٹے بچے نے کہا: ابا جان

زیتون نے ہمارے پیٹ میں سوزش پیدا کر دی ہے۔ ہم روزے سے ہیں، اس شدید گرمی میں ہمیں ایسی چیز چاہیے جو پیٹ میں ٹھنڈک اور رگوں میں تری پیدا کر سکے۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے کھانوں کی تیز خوشبوؤں سے بے ہوش ہوئے جا رہے ہیں۔ آپ ہمارے کھانے کا انتظام اس طرح کیوں نہیں کرتے جیسا ہمارا پڑوسی اپنے بچوں کے لیے کرتا ہے یا جیسا آپ خود پہلے ہمیں کھلایا کرتے تھے؟"

بچے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ باپ نے یہ سن کر گھر کے ایک تاریک گوشے میں جا خود بھی آنسو بہانے۔ اس نے یہ بتانا چاہا کہ کم سنی میں بچوں کے دل ودماغ سوسائٹی کی بے وفائی اور سنگدل لوگوں کے ظلم سے آشنا ہوں۔

اے دولت مند روزہ دارو! تم ہر شام اپنے دسترخوانوں کو انواع واقسام کے کھانوں اور میووں سے آراستہ کرتے ہو جس کی تھوڑی مقدار بھوکوں کا پیٹ اور مصیبت زدوں کا حال درست اور کسی دکھیا، لاچار عورت کے آنسو روک سکتی ہے۔ کیا تم نے کبھی اپنے گردوپیش کے غریب پڑوسیوں اور عزیزوں کے بارے میں سوچا؟ کیا تم نے کبھی غور کیا کہ کسی ایک قسم کے کھانے سے بے نیاز ہو جاؤ، تاکہ اس سے کوئی بیچارہ اپنا افطار کر سکے، جس کی بے کسی اور رنج وغم کو اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

اگر ہر صاحب استطاعت محتاج روزے دار کو کھانا کھلا دے۔ اگر دولت مند کسی غریب، تنگدست گھرانے کی امداد کر ڈالے، تو اسلامی معاشرے میں کوئی لاچار و بے کس ومحتاج باقی نہ رہے۔ یوں ماہ رمضان خیر و بھلائی کا گہوارہ بن جائے گا، جس کی خوبیاں اور برکتیں ختم نہ ہوں۔ ہم تو بہترین امت ہیں جو لوگوں پر ظاہر کی گئی۔ پس اے روزے دارو! اپنے پڑوسیوں کی دیکھ بھال کرو۔ اپنے عزیزوں اور بھائیوں کا خیال رکھو، خبردار! انھیں اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں میں شریک کرنے سے غفلت نہ برتنا۔

حال سے بدگمان نہ ہو

ایک شخص نے ایک پارسا سے سوال کیا کہ آپ فلاں عابد کے بارے میں کیا کہتے ہیں جب کہ کئی لوگ تو اس کے بارے میں طعنہ زنی کرتے رہتے ہیں؟ اس بزرگ نے کہا کہ مجھے تو اس میں کوئی عیب یا غلطی نظر نہیں آتی ہے لیکن میں اس کے باطن سے واقف نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جب تو کسی کے ظاہر کو پارسا آدمی کی شکل دیکھے، تو اسے پارسا ہی جان لو اور اس کے لیے نیک مرد ہونا کہو۔ اگر تجھے اس کے باطن کا کوئی علم نہ ہو، تو اس کی کرید نہ کر۔ کوتوال کو تو کسی کے گھر کے اندر سے کیا تعلق ہوتا ہے؟

درسِ حیات:

۱۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے..... دوسرے کی کرید اچھی عادت نہیں۔

۲۔ کسی کے ظاہر کو اچھا دیکھ کر بدگمان نہ ہو بلکہ اسے اچھا ہی خیال کریں۔

۳۔ کسی کے باطن کا حال سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ)

اے روزے دارو! جس وقت تم اپنی بیویوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھو، تو بھوکوں کی بھوک، دکھی لوگوں کی آہ وزاری اور بے کسوں کے آنسو یاد کر لیا کرو۔ یاد رکھو، اللہ تعالیٰ ہرگز تمھارے روزوں اور اپنی اطاعت وعبادت کو قبول نہیں کرے گا، اگر تمھارے اردگرد بھوکے پیٹ والے ہیں جنھیں تم بھر سکتے ہو، پریشان حال نفوس ہیں جن کو تم مطمئن کر اور خوشحال بنا سکتے ہو۔ یاد کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھ پر وہ ایمان ہی نہیں لایا جس نے آسودہ ہو کر رات گزاری اور بغل میں پڑوسی بھوکا رہا اور اس کا اسے علم ہو۔"

ماہِ صیام میں رسول اکرمؐ کا معمول

مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ

سیرتِ نبویؐ پر دل و جاں سے عمل کرکے
اپنی دنیا و آخرت، دونوں سنوار لیجیے

ڈاکٹر محمد جنید ندوی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ یہ تھی کہ جب تک چاند نظر آنے کی تحقیق نہ ہو جاتی یا کوئی عینی گواہ نہ مل جاتا، روزہ شروع نہیں فرماتے۔ اگر آسمان پر ابر وغیرہ ہونے سے چاند دکھائی نہ دیتا اور کہیں سے شہادت بھی نہ ملتی، تو شعبان کے تیس دن پورے کرتے۔ یہی صورت رمضان المبارک کے آخری افطار کی تھی۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تک چاند دیکھ نہ لو روزہ نہ رکھو۔ (اسی طرح) جب تک چاند نظر نہ آجائے افطار نہ کرو اور اگر بادل چھا جائیں، تو مہینے کی مدت پوری کرو۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ روزہ رکھنے کے سلسلے میں صرف ایک مسلمان کی گواہی کافی سمجھتے۔ جبکہ ماہِ رمضان کے اختتام کے لیے دو مسلمانوں کی گواہی طلب فرماتے۔

سحری میں برکت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سحری ضرور کھاتے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔'' (بخاری و مسلم)

ایک اور موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزہ کے درمیان فرق کرنے والی چیز سحری ہے۔'' (مسلم)

افطار میں جلدی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افطار میں جلدی فرماتے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث قدسی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزہ کے بعد افطار میں جلدی کرے۔'' (ترمذی) حضرت سہل بن



سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جب تک میری امت کے لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں، اچھے حال میں رہیں گے۔" (بخاری و مسلم)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کھجور یا پانی سے روزہ افطار فرماتے۔ (مسند احمد، ابی داؤد، ابن ماجہ اور مسند دارمی) افطار کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے: اللھم انی لک صمت وعلی رزقک افطرت "اے اللہ میں نے تیرے ہی واسطے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا۔" (ابوداؤد)

عبادت الٰہی میں مشغولیت

رمضان کا مہینا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے زیادہ خوشیوں بھرا ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب رمضان کا مہینا قریب آ جاتا، تو کمر ہمت کس لیتے اور اہل ایمان کو بھی اس کا شایان شان استقبال کرنے کو کہتے۔ ایک مرتبہ شعبان کی آخری تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! ایک عظیم اور بابرکت مہینا تم پر سایہ فگن ہونے کو ہے۔ وہ مہینا جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ جس میں روزہ رکھنا فرض ہے اور جس کی راتوں میں تراویح پڑھنا افضل ہے۔ جو شخص اس مہینے میں بہ رضا و رغبت نیکی کا کام کرے، اس کا ثواب عام مہینوں میں فرض کی ادائیگی کے برابر ملے گا اور جو اس ماہ مقدس میں فرض ادا کرے، اسے ستر فرضوں کے برابر ثواب عنایت ہوگا۔ رمضان کا مہینا صبر کا مہینا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ مہینا معاشرے کے غریب اور حاجت مندوں کے ساتھ مالی ہمدردی کا مہینا ہے۔" (مشکوٰۃ)

قرآن پاک کی تلاوت

رمضان المبارک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات قرآن میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرتے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں قرآن سناتے۔ اس طرح پورے قرآن کا دور مکمل ہو جاتا۔

ابوداؤد کی روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کا وقت نماز عشا کے بعد ہوتا۔ روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی یا اس تعداد کے موافق تلاوت کر لیا کرتے۔ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر سورت یا چند آیات کی تلاوت کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں:

"ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوئے۔ رات کے سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں: الی آخر الآیۃ (آل عمران: آیت نمبر ۱۹۱۔۱۹۰)

زندہ یا مردہ

سکتے کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے قریب آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو، تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا امتحان لینا ہو، تو اسے رمضان کے زمانے میں دیکھو۔ اگر اس مہینے میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوف خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا ابھار نظر آئے، تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور اگر نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں اور جسم مردہ نظر آئے، تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس "مسلمان" کے لیے مقدر نہیں۔

(اخذ و ترتیب: صلاح الدین کاشمیری)

ترجمہ: ''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔''

دعا اور مناجات

رمضان المبارک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و مناجات میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ گھر کے سب افراد جب سو جاتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور مناجات الٰہی میں مشغول رہتے۔ سنن نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں:

''ایک رات میری آنکھ کھلی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولا، تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سربسجود دعا میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا: ''سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس عالم میں۔''

کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا قبرستان تشریف لے جاتے اور دعا وزاری فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں، تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں داخل ہو کر دعا مانگ رہے ہیں۔ (نسائی)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی فرماتے: ''یا اللہ تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین جو کچھ ان میں ہے، سب کا پروردگار ہے، تو حق ہے۔ تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے، جنت حق ہے، قیامت حق ہے۔ یا اللہ میں نے تیرے ہی آستانے پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسا کیا، تیرے ہی زور پر جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا کھلا اور چھپا ہر گناہ معاف فرما۔ تو ہی میرا معبود ہے۔ تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔'' (مسلم)

دعا اور نماز کے بعد آپ سو جاتے۔ دفعتہً سپیدۂ سحر نمودار ہوتا۔ آپ بیدار ہوتے۔ صبح کی سنت ادا کر کے مسجد تشریف لے جاتے۔ اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے: ''اے اللہ میرے دل میں نور پیدا کر، میری زبان اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں نور پیدا کر، میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر، میرے اوپر اور نیچے نور پیدا کر اور مجھے نور عطا فرما۔'' (مسلم)

نماز تراویح کی ترغیب

تراویح جمع ہے ''ترویحہ'' کی جس کا مطلب ہے آرام کرنے کے لیے تھوڑی دیر بیٹھنا۔ چار رکعتوں کے بعد آرام کرتے ہیں، اس لیے اس کا نام تراویح ہو گیا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کی راتوں میں طویل قیام فرماتے تھے۔ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز پڑھی۔ لوگوں نے دیکھا، تو وہ بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ دوسری اور تیسری رات بھی یہی ہوا۔ چوتھی رات آئی تو اس قدر لوگ اکٹھے ہو گئے کہ مسجد میں ان کا سمانا مشکل ہو گیا۔

اس رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے ہی نہ نکلے اور لوگ بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اگلے روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم لوگوں کے انتظار کا علم تھا لیکن میں اس لیے نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم لوگوں پر فرض نہ ہو جائے اور پھر تم اسے ادا نہ کر سکو۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں قیام الیل کی ترغیب دیتے۔ اس کے بعد مسلمان الگ الگ تراویح پڑھتے رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں باجماعت تراویح پڑھنے کا اہتمام کیا جو آج تک اسلامی معاشروں میں چلا آرہا ہے۔

دن کے معمولات

رمضان المبارک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ روزوں کے فضائل و برکات اور ان کا اجر و ثواب بیان فرماتے، روزوں کی روح کو اپنانے کی دعوت دیتے اور ان کاموں سے بچنے کی تلقین فرماتے جن سے بھوک، پیاس اور راتوں کو جاگنے کی محنت و مشقت بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ روزوں کا اجر و ثواب ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''جس شخص نے ایمانی کیفیت کے ساتھ اور اجر آخرت کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور راتوں کو قیام کیا، اللہ اس کے ان گناہوں کو معاف کردے گا جو پہلے سرزد ہوچکے۔'' (صحیح بخاری)

ایک مرتبہ روزے کی فضیلت یوں بیان فرمائی: ''روزہ اور قرآن مومن کے لیے سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا: ''اے میرے رب! میں نے اس شخص کو دن میں کھانے اور دوسری لذتوں سے روکا تو یہ رکا رہا، اس شخص کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔'' قرآن کہے گا: ''میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکا، اے میرے رب! اس شخص کے حق میں میری سفارش قبول کر۔'' چناں چہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی سفارش قبول فرمائے گا۔'' (رواہ احمد)

آخری عشرہ

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں عام دنوں کے مقابلے میں عبادت و ذکر میں بے پناہ مشغول رہتے۔ آخری عشرہ شروع ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے، تمام راتیں بیدار رہتے، ازواج مطہراتؓ سے بے تعلق ہو جاتے، اہل خانہ کو بھی نماز کے لیے جگاتے، یاد الٰہی اور عبادت میں مشغول رہتے۔

(بحوالہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد)

اعتکاف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں عموماً اعتکاف فرمایا کرتے۔ وصال کے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کے بجائے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک خیمہ لگا دیا جاتا جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پھر ہر طرح سے یکسو اور سب سے منقطع ہو

سزا سے ڈر

ایک بادشاہ نے ایک بے گناہ قیدی کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ جب قیدی نے یہ سنا، تو بادشاہ سلامت سے کہنے لگا کہ اے بادشاہ اس غصے کا سبب جو آپ کو مجھ پر آیا ہے، اس کا ستم اپنے حال پر نہ لیں۔ آپ کی طرف سے دی گئی سزا، تو میرے حال پر ایک سانس لینے کے وقت میں گزر جائے گی اور میں ختم ہو جاؤں گا۔ لیکن یاد رکھیں اس سزا کا گناہ آپ کی ساری زندگی قائم رہے گا۔ یہ غور سے سن لیں کہ انسانی زندگی کا وقت جنگل کی ہوا کی طرح گزر جاتا ہے جس میں اسے رنج و غم ملتے ہیں اور اس پر برا اور اچھا وقت بیت جاتا ہے۔ اے ظالم اس بات کو غور سے سن کہ جو ظلم اور زیادتی تم نے مجھ پر کی اس کا وبال تمھاری گردن پر رہے گا۔

بادشاہ سلامت نے قیدی کی یہ باتیں غور سے سن لیں۔ ان باتوں کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے قیدی کا سر اڑانے کی سزا معاف کردی۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ، انتخاب: سعید نذیر، لاہور)

کر ہر وقت یاد الٰہی اور عبادت گزاری میں مشغول رہتے۔
(صحیح بخاری، مسلم)

لیلۃ القدر

لیلۃ القدر کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''رمضان المبارک کے مہینے میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ بس محروم ہی رہ گیا اور اس بھلائی سے وہی محروم رہتا ہے جو کامل محروم ہو۔''

(رواہ ابن ماجہ)

ایک بار حضرت عائشہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شب قدر کو تلاش کرو، رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔'' (صحیح بخاری)۔ بعض صحابہ کرام کے خیال میں یہ ستائیسویں کی رات ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر میں شب قدر پاؤں تو اللہ سے کیا عرض کروں اور کیا دعا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ پڑھو: اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی۔ ترجمہ: ''اے میرے اللہ! تو بہت معاف فرمانے والا ہے اور بڑا کرم فرما اور معاف کرنا تجھے پسند ہے، پس تو میری خطائیں معاف فرما دے۔''

فیاضی کی حد نہ رہتی

حضرت ابن عباس بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرائیل علیہ السلام قرآن سنانے آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی۔

(صحیح بخاری)

شیخ احمد سرہندی نے کہا

☆ مومن ہو یا کافر، کسی کی دل آزاری نہ کر، اس لیے کہ کفر کے بعد یہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ مغروروں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا صدقہ ہے۔

☆ کلام کی آفت طوالت اور کام کی آفت فراغت ہے۔

☆ حادثات دنیا کی تلخی کڑوی دوا کی مثل ہے۔

(انتخاب: حسنین شبیر، قصور)

صدقۂ فطر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید کے لیے جانے سے پہلے خود بھی صدقہ فطر ادا کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام و آزاد، ہر مرد و عورت اور چھوٹے بڑے پر صدقہ فطر لازم کیا ہے۔ اس کی مقدار گندم کا آدھا صاع جبکہ جو، کھجور، کشمش اور پنیر کا ایک صاع (جب کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گندم سمیت ہر جنس کا ایک صاع) ہے۔ صدقہ فطر نماز عید کے لیے جانے سے پہلے تک ادا کیا جانا ضروری ہے۔

(بحوالہ صحیح بخاری، مسلم)

سفر میں روزہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سفر میں روزے رکھتے اور کبھی ترک کر دیتے تاکہ امتی اپنے حالات کے مطابق جس طریقے پر چاہیں عمل کر سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دوران سفر ضروری کاموں کی ادائیگی میں دقت نہ ہو تو روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو روزہ چھوڑ دینا بہتر ہے۔

مسواک

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں مسواک کیا کرتے تھے اور ہر وقت مسواک استعمال کرتے تھے۔ ◆◆◆

رمضان... مسلمان کی صحت کا ضامن

اس ماہ مبارک میں صحیح روزے رکھ کر تمام بیماریوں سے
چھٹکارا پایئے اور تندرستی کی دولت سے مالا مال ہو جایئے

سید عاصم محمود

دین اسلام کا اہم ترین مہینا

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ“ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۳) یہ فرمان الٰہی انتہائی حکمت رکھتا ہے۔ اس آسمانی حکم میں یہ روحانی بصیرت مضمر ہے کہ روزے رکھ کر انسان اخلاقی طور پر طاقتور بن جاتا ہے اور گناہوں کا بآسانی نشانہ نہیں بنتا۔ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان زیادہ کھانے لگے، تو وہ جسمانی و ذہنی دونوں لحاظ سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ تب اس میں سوچنے سمجھنے کی تمیز کم ہو جاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ وہ طمع اور ہوس کا بآسانی نشانہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے بڑے بوڑھے ہمیں جینے والوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ کم کھاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پہ روزے اسی واسطے فرض کیے کہ وہ دوران رمضان ایک ماہ نہ صرف کم کھائیں، بلکہ زیادہ کھانے سے جنم لینے والی قباحتوں سے بھی چھٹکارا پائیں۔ انسان جب موٹاپے سے پیچھا چھڑا لے، تو قدرتاً چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ تب وہ نیکی و بدی میں بآسانی تمیز کر لیتا ہے اور لالچ اس پہ حاوی نہیں ہو پاتا۔ اسی روحانی و ذہنی کیفیت کا نام پرہیزگاری اور تقویٰ ہے۔

گویا حقیقت یہ ہے کہ رمضان ہماری ذہنی و جسمانی توانائی بحال کرنے والا نہایت بیش قیمت آسمانی تحفہ ہے۔ جو مسلمان خصوصاً دینی و طبی ہدایات کے مطابق روزے رکھے، وہ ایک ماہ بعد تندرست اور طبی و اخلاقی لحاظ سے بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی و جسمانی انقلاب



کیونکر جنم لیتا ہے؟

روزے کی سائنس

ہمارا جسم ۳۷ کھرب خلیوں روزے کی سائنس کا مجموعہ ہے۔ انہی خلیوں کے ذریعے ہمارے متفرق سادہ و پیچیدہ عضو وجود میں آتے ہیں۔ ان خلیوں کو توانائی درکار ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے کام بااحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ ہم غذا کھا کر انہیں یہ توانائی فراہم کرتے ہیں۔

جب غذا ہمارے نظام ہضم میں پہنچے تو وہاں پائے جانے والے متعلقہ تیزاب اور جراثیم اسے ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد غذا کے لحاظ سے ہمارا جسم اسے توانائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں ہمیں گلوکوز، چکنائی والی چربی اور گوشت پروٹین فراہم کرتا ہے۔ گلوکوز (یا سادہ شکر) چکنائی اور پروٹین..... یہ تینوں توانائی کی بنیادی اقسام ہیں۔

ہمارے بدن کو سب سے زیادہ گلوکوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ دماغ کو اپنے کام کرنے کی خاطر یہی توانائی درکار ہے۔ اسی لیے ہمارا جسم گلائکوجن کی صورت میں گلوکوز کی خاصی مقدار جگر اور عضلات میں ذخیرہ بھی کر لیتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت گلائکوجن کو گلوکوز میں بدلا جا سکے۔

جب ہم روزے کی حالت میں کھانا پینا بند کر دیں، تو ہمارا جسم سب سے پہلے جگر اور عضلات میں ذخیرہ شدہ گلوکوز (گلائکوجن) ہی کو استعمال کرتا ہے۔ جب یہ ذخیرہ ختم ہو جائے، تو پھر جسم چربی کی سمت تکنے لگتا ہے۔

جب ہم چکنائی والی اشیا زیادہ کھائیں، تو ہمارا جسم ان سے اخذ کردہ چربی پیٹ اور کولھوں پہ ذخیرہ کر لیتا ہے۔ اسی ذخیرے کے باعث ہمارا پیٹ لٹکتا ہے اور ہم فربہ ہو جاتے ہیں۔ جسم میں چربی کی زیادتی ہونا خطرناک ہے۔ یوں ہم امراض قلب اور دیگر بیماریوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

اسی لیے روزے کی حالت میں ہمارا بدن چربی بطور ایندھن استعمال کرنے لگے تو یہ اچھی بات ہے۔ یوں انسان چربی سے نجات پا کر تندرست ہونے لگتا ہے۔ جب چربی کا ذخیرہ ختم ہو، تو پھر انسانی جسم پروٹین کے ذخیرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مگر یہ خطرے کی نشانی ہے۔

وجہ یہ کہ غذا سے اخذ شدہ پروٹین ہمارے عضلات میں جمع ہوتا ہے۔ جب ہمارا بدن پروٹین بطور ایندھن خرچ کرنے لگے، تو جلد ہمیں جسمانی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اور ہم دبلے ہونے لگتے ہیں۔ یہ کمزوری کچھ عرصہ برقرار رہے، تو انسان مر بھی سکتا ہے۔

لیکن ماہ صیام میں حصول ایندھن کے درج بالا تیسرے مرحلے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وجہ یہی کہ سحری اور افطار کے وقت انسان مختلف غذاؤں سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ چناں چہ دوران روزہ ہمارا جسم پہلے گلوکوز استعمال کرتا ہے۔ پھر چربی کی باری آتی ہے۔ لیکن دو کھانے درمیان میں آ جانے کے باعث انسان تیسرے اور خطرناک مرحلے سے بچ نکلتا ہے۔

چربی بطور ایندھن جلنے سے ہمیں کئی طبی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

- ذیابیطس کو قابو کرنا آسان ہو جاتا ہے۔
- ہائی بلڈ پریشر (بلند فشار خون) کم ہوتا ہے۔
- طویل المعیاد لحاظ سے خون میں کولیسٹرول کی سطح کم ہوتی ہے۔

رمضان کی غذائیں

ماہ مبارک میں متوازن غذا کھانا اور جسم تر رکھنا ضروری ہے۔ روزوں میں بھوکا رہنے سے صحت بہتر ہوتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ معیاری غذا تناول کی جائے۔ اگر غیر معیاری غذائیں کھانے سے منفی نتیجہ نکلتا ہے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ افطار و سحر میں سادہ کھانا کھائیے اور سبزیوں، دہی، پھلوں اور خشک

کا خاص اہتمام نہ کیجیے۔

سحری میں معقول مقدار میں کھانا کھائیے جو آپ کو کئی گھنٹے توانائی مہیا کر سکے۔ تب ایسی غذا تناول کرنا سودمند ہے جو جسم میں پہنچ کر رفتہ رفتہ توانائی خارج کرے۔ مثلاً روٹی، دلیا اور دیگر اناج۔ بہتر یہ ہے کہ چپاتی کے ساتھ انڈا کھائیے اور پھر چائے پی لیجیے۔

افطار میں سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے کھجوریں کھانا مفید ہے۔ یہ پھل ہمیں فوری توانائی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح چھوارے کا رس ہمیں توانائی دیتا ہے۔

افطار و سحری کے وقت "اچھے" (Good) نشاستے (کاربوہائیڈریٹ) کھائیے۔ یہی نشاستے والی غذائیں ہمیں بیشتر توانائی فراہم کرتی ہیں۔ ان میں گندم، جو، پھلیاں، دالیں، چاول وغیرہ شامل ہیں۔

یہ یاد رہے کہ دوران روزہ برا نشاستے والی غذائیں کم سے کم استعمال کیجیے۔ ان میں چینی اور اس سے بنی تمام اشیا مثلاً کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ شامل ہیں۔ نشاستے والی غذائیں مثلاً مٹھائی اور تیل یا گھی میں تلی چیزیں بھی کم ہی کھائیے۔ اور کوشش کیجیے کہ افطار میں کولا ڈرنکس کے بجائے سادہ پانی یا قدرتی خوراک سے بنا شربت پیجیے۔

ماہ رمضان کی بیماریاں

رمضان میں کھانے کا نظام الاوقات تبدیل ہونے سے اکثر لوگوں کو بعض بیماریاں چمٹ جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم "سینے کی جلن" (Heartburn) ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ یہ جلن سینے نہیں ہماری آنتوں میں جنم لیتی ہے۔ ہمارا نظام ہضم انہی چھوٹی بڑی آنتوں پر مشتمل ہے۔

نظام ہضم میں کئی اقسام کے تیزاب پائے جاتے ہیں تاکہ وہ غذا اچھی طرح ہضم کر سکیں۔ یہی تیزاب مضر صحت جراثیم بھی مار ڈالتے ہیں۔ دوران رمضان سحری اور افطار کے درمیان طویل وقفے کی وجہ سے نظام ہضم یا تیزابوں کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔

لیکن جب بھی ہم تصور میں خود کو چکن چرغہ یا مٹن بریانی کھاتا دیکھیں، یا باورچی خانے سے آنے والی خوشبوئیں ہماری ناک تک پہنچ جائیں، تو ہمارا دماغ نظام ہضم کو مزید تیزاب بنانے کا حکم دیتا ہے۔ تیزابوں کی یہی زیادتی سینے کی جلن نامی تکلیف پیدا کرتی ہے۔

سینے کی جلن سے بچنے کے لیے مسالا دار کھانے کم کھائیے۔ تیل میں تلی چیزیں بھی کم لیجیے۔ کیفین (چائے، کافی) زیادہ نہ لیں۔ مزید برآں سوتے وقت دو تکیے سر کے نیچے رکھ کر سویا جائے تب بھی اس طبی خلل سے نجات ملتی ہے۔



ذیابیطس کے مریضوں کو بھی روزے رکھتے ہوئے مشکلات پیش آتی ہیں۔ جو مریض انسولین کے انجکشن لیں، ڈاکٹر انہیں روزہ نہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ جبکہ ادویہ کے ذریعے شکر کنٹرول کرنے والے خواتین و حضرات کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ روزہ رکھنے سے قبل ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

اگر ذیابیطس کا کوئی مریض روزہ رکھے تو ضروری ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً خون میں شکر کی سطح چیک کرتا رہے۔ وجہ یہ کہ سطح کم ہونے سے مریض غشی، انتشار اور گھبراہٹ کا نشانہ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں ضروری ہے کہ کوئی میٹھی شے نوش کریں یا کھا لیں۔

دورانِ رمضان کئی مرد و زن کو سر درد ہوتا ہے۔ یہ طبی خلل کئی وجوہ کی بنا پر جنم لیتا ہے۔ مثال کے طور پر پیاس لگنا، شدید بھوک، نیند یا آرام کی کمی اور چائے، کافی اور تمباکو کا نہ ملنا۔

سر درد سے بچنے کی خاطر سحری اور افطار میں متوازن غذا کھائیے۔ نیز پانی کثیر مقدار میں پیجیے۔ اگر ضرورت ہو تو پیراسٹامول استعمال کیجیے۔ (گولی افطاری کے بعد کھائیے)۔ مالش کرنے اور دھوپ سے بچ کر بھی سر درد دور کرنا ممکن ہے۔

روزے رکھتے ہوئے جسم میں پانی کی کمی (Dehydration) جنم لینا بھی عام ہے۔ وجہ یہ کہ پیشاب اور پسینے کے باعث جسم سے کثیر مقدار میں پانی اور نمکیات نکل جاتے ہیں۔ اور کوئی شخص محنت کرنے والا کام کرے، تو بدن میں پانی کی زیادہ کمی کا نشانہ بنتا ہے۔

یاد رہے، جسم میں پانی و نمکیات کی کمی سے انسان سستی محسوس کرتا ہے۔ عضلات میں اینٹھن ہوتی ہے۔ مزاج قابو میں نہیں رہتا اور نقاہت زیادہ بڑھ جائے تو انسان بے ہوش بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں روزہ سوچ سمجھ کر رکھیے۔

جب کوئی انسان دمے یا بلند فشارِ خون (ہائی بلڈ پریشر) میں مبتلا ہو، تو یہ امراض قابو میں رکھنے کی خاطر اُسے ساری عمر ادویہ کھانا پڑتی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں بیماریوں کے مریض روزہ رکھنے سے قبل ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کر لیں۔

رمضان کے دوران قبض سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا اس موذی بیماری سے بچنے کے لیے دورانِ رمضان پھل اور سبزیاں بکثرت کھائیے۔ ان کی وجہ سے آنتوں میں حرکت رہتی ہے اور فضلہ پھنسنے نہیں پاتا۔ قبض سے بچاؤ کی خاطر ریشے دار (Fibre) غذائیں زیادہ کھائیے اور تلی و چکنی غذاؤں سے پرہیز کیجیے۔

دورانِ رمضان معمولات میں تبدیلی سے انسان عموماً ذہنی و جسمانی دباؤ میں آ جاتا ہے۔ تاہم انسان بعض طریقے اپنا کر یہ دباؤ قابو کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دن میں سو کر اپنی نیند پوری کیجیے۔ کھیل کھیلنے سے اجتناب کریں۔ دھوپ میں ورزش نہ کیجیے اور اپنے غصے پر قابو پائیے۔

ماہِ صیام میں ایک بڑا مسئلہ موٹاپا بھی ہے۔ جی ہاں، اگر ہم سحری و افطار میں پیٹ بھر کر کھائیں اور پھر کوئی کام کاج نہ کریں، تو ہمارا وزن بڑھ جاتا ہے۔ ایک وجہ دونوں اوقات میں غلط قسم کی غذائیں کھانا بھی ہے۔ اگر غذا کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے، تو رمضان میں وزن کم کرنا ممکن ہے۔

عمدہ متبادل غذائیں

☆ تلی ہوئی چیزوں مثلاً پکوڑوں کے بجائے چنوں کی چاٹ بنائیے۔ یا پھر دہی میں آلو ڈال لیجیے۔

☆ کباب بھی تیل میں تل کر نہ کھائیے بلکہ گرل میں بھون لیں۔

☆ کھیر، گلاب جامن، رس ملائی، برفی، کیک وغیرہ کم سے کم استعمال کیجیے۔

ماضی میں دیسی گھی، سرسوں یا زیتون کے تیل میں کھانے پکتے تھے۔ یہ کھانے لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ غذائیت بخش ہوتے۔ مگر اب کھانا پکانے کے تیل میں پکتے ہیں جو زیادہ [illegible] ہوتا ہے۔ اسی لیے بہتر ہے کہ کھانوں کی تیاری میں تیل کم سے کم استعمال کیجیے۔

روزے رکھنے کے دس فوائد

جدید طبی سائنس دریافت کر چکی کہ انسان اگر وقتاً فوقتاً خود کو بھوکا رکھے، تو اس کی صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مگر دینِ اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ ایک ماہ دن میں روزے رکھو اور کھانے پینے سے دور رہو۔ یہ فرمان کئی طبی اور روحانی حکمتیں رکھتا ہے جن کا بیان درج ذیل ہے۔

۱۔ روزہ رکھنے سے نظامِ استحالہ (Metabolism) بہتر

جب ہم کوئی غذا کھائیں، تو ہمارے نظامِ ہضم میں پائے جانے والے خصوصی سالمے، خامرے (انزائمز) اُسے پیس دیتے ہیں۔ یہی خامرے پروٹین کو امائنو ترشوں (یا تیزابوں)، چکنائی کو چکنے ترشوں (Fatty acids) اور نشاستہ کو شکر میں بدلتے ہیں۔ یہی عمل اصطلاح میں "استحالہ" کہلاتا ہے اور ہمارے خلیے اسی نظام کی تین مصنوعات کو بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں۔

اگر ہم زیادہ کھالیں، تو استحالہ غذا سے غذائیت صحیح طرح حاصل نہیں کرپاتا۔ یوں نہ صرف ہمارا ہاضمہ خراب ہوتا ہے بلکہ ہمیں غذا سے پوری توانائی یا غذائیت نہیں مل پاتی۔

لیکن روزہ رکھنے سے ہاضمے اور استحالہ، دونوں نظاموں کو کچھ عرصے کے لیے آرام مل جاتا ہے۔ چناں چہ آرام کرنے کے بعد وہ اپنا اپنا کام بہتر طور پرانجام دیتے ہیں۔ غذا بخوبی ہضم ہوتی ہے، جبکہ استحالہ اس سے ساری غذائیت (امائنو ترشے، چکنائی کے ترشے اور گلوکوز) چوس لیتا ہے۔ یوں شافی و کافی غذائیت پاکر ہم جسمانی و ذہنی طور پر تندرست رہتے ہیں۔

۲۔ عمر بڑھتی ہے

آپ شاید یقین نہ کریں، کم کھانے سے انسان کی عمر بڑھتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ کم کھانے سے ہاضمے اور استحالے کے نظام اپنی ذمے داری بخوبی نبھاتے ہیں۔ انھیں ہمہ وقت کام نہیں کرنا پڑتا اور یوں انسانی صحت عمدہ رہنے کے باعث عمر بڑھ جاتی ہے۔

۳۔ وزن میں کمی ہوتی ہے

جب ہم روزے رکھیں، تو خصوصاً دوپہر کے بعد ہمارے جسم کے خلیے چربی جلا کر ایندھن پاتے ہیں۔ یوں پیٹ، کولھوں اور دیگر جسمانی مقامات پر جمی چربی پگھل جاتی ہے۔ یہ عمل قدرتاً انسان کا وزن بھی گھٹاتا ہے۔ آج کل کھلاڑی اور ایتھلیٹ دانستہ وقفے وقفے سے بھوکے رہتے ہیں تاکہ بدن کی چربی گھلا سکیں۔

۴۔ انسولین بہتر انداز میں کام کرتی ہے

ہارمون انسولین ہمارے خون میں شکر (گلوکوز) کی سطح متوازن رکھتا ہے۔ اگر خون میں شکر کی سطح بڑھ جائے، تو وہ زہریلا ہونے لگتا ہے۔ یہ انسولین ہی ہے جس کے حکم پر خلیے شکر استعمال کرتے ہیں۔



پرہیزگاری کا ذریعہ نہیں

جدید طبی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ جب انسان طویل عرصہ بھوکا رہے، تو انسولین کا نظام کار بہتر ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے خون میں شکر کی مقدار بڑھ نہیں پاتی اور ہم تندرست و توانا رہتے ہیں۔

۵۔ بھوک کا نظام بہتر ہو جاتا ہے

آج کل ہر دو تین گھنٹے بعد کھانے کا رواج ہو گیا ہے۔ اس طریقے کی قباحت یہ ہے کہ انسان کو کبھی بھوک محسوس نہیں ہوتی۔ انسان کو حقیقی بھوک اس وقت لگتی ہے جب وہ ۱۲ تا ۲۴ گھنٹے کچھ نہ کھائے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان کو مہینے میں دو تین دن وقفے وقفے سے بھوکا رہنا چاہیے۔ وجہ یہ کہ یہ عادت اپنانے سے ہمارے جسم کے ہارمون منظم انداز میں اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔ یاد رہے، ان کا غیر منظم ہونا موٹاپا جنم لینے کی اہم وجہ ہے۔ اسی خرابی کے باعث چند ہارمون مرد و زن کو علم ہی نہیں ہو پاتا کہ پیٹ بھر

چکا۔ چناں چہ وہ کھاتے چلے جاتے ہیں اور فربہ ہونا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

لیکن انسان جب روزہ رکھ کر بھوکا رہے، تو ہارمونوں کا نظام نئے سرے سے کام کرنے لگتا ہے۔ روزے جتنے زیادہ رکھے جائیں، یہ نظام بھی اتنا ہی خود کو درست کر سکے گا۔ چناں چہ روزہ رکھنا جسم میں ہارمونوں کا بگڑا اور بے ترتیب طریق کار درست کر ڈالتا ہے۔ اس سے صحت پر مثبت اثر پڑتا ہے۔

۶۔ کھانے کا نظام الاوقات ہوا درست

آج کل مصروفیات کے باعث بہت سے انسان وقت پر کھانا نہیں کھا پاتے۔ جب بھی انھیں وقت ملے، وہ پیٹ بھر لیتے ہیں۔ تاہم کھانے کے اس غیر فطری نظام الاوقات کی خرابی یہ ہے کہ اسے اختیار کرنے سے انسان مختلف غذائی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بیماریاں طبی اصطلاح میں ''اختلال خوردن'' (Eating disorders) کہلاتی ہیں۔

لیکن انسان باقاعدگی سے روزے رکھے، وقت پر سحر و افطار کرے، تو ایک ماہ کے دوران کھانے پینے کا وقت متعین ہو جاتا ہے۔ یوں وقت پر کھانا کھانے سے اس کے بیشتر جسمانی افعال فطری حالت میں آ جاتے ہیں اور صحت پر نہایت مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۷۔ دماغ کی کارکردگی بڑھتی ہے

روزے رکھنے سے ہماری دماغی قوت بھی بڑھتی ہے۔ وجہ یہ کہ جب انسان بھوکا ہو، تو اس کے بدن میں ایک پروٹینی مادے ''بی ڈی این ایف'' (Brain-derived neurotrophic fator) کی افزائش بڑھ جاتی ہے۔

بی ڈی این ایف ایک اہم پروٹینی مادہ ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمارے دماغی خلیے (نیورون) صحت مند رہتے اور اپنا کام بہترین طریقے سے کرتے ہیں۔ مزید برآں یہی بنیادی خلیوں (Stem Cells) کو تحریک دیتا ہے کہ وہ نئے دماغی خلیے تخلیق کریں۔ مزید برآں جب دماغی بیماریاں مثلاً الزائمر اور پارکنسن حملہ کریں، تو یہی پروٹینی مادہ دماغی خلیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے بدن میں اس کا وافر مقدار میں ہونا ضروری ہے۔

۸۔ مامون نظام طاقتور ہوتا ہے

ہمارے جسم میں مخصوص خلیوں، بافتوں (Tissues) اور اعضا کا ایک نظام یا نیٹ ورک ہمیں امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ طبی اصطلاح میں یہ ''مامون نظام'' (Immune System) کہلاتا ہے۔ بھوکے رہنے کی حالت اس نظام مامون کو بھی مضبوط کرتی ہے۔

وجہ یہ کہ جب بدن میں غذا نہ ہو، تو کھانے، پینے اور ہاضمے سے متعلق تمام نظام رک جاتے ہیں۔ نتیجتاً دماغ اور دیگر جسمانی نظاموں کو موقع ملتا ہے کہ وہ پوری توجہ مامون نظام کے فعل بہتر بنانے پر دے سکیں۔

شاید آپ نے دیکھا ہو، جب کوئی جانور بیمار ہو، تو وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ مدعا یہی ہوتا ہے کہ اندرونی جسمانی افعال پر دباؤ کم سے کم ہو جائے اور مامون نظام پوری قوت سے بیماری کا مقابلہ کر سکے۔ انسان واحد زندہ نوع ہے جو بیمار ہو کے بھی کھاتا ہے، حالانکہ عموماً اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روزے کی حالت میں ہمارا مامون نظام آزاد اصلیوں (Free radical) سے پہنچنے والا نقصان دور کرتا ہے۔ (آزاد اصلیے ضرر رساں ایٹم ہیں جو صحت مند خلیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں)۔ نیز فاقے کی بدولت ہم جسمانی سوزشوں سے بھی نجات پاتے ہیں۔

۹۔ انسان ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے

رمضان کے دوران باقاعدگی سے روزے رکھنے والا روحانی و جسمانی طور پر خود کو ہلکا پھلکا اور باشعور محسوس کرتا ہے۔ وہ پہلے کی نسبت عملی سرگرمیوں، کھیل، عبادات وغیرہ میں ذوق و شوق سے حصہ لیتا اور دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ یہاں

مثبت تبدیلی کا راز بھی جو کا رہنے میں پوشیدہ ہے۔

دراصل ہمارا نظام ہضم جسم میں سب سے زیادہ توانائی استعمال کرنے والے نظاموں میں شامل ہے۔ لہٰذا جب معدے میں غذا نہ ہو، تو جسم کے دیگر نظاموں کو بھی توانائی میسر آتی ہے۔ ہلکے پھلکے جسم اور صاف شفاف دماغ کے باعث ہم ارد گرد کے ماحول سے زیادہ آشنا ہوتے اور خود کو میسر نعمتوں کی قدر و قیمت محسوس کرنے سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

۱۰۔ چہرے کے داغ دھبے دور

جیسے درج بالا بتایا گیا، دوران روزہ جب ہمارا نظام ہضم پر سکون ہو، تو ہمارے جسمانی نظام توانائی دیگر "نیٹ ورک" استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر زہریلے عناصر کو دور کرنے والا (Detoxify) نظام۔

یہ نظام جسم میں مردہ خلیوں اور رقتوں کو نکال باہر کرتا ہے۔ نیز بدن میں جہاں پھوڑے پھنسیاں ہیں، انہیں صاف کرتا ہے۔ نیز جلد پر کہیں زخم ہو، تو اسے بھر دیتا ہے۔ یہی نظام ہمیں چہرے کے داغ دھبوں اور پھنسیوں سے بھی چھٹکارا دلاتا ہے۔

طبی تجربات میں دیکھا گیا ہے کہ انسان اگر ایک دن کا بھی روزہ رکھے، تو جسم زہریلے عناصر سے پاک ہو جاتا ہے۔ نیز اہم جسمانی اعضا مثلاً جگر، گردوں وغیرہ کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس ماہ رمضان میں بھی روزے رکھیے اور خود کو نیا اور توانا انسان بنالیجیے۔

☆☆

اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک مسلمان کو تندرست ہونا چاہیے کیونکہ تبھی وہ اپنی دینی و دنیاوی ذمے داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اور صحت مند رہنے کی شرط یہ ہے کہ انسان کم کھائے اور خصوصاً دوران رمضان روزے رکھ کر اپنا جسمانی و روحانی نظام بہتر بنالے۔

رحمت اللعالمین، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے ہی انسان کو تندرستی کا وہ زبردست نسخہ عطا فرمایا تھا جب طبی سائنس بھوکا رہنے کے فوائد سے ناواقف تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"اولاد آدم کو زندہ رہنے اور کمر سیدھی رکھنے کے لیے چند لقموں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ کھانا ہی ہے تو وہ (پیٹ کا) دوسرا حصہ کھانے سے پر کرے، تیسرے حصے میں پانی بھرے اور چوتھا خالی چھوڑ دے۔"

بلند درجہ انسان

کہتے ہیں کہ ایک چور کسی نیک پارسا کے گھر میں چوری کرنے چلا گیا۔ اس نے پورے گھر کی تلاشی لی۔ مگر کوئی ایسی شے اسے وہاں نظر نہ آئی جسے چرایا جا سکے۔ اچانک اس پارسا بندے نے اسے گھر میں تلاشی لیتے دیکھ لیا۔ چپکے سے اٹھا اور اپنے بیٹھنے کی گودڑی کو گھر سے نکلنے کی جگہ پر ڈال دیا تاکہ چور خالی ہاتھ مایوس نہ جائے اور گودڑی سے شاید اس کو کوئی فائدہ پہنچ سکے۔

دوستو! میں نے سنا ہے کہ اللہ کے بندے اپنے دشمنوں کا بھی دل نہیں دکھاتے۔ اے دنیادار انسان تجھے یہ مرتبہ کب حاصل ہو سکتا ہے، تیرا تو اپنے دوستوں سے بھی اکثر اختلاف رہتا ہے اور تو ان سے ہر لحظہ بات بات پر جھگڑتا رہتا ہے۔ سن لے کہ خلوص کی دوستی کا یہ حال ہے کہ خواہ وہ سامنے ہوں یا پیٹھ پیچھے ایک جیسے رہتے ہیں۔ نہ کہ سامنے ہوں تو قربان جائیں اور پیٹھ پیچھے تیرے عیب لوگوں سے بیان کرتے رہیں۔ یا سامنے ہوں، مسکین بکری کی طرح نرم اور تیری پیٹھ کے پیچھے انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھانے والے بھیڑیے کی مثل رویہ اختیار کرلیں۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ جو تیرے پاس دوسروں کے عیب آکر بیان کرتا ہے، وہ یقیناً دوسروں کے پاس جاکر تیرے عیب اور برائیاں بیان کرتا ہوگا۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ)



"آلو ذخیرہ کرلو"

ماہ مبارک میں حرام کھانے والوں کے لیے قلمی تازیانہ

ملک ظہور کشمیری

رمضان المبارک آنے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ بازار میں ایک دکان پر مجمع دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔ سوچا، مبادا کوئی جھگڑا نہ ہو گیا ہو۔ نجانے کیوں لوگوں میں برداشت کا مادہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ قریب پہنچا تو پتا چلا کہ ایک صاحب جو چند روز قبل دکان سے کوئی شے خرید لے گئے تھے، آج صبح صبح واپس کرنے چلے آئے کہ اس میں کوئی نقص تھا۔

دکاندار نے جلی حروف میں ایک تختی تھا رکھی تھی جس پہ تحریر تھا "خریدا ہوا مال واپس یا تبدیل نہیں ہو گا۔" لیکن گاہک بضد تھا کہ ہم جس نبیؐ کی امت ہیں، آپؐ کی محبت کا دم بھرتے اور عاشقِ رسول بنے پھرتے ہیں، آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی فروخت شدہ مال واپس کرنے آئے تو دکاندار ماتھے پہ شکن ڈالے بغیر رکھ لے۔

دکاندار نے اس کی ایک نہ سنی۔ آخر وہ شریف النفس اپنی دلیل کی وقعت نہ پا کر چپ چاپ چلا گیا۔ میں خاصی دیر اس واقعے کے متعلق سوچتا رہا۔ واقعی یہ مرض ہم لوگوں میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے ارشادات کو دنیاوی نفع کی خاطر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جبکہ غیر مسلم تو نبی کریمؐ کے اس ارشاد کو نہ صرف مانتے بلکہ عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی تیار کردہ مصنوعات کے بارے میں اعلان کرتی ہیں کہ استعمال کے دوران اگر آپ کو اس میں کوئی نقص نظر آئے یا دل مطمئن نہ ہو تو بلا جھجک استعمال شدہ مصنوعہ لوٹا دیں اور اپنی رقم لے جائیں۔۔۔ اور اس بات میں ان کمپنیوں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

یہی نہیں، یہ غیر مسلم کئی اخلاقی صفات کے حامل ہیں۔ مثلاً کسی بھی مذہبی تہوار پر وہ اشیائے خورونوش اور دیگر عام چیزوں کی قیمتیں گھٹا دیتے ہیں تاکہ امیر و غریب سبھی خوشیاں منا سکیں۔ اور تو اور ہمارا ازلی دشمن بھارت بھی ایسا ہی

میں مسلمان تاجر کے ساتھ نرمی والا سلوک روا رکھتا اور سفری اخراجات میں خاطر خواہ کمی کر دیتا ہے۔ غیر مسلم رمضان المبارک میں مزدور کی مشقت کے اوقات بھی گھٹا دیتے ہیں کیونکہ یہ فرمانِ رسولؐ ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں معاملات برعکس ہیں...... یہاں غریب تو ایک طرف رہا متوسط طبقے کے افراد بھی ان ایام میں خریداری کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ ہر چیز کے دام آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں۔

☆☆

میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ کون سی سبزی گھر لے جاؤں۔ آج آلو اور بھنڈی کے نرخ بھی آسمانوں سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ اسی دوران ایک صاحب اُٹھ بیٹھ کرتی نئی ڈیلی موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور سبزی والے سے باآواز بلند کہنے لگے ”پاجی! روزے آ رہے نیں۔ آلو ”اسٹاک“ کرلو تے نوٹ کمانے تے سٹے فیر اک کنا تون بیڈی۔ اتی سو روپے کلو تک جان گے......

(بھائی جی روزے آ رہے ہیں، ”آلو“ ذخیرہ کر لو اور روپے کمانے ہیں تو پھر نہ کہنا تو نے بتایا نہیں۔ اسی یا سو روپے کلو تک بکیں گے۔)

وہاں اکا دکا گاہک اور بھی کھڑے تھے۔ مجھ سمیت کسی کو اس شخص پر غصہ آیا جو سبزی والے کو غلط کام کی ترغیب دے رہا تھا۔ مہنگائی اور بیروزگاری نے ویسے ہی عوام کا کچومر نکال رکھا ہے اوپر سے وہ جلتی پر تیل ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے رازداری کے انداز میں آفتاب سبزی والے کے کان میں کھسر پھسر کی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر اللہ توبہ کرنے لگا۔ مگر وہ بضد تھا کہ آفتاب آلو ذخیرہ کر لے۔ جب آفتاب نے ہاں نہ بھری تو وہ دو چار کی بچت والوں کی مثال دینے لگا جنھوں نے رمضان سے دو ماہ قبل ہی نرخ بڑھا رکھے ہیں۔ ”یہاں کون پوچھنے والا ہے؟...... بیوقوف یہ موقع سال بعد آتا ہے۔ ایک ماہ میں پورے سال کی روٹیاں کما لو گے پھر یہ قسمت یا نصیب۔“ یہ تمہید باندھ کر وہ چلا گیا۔

ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بھی اس وقت وہیں کھڑے تھے۔ وہ اس شخص کی شیطانی ترغیب برداشت نہ کر سکے اور اسی کے انداز میں گویا ہوئے:

”ماہِ صیام کی آمد آمد ہے۔ پتا نہیں پھر زندگی میں موقع ملے نہ ملے، اس بابرکت مہینے میں اپنی اپنی تجوریاں بھر لو۔ آپ کسی بھی پیشے یا شعبے سے منسلک ہیں۔ پھل فروش ہیں یا سبزی، کریانے کی دکان ہے یا گوشت کی...... آپ اس برکتوں والے مہینے میں منہ مانگے دام وصول کیجیے کیونکہ اس مہینے کا یہی تقاضا ہے۔ دن بھر اللہ تعالیٰ کی خاطر بھوک اور پیاس برداشت کرنے والوں کو سکھ کا نوالہ مت کھانے دو ورنہ آپ اس ماہ کی برکات سے محروم رہ جائیں گے۔

”بھول جائیں کہ آپ مسلمان ہیں۔ بس پیسا ہی آپ کا دین ایمان ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگلے جہان یہی ”اکٹھی“ آپ کے کام آئے گی۔ صبر، شکر، قناعت، ایثار، رحم اور ایمانداری...... یہ تمام فضول چیزیں دنیا ہی میں رہ جائیں گی۔ آپ ان کی قطعی پروا نہ کیجیے۔ کم تولیں، ذخیرہ اندوزی کریں، ملاوٹ کریں، جھوٹے وعدے شعار بنائیں، قسمیں کھا کر سودا بیچیں، اپنے مال کا نقص چھپائیں، فروخت شدہ مال ہرگز واپس نہ کریں۔ یہی کامیابی کے زینے ہیں۔

”یہ افعال انجام دینے والی چیزیں تو میں نے بتائی ہیں بلکہ ان کی فہرستیں تک بنا کر دی جاتی تھیں۔ لیکن آپ اس بات کی بالکل ٹینشن نہ لیں کیونکہ آپ تو امت محمدیؐ ہیں،

آپ کا بال تک بیکا نہیں ہوگا، جو جی میں آئے کہیے، کوئی پوچھنے والا نہیں......"

☆☆

آفتاب سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ موصوف ہمارے محلے کے بازار میں سبزی کی دکان کرتے ہیں۔ پورا تول' مناسب نرخ اور "دریادلی" اُس کے کاروبار کی کامیابی کا راز ہے۔ کوئی گاہک دو روپے کا سودا لینے بھی آئے' تو وہ ماتھے پر شکن ڈالے بغیر تھیلے (شاپر) میں دھنیے کے ساتھ دو چار ہری مرچیں بھی ڈال دیتا اور ہر گاہک سے مسکرا کر بات کرتا ہے۔

اسی بازار میں چند قدموں پر دائیں جانب ملک اصغر بھی سبزی سجائے بیٹھا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ آفتاب' ملک کے ہاتھوں کا بچہ ہے۔ محلے میں سب سے قدیم سبزی کی دکان ملک اصغر ہی کی ہے۔ موصوف سونے کے مانند سبزی تولتا ہے۔

سبزی تازہ رکھنے کے بہانے وہ ہزار اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو گاہے گاہے پانی سے تر کرتے رہتے ہیں۔ اس سے سبزی کے حجم میں اضافہ ہونا فطری ہے۔ خاص طور پر پالک تو خوب پانی پیتی ہے' لیکن ملک اصغر کو اس کی قطعی پروا نہیں۔ وہ پانی والی سبزی بھی پلڑا جھکائے بغیر تولتا ہے۔ ہری مرچ اور دھنیے کے بھی دام وصول کرتا ہے۔ اگر جی کڑا کر کے سبزی خریدنے والے کو یہ نعمتیں عنایت کر دے' تو وہ نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہیں۔ کم تول' زیادہ بھاؤ اور کنجوسی اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

دکان پہ رکھی سبزی پڑے پڑے خراب ہو جائے گی مگر ملک صاحب چھٹانک بھر سبزی کسی کو زیادہ دینے کے روادار نہیں ہوتے۔ موصوف رات گئے تک قسمت آزمائی کرتا ہے تب بھی سودا نہیں بکتا۔ اگلے روز ملک اصغر منڈی سے تھوڑا سودا لاتا ہے اور کل کے باسی سودے میں ملا کر دکان سجا لیتا۔ جبکہ آفتاب ہر شام سودا بیچ گھر کی راہ لیتا اور اگلے دن تازہ سبزیوں سے بھری ریڑھی لے آتا ہے۔

مولانا رومیؒ نے کہا

☆ محسن دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر ان کے احسانات باقی رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جس نے احسان کی روش اختیار کی۔

☆ ظالم مظلوم کی دنیا بگاڑتا ہے اور اپنی عاقبت۔

☆ ایمان کو دلوں کے صدق سے تازہ کرو نہ کہ زبانی اقرار سے۔

☆ چونکہ بہت سے ابلیس انسان کی صورت رکھتے ہیں اس لیے ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دو۔

☆ توحید کیا ہے؟ اپنے آپ کو ذاتِ واحد میں گم کر دینا۔ (انتخاب: فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

آج کل مصروفیت کے باعث میں صرف اتوار کو آفتاب سے سبزی لینے جاتا ہوں۔ موصوف موسم کی مناسبت سے ٹھنڈے مشروب یا گرم چائے سے ضرور تواضع کرتا ہے۔ اس کی مہمان نوازی بھی کاروبار میں برکت ڈالتی ہے۔

☆☆

جیسا کہ ماہ رمضان کی آمد آمد ہے۔ یہ برکتوں والا مہینا کسی خاص مقصد کے تحت ہم پر نازل کیا گیا تا کہ ہم بھوک' پیاس برداشت اور صبر و تحمل کی عادت پیدا کر سکیں اور اپنے بدن میں نادیدہ پنپنے والی بیماریوں سے محفوظ رہیں۔ اس کے فوائد بے شمار ہیں جو انسانی عقل سے ماورا ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اب تو جدید تحقیق بھی روزے کے فیوض و برکات کی قائل ہو چکی۔

دیا سلائی نے میری جان بچالی

موت اور حیات کے درمیان جب صرف بالشت بھر کا وقفہ رہ گیا

بشیر احمد بھٹی

اب بھی جب یہ واقعہ یاد آئے، تو بدن میں خوف کی لہر دوڑتی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فطری طور پر میں بزدلی کا نشان نہیں، موت کا تو وقت مقرر ہے۔ لیکن لفظ ''اذیت'' میں جو خوف سا پوشیدہ ہے۔ اُسے ہر کوئی نہیں جان پاتا۔ کوئی بھی جاندار یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی قسم کی جسمانی اذیت سے دوچار ہو۔ لیکن بعض اوقات انسان ایسے سانحے سے دوچار ہوتا جاتا ہے جب موت ٹھہر جاتی ہے اور نہیں بھی۔ یعنی وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں اذیت ناک لمحوں سے دوچار ہونا۔

مر جانا علیحدہ بات ہے۔ انسان کو موت نہ آئے اور وہ سسکتے تڑپتے زندگی گزارے، یہ ہوتی ہے، اذیت ناک حیات۔ اس روز میری جیب میں دو روپے کی دیا سلائی یعنی ماچس نہ ہوتی، تو پتا نہیں، میرا کیا حال ہوتا۔ صرف دو روپے کی دیا سلائی سے ایک بہت بڑی مصیبت میرے سر کیا پیروں سے ٹل گئی۔

میرے شہر میں پرانا خزانہ روڈ پر ''بابا نصیر چھولے والا'' مشہور و معروف ہوٹل واقع ہے۔ بابا نصیر تو دنیا میں نہیں رہا، اس کا بڑا فرزند ارجمند شاہد نصیر اب یہ ہوٹل چلاتا ہے۔ یہ واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی کی اصلاح ہو جائے۔ جس کہانی میں اصلاح کا پہلو ہو اُسے ضرور صفحۂ قرطاس پر لانا چاہیے۔ اس سے بہت سوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔

جس دن سے میں نے وہ خوفناک نظارہ دیکھا ہے، ہر وقت دیا سلائی جیب میں رکھتا ہوں۔ یہ بڑے کام کی شے ہے۔ میں دوسرے لوگوں کو بھی یہ مشورہ دوں گا کہ وہ دیا سلائی ضرور جیب میں رکھیں، کسی بھی وقت خصوصاً اندھیرے میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

وہ غالباً ساون کا مہینا تھا۔ شدید حبس سے سب ہلکان ہو رہے تھے۔ گرمی اور پھر لوڈ شیڈنگ کا عذاب! بجلی کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ ایسے میں ہر کسی کا جی چاہتا ہے کہ وہ ٹھنڈے پانی سے نہائے۔ لیکن ہمارے مکان کی چھت پر نصب نیلے رنگ کی پانی والی ٹینکی کا پانی گرمیوں میں اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ بندہ اس میں انڈا ابال لے۔ اس پانی سے نہانا ''اپنے آپ کو



جلانے" والی بات تھی۔

چناں چہ میں نے صابن اٹھایا اور خزانہ روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بابا نصیر ہوٹل سرکاری مسجد کی جائداد میں شامل تھا۔ مسجد انتظامیہ نے مسجد کے باہر ایک کونے میں تین عدد بیت الخلا اور ایک غسل خانہ تعمیر کرایا تھا۔ ہوٹل کے بیشتر ملازمین لڑکوں کا تعلق مبارک پور سے تھا۔ گھر دور ہونے کے باعث وہ ہوٹل کے پچھواڑے بنے کوارٹروں میں رہائش رکھتے تھے۔ یہ بیت الخلا اور غسل خانہ ان لڑکوں کے استعمال میں رہتے۔

ہوٹل میں ٹھہرنے والے اکثر مسافر بھی غسل خانے میں نہاتے تھے۔ مسجد کے قریب ہی تین تناور درخت بھی تھے۔ ان کی گنجان شاخوں کی وجہ سے رات ہوتے ہی درختوں تلے گھمبیر تاریکی پھیل جاتی۔ ایک بار لڑکوں نے وہاں بڑا سا سانپ دیکھ لیا۔ اس سے قبل کہ اسے مارتے، وہ غائب ہو گیا۔

لڑکوں پر قدرتاً خوف طاری ہو گیا۔ انھوں نے بعد نماز مغرب بیت الخلا کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ انہی لڑکوں نے انھوں نے یہ بتا کر ہراساں کیا کہ سانپ دیکھا گیا ہے، رات کو ادھر کم ہی آیا کرو۔ انھوں نے مجھے بھی بتایا، تو میں نے ان کی بات مذاق میں ٹال دی۔

غسل خانے کا فرش کافی نیچے تھا۔ مٹی کی فراوانی کے باعث باہر کی سطح بلند تھی۔ اس کے دروازے پر کاٹھ کباڑ اور ٹوٹی اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ غسل خانے جاتے ہوئے اس کاٹھ کباڑ کے اوپر سے گزرنا پڑتا تھا۔

اس دن اندھیرا چھاتے ہی میں نہانے مسجد کے غسل خانے پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ گھنے درختوں کا سایہ ہونے کی وجہ سے غسل خانے کی ٹینکی کا پانی نسبتاً ٹھنڈا ہو گا۔ میں سیدھا دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ فرش نیچے ہونے کے باعث احتیاط سے اندر جانا چاہتا تھا۔ دروازے پر رک کر میں نے جیب سے ماچس نکالی تاکہ تیلی جلا کر روشنی میں اندر داخل ہوا جائے۔ میرا پاؤں غلط جگہ پڑتا، تو موچ آنے کا اندیشہ تھا۔

تیلی جلا کے جونہی غسل خانے کے فرش کی جانب نگاہ ڈالی، تو خوف کے مارے کانپ گیا۔ سانپوں کا ایک جوڑا فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مادہ تھی اور دوسرا نر سانپ۔ وہ یقیناً ساون کی رُت منا رہے تھے۔ اگر میں تیلی نہ جلاتا اور غسل خانے میں پاؤں رکھ دیتا، تو وہ عین اس جگہ بیٹھے تھے جہاں میرا قدم اُن پہ پڑتا۔ اس خطرناک صورت حال میں اُن کا ردعمل کیا ہوتا؟

ظاہر ہے، ایک ہی سیکنڈ میں دونوں میرے پیروں پر ڈس لیتے۔ جب ایک ساتھ وہ زہر میرے جسم میں چھوڑتے، تو میری کیا کیفیت ہوتی؟ پہلے تو میں اسپتال تک پہنچ نہ پاتا۔ پہنچ بھی جاتا، تو پتا چلتا کہ اسپتال میں ویکسین نہیں ہے۔

میں ایک دم پیچھے ہٹا۔ وہ جوڑا بھی یک دم الگ ہو گیا۔ پھر بڑے پھن والا زہریلا سانپ میری جانب لپکا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور دوڑ لگا دی۔ کچھ دور جا کر رکا اور مڑ کے دیکھا۔ چاند کی روشنی میں سانپ درختوں کے نیچے بیٹھا نظر آیا۔ میں نے سوچا، لڑکوں کو بلا کر یہ خوفناک منظر دکھاؤں۔ پھر سوچا لڑکے بزدل تھے، سانپ دیکھتے ہی گھبرا جاتے۔ میں نے پھر گھر کی راہ لی کہ گرم پانی ہی سے نہا لیتا ہوں۔ جان بچی سو لاکھوں پائے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کر لیا کہ آئندہ دو روپے کی ماچس ہر وقت جیب میں ضرور رکھنی ہے۔ یہ فائدے کا سودا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا

☆ بدخو عالم کی نسبت نیک خو فاسق کی صحبت اچھی ہے۔

☆ سچا فقیر وہ ہے جو کسی سے سوال نہ کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔ جب کوئی اس سے جھگڑنے لگے تو وہ خاموش رہے۔

اپنے محسنوں کو کبھی نہ بھولیے

بندے کا بھی شُکرگزار بن......

زندگی کی کجی دور کر کے اخلاق سنوار نے والے ناقابل فراموش واقعات

حبیب اشرف صبوحی



ایک جملہ میرا تکیہ کلام بن چکا: ''جو بندوں کا شکرگزار نہیں ہوتا، وہ اللہ کا شکرگزار بھی نہیں بن سکتا۔'' میں اکثر یہ جملہ اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کرتا ہوں۔ پچھلے سال میں بیٹھا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ دیکھا کہ موبائل اسکرین پر پاکستان سے باہر کا نمبر آرہا ہے۔ بٹن ''آن'' کیا تو دفتر کے ایک بہت پُرانے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ سلام دُعا کے بعد میں نے پوچھا ''راناصاحب! آپ پاکستان سے باہر چلے گئے ہیں؟''

اُس نے کہا ''جی، میں عمرہ کرنے آیا ہوں۔ اور خانہ کعبہ کی چادر پکڑے آپ کے لیے دُعا مانگ رہا ہوں۔''

میں نے کہا ''بھائی! یہ کام تو عموماً اہلِ خانہ ہی انجام دیتے ہیں۔''

وہ بولا ''سر! آپ کہا کرتے تھے جو بندوں کا شکرگزار نہیں بنتا وہ اللہ کا بھی شکرگزار نہیں ہوتا۔ یہاں میں اللہ کا بھی شکرگزار ہوں اور آپ کا بھی!''

اُس کے بعد جب وہ مدینہ شریف گیا تو وہاں جا کر بھی فون کیا اور میرے لیے دُعائیں کرتا رہا۔ میں سوچتا ہوں کہ کچھ لوگ اتنے وضعدار اور محبت والے ہوتے ہیں کہ اپنے محسنوں اور عزیزوں کو کبھی نہیں بھولتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے محسنوں کو یاد رکھنے کی توفیق دے۔ (آمین)

☆☆

ہم ایک دکاندار سے دفتر کے لیے کثیر مقدار میں سامان خریدتے۔ اوّل تو قیمت مناسب ہوتی تھی، دوسرے چیزیں بھی معیاری ہوتیں۔ وہ دفتر میں بھی آتا، مجھ سے ملتا اور بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ گو میں اکثر سوچتا، یہ کاروباری آدمی ہے۔ جب تک اسے ہم سے کام ہے، محبت اور خلوص سے ملتا رہے گا۔ جب کام ختم ہوا تو یہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح غائب ہو جائے گا۔

وہ اکثر ایک جملہ مجھے کہتا: ''آپ کی نیکیاں میں قبر کی

دیوار تک نہیں پہنچاؤں گا۔"

ایک دن اسے کہا "بھائی! تمھیں مجھ سے غرض ہے، اس لیے ایسی باتیں کرتے ہو۔ جب میں اپنے عہدے پہ نہ رہا تم مجھے پوچھو گے بھی نہیں۔"

اس نے یہ بات سنی، تو صرف مسکرا کے رہ گیا۔ آج مجھے اپنی نشست چھوڑے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا لیکن اس نے مجھے نہیں بھلایا۔ ہر سال شروع ہوتے ہی نئے سال کا کیلنڈر اور ڈائری بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ عید اور دیگر تہواروں پہ بھی یاد رکھتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں ایسے لوگوں کا ملنا کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ آج کل جب کسی سے کام پڑے، تو لوگ اس کو باپ بنا لیتے ہیں۔ جب وقت گزر جائے، تو اس کے احسانات بھول جاتے ہیں۔

محلے کی مسجد میں ایک نمازی سے میری دوستی ہو گئی۔ وہ پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ اس کے کاروباری حالات ٹھیک نہیں تھے۔ اس وجہ سے فکرمند رہتا۔ تین سال قبل کا واقعہ ہے کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے مسجد آنا چھوڑ دیا۔ دو چار دفعہ میں نے اس کے لڑکے سے پوچھا کہ تمھارے ابا نماز پڑھنے کیوں نہیں آتے؟ کیا وجہ ہے؟ وہ ہر دفعہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اس کے چہرے سے پتا چلتا کہ وہ سخت پریشان ہے۔

میں نے عید سے چند روز قبل نماز کے بعد اسے زبردستی روک لیا اور کہا "تم کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔ شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔"

جب میں نے اصرار کیا، تو اس نے بتایا "میرے والد نے لوگوں کی بڑی رقم ادا کرنا تھی۔ لیکن ہمارا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد رشتے داروں نے منہ پھیر لیا۔ جن لوگوں کا پیسا دینا تھا، آخر انھوں نے میرے والد کو جیل بھیجا دیا۔ اب ضمانت کے لیے ۲۵ ہزار روپے کی ضرورت ہے ورنہ ان کی عید جیل ہی میں گزرے گی۔ ہمارا کوئی رشتے دار مدد کرنے کو تیار نہیں۔"

میں نے یہ سنا، تو بہت افسوس ہوا۔ سوچا کہ اس مصیبت زدہ گھرانے کی مدد کرنا چاہیے۔ لہٰذا کچھ دوستوں کی مدد سے ۲۵ ہزار روپے کا انتظام کیا اور اس کے گھر دے آیا۔ عید سے قبل اس کی ضمانت ہو گئی۔ عید والے روز وہ میرا شکریہ ادا کرنے گھر آیا اور کہا "دعا کیجیے میرے حالات ٹھیک ہو جائیں تاکہ آپ کا قرض جلد از جلد اتار سکوں۔"

میں نے کہا "رقم کی فکر نہ کریں۔ جب کبھی ہوں، تو دے دینا۔"

وقت گزرتا گیا۔ پچھلے سال رمضان شریف میں اس کا بیٹا کچھ عرصے بعد مسجد میں نظر آیا۔ میں نے اس کے والد کی بابت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ والد آج کل سا ہیوال میں کام کر رہے ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے، کام اب چل نکلا ہے۔ کچھ دن بعد اس نے خاموشی سے وہ تمام رقم واپس کر دی جو میں نے دی تھی۔ اور کہا "ہمارا کام اللہ کے کرم سے ٹھیک چل رہا ہے۔ یہ پیسے آپ کی امانت ہیں، شاید کسی دوسرے ضرورت مند کے کام آ جائیں۔"

☆☆☆

میرے گھر کے سامنے ایک پولیس افسر رہتے تھے۔ سبکدوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ نماز روزے کے سختی سے پابند اور تہجد گزار تھے۔ لوگوں کے کام آتے۔ نماز پڑھنے مسجد باقاعدگی سے جاتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ تکبیر اولیٰ ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر کسی شادی یا تقریب میں جاتے تو اس بات کا خصوصی اہتمام کرتے کہ نماز باجماعت ادا کی جائے۔ جب تک ملازمت میں رہے انھوں نے ہمیشہ رزق

حلال پر زور دیا۔ بچے برسرِ روزگار اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ آخیر عمر میں بیماری کے باعث اسپتال داخل ہوگئے۔

ڈاکٹر ان کی گرتی صحت مدِنظر رکھتے ہوئے انھیں آکسیجن دینے لگے۔ جب بچے اور رشتے دار سب پہنچ گئے تو ڈاکٹر نے کہا ''اب میں آکسیجن کی نالی نکال لوں گا۔ اس کے بغیر یہ زندہ نہیں رہیں گے۔'' چناں چہ ڈاکٹر نے بچوں اور رشتہ داروں سے اجازت لے کر آکسیجن کی نالی ناک سے نکال دی۔ سب کلمہ پڑھنے لگے۔

لیکن نالی نکالتے ہی معجزہ یہ ہوا کہ بزرگوار کلمہ پڑھتے اٹھ کر بیٹھ گئے اور ارد گرد کئی لوگوں کو کھڑے دیکھ کر حیران ہوئے اور کہا کہ آپ لوگ کس طرح آگئے؟ ان کو بتایا گیا کہ آپ شدید بیمار تھے اور اب معجزاتی طور پر ٹھیک ہو چکے۔

بزرگوار کہنے لگے ''اب مجھے گھر لے چلو۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ تھوڑی سی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' چناں چہ وہ اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے گھر آگئے۔ ابھی دو دن گزرے تھے کہ گھر والوں سے بار بار کہنے لگے ''یہ سفید وردی والے کون لوگ گھر میں پھر رہے ہیں؟ یہاں ان کا کیا کام؟'' گھر والے کہتے کہ انھیں تو کوئی نظر نہیں آرہا۔

انتقال سے چند لمحے پہلے کہنے لگے ''خواتین کمرے سے باہر چلی جائیں۔ سفید وردی والے زیادہ تعداد میں آگئے ہیں۔'' خواتین بادل نخواستہ چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں، تو دیکھا کہ بزرگوار انتقال کر چکے۔ یہ عین ممکن ہے کہ سفید وردی میں ملبوس فرشتے ہوں۔ آخر قرآن پاک کی رو سے ان کا وجود تو ثابت ہے۔

بہرحال بغیر کسی تکلیف کے ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ نیک آدمیوں کی موت بھی آسان اور معجزے کے ساتھ ہوتی ہے۔ انسان کی نیکی اس کے مرنے کے بعد بھی کام آتی ہے۔

قومی زبان سے محبت

چند سال ہوئے انگلستان کے ایک مشہور ماہرِ تعلیم پاکستان آئے۔ ہم نے انھیں ایک انگلش میڈیم سکول دکھانے کے بعد فخر سے ان کی رائے پوچھی جو سننے کے قابل ہے۔ کہنے لگے: ''بھئی آپ کی ہمت قابلِ داد ہے جو اپنے بچوں کو ایک غیر ملکی زبان میں تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر میں انگلستان میں انگریز بچوں کو اُردو کے ذریعے تعلیم دینے کی سفارش کروں تو مجھے یقیناً اگلی رات کسی ہسپتال میں کاٹنی پڑے۔ آپ واقعی بہادر ہیں۔''

(کرنل محمد خان کی کتاب ''بزم آرائیاں'' سے اقتباس)

(ابرار مغل میرپور آزاد کشمیر)

خوش اخلاقی اور حکمت عملی سے انسان کئی بگڑے کام کروا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ واقعات پیش ہیں۔

میرے ایک عزیز کراچی سے لاہور آئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔ وہ راولپنڈی جانا چاہتے تھے۔ ان کی نشست میں نے کراچی سے آنے والی ریل میں مختص کرا دی۔ جب ہم اسٹیشن راولپنڈی جانے کے لیے اپنی نشستوں پر پہنچے، تو دیکھا کہ وہاں ایک بزرگ خاتون بچوں سمیت بیٹھی ہے۔

جب ہم نے بتایا کہ یہ نشستیں ہماری ہیں، تو وہ لڑنے پر اتر آئیں اور کہنے لگیں ''ہم کراچی سے راولپنڈی تک کے لیے بک کرا کر آئے ہیں۔ ہم یہیں بیٹھیں گے۔''

میرے عزیز نے بزرگ خاتون کی باتیں بڑے تحمل اور صبر سے سنیں اور کہنے لگے ''اماں جان، آپ بیٹھی رہیں۔ آپ کے بچے بھی یہیں بیٹھیں۔ اب اتنا وقت نہیں کہ ٹکٹ چیکر سے یہ فیصلہ کرائیں کہ یہ نشستیں کس کی ہیں؟ ہم زمین پر بیٹھ

گزارا کر لیں گے۔‘‘

وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ’’دیکھو ان کی شکل ہماری والدہ سے کتنی ملتی ہے۔ میرا سفر اچھا گزرے گا۔‘‘

انھوں نے پھر اپنے بچوں کے لیے جو بسکٹ اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں خریدی تھیں، فوراً بزرگ خاتون اور ان کے بچوں کو دیں۔ کچھ دیر بعد بزرگ خاتون نے خود ہی ان کی نشستیں خالی کر دیں اور کہا ’’تم نے چھوٹے ہوتے ہوئے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ میں تمھاری تعلیم و تربیت کی قائل ہو گئی ہوں۔‘‘

بعد میں میرے عزیز نے بتایا کہ وہ میرے رونے سے اتنی متاثر ہوئیں کہ جب ہم جدا ہونے لگے تو کہنے لگیں، راولپنڈی میرے گھر ضرور آنا۔ میں تم سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوں۔ یہ سب اچھے اخلاق اور اچھی بات چیت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو شاید دوسارے راستے لڑتے ہوئے آتے۔

اسی طرح میں بذریعہ ریل کار ایک بار راولپنڈی سے لاہور آ رہا تھا۔ ریل کار میں بہت ہجوم تھا۔ کافی لوگ کھڑے تھے۔ میرے سامنے کی بڑی نشست پر دو اشخاص بیٹھے تھے۔ ریل چلے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک ضعیف آدمی بڑی مشکل سے چلتا وہاں آیا اور سامنے بیٹھے دونوں اشخاص سے درخواست کی ’’مجھے بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ دے دیں۔‘‘

انھوں نے ادھر ادھر کھسک کر اسے تھوڑی سی جگہ دے دی۔ وہ ضعیف آدمی شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ان دو میں سے ایک شخص چلا گیا۔ راستے میں اسے کھڑے مسافروں میں کوئی رشتہ دار مل گیا۔ وہ اسے ساتھ لے آیا اور ضعیف آدمی سے کہنے لگا ’’اب نشست چھوڑ دو۔ میرے یہ عزیز کافی دیر سے کھڑے ہیں۔‘‘

ضعیف آدمی نے نشست خالی کر دی اور رنجیدہ شکل بنائے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد ٹکٹ چیکر آیا۔ اس نے سب کے ٹکٹ دیکھے بھالے۔ جب وہ ضعیف آدمی کے پاس پہنچا اور اس کا ٹکٹ دیکھا تو حیرانی سے بولا ’’بابا جی! یہ آپ کی نشست ہے۔ آپ یہاں بیٹھیے اور آپ کھڑے ہیں؟‘‘

ٹکٹ چیکر نے پہلے دونوں آدمیوں کو اٹھا دیا جو بابا جی کی نشست پر ’’قبضہ‘‘ جمائے بیٹھے تھے۔ اور وہ مستحق شخص جس کی نشست تھی کھڑا تھا۔ یہ ضعیف آدمی کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے ان لوگوں کو نہیں بتایا کہ نشست اس کی ہے۔ اور وہ پریشانی اور تکلیف میں کھڑا ہے۔ میں نے ایسا اعلیٰ ظرف شخص کبھی نہیں دیکھا۔ یہ واقعہ میں نہیں بھول سکتا۔

زندگی سنوارنے والے قول

☆ ہزار آدمیوں کی دوستی کو بھی ایک شخص کی عداوت کے بدلے میں نہ خریدو۔

☆ نفس سے بڑھ کر دنیا میں منہ زور اور بے لگام جانور اور کوئی نہیں۔

☆ خالی پیٹ شیطان کا کارخانہ اور بھرا ہوا پیٹ اس کا اکھاڑہ ہے۔

☆ اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمھارے مرنے کے بعد دنیا کی کیا حالت ہوگی، تو دیکھ کہ دوسروں کے مرنے کے بعد دنیا کی کیا حالت ہے۔

☆ جو خدا سے ڈرتا ہے سب اس سے ڈرتے ہیں۔

☆ صبر دنیا کی سب نیکیوں کا نچوڑ ہے۔

☆ علم کی عظمت حلم سے ہے اور حلم علم ہے۔

☆ جو خدا سے شرم رکھتا ہے لوگ بھی اس سے شرم رکھتے ہیں اور جو خدا کے سامنے گناہ کرنے میں دلیری کرتا ہے لوگ بھی اس پر دلیر ہو جاتے ہیں۔

(انتخاب: بشیر خان، پشاور)

ہم سا ہو تو سامنے آئے

دو بہادر نابینا طالبات

ان حوصلہ مند لڑکیوں کی ولولہ انگیز داستانِ جہد جنھوں نے معذوری کے باوجود مشکلاتِ زندگی کا مقابلہ کیا اور آنکھوں والوں کے لیے مشعلِ راہ بن گئیں

خالد ارشاد

میں نے جونہی گارڈن فیصل آباد کے اقبال اسٹیڈیم کی سڑک پر بائیں ہاتھ موڑی، تو سامنے النیصل مرکز برائے نابینا کی عمارت استادہ نظر آئی۔ میں بصارت سے محروم طالبہ صائمہ گلزار اور اس کی سہیلی سمیرا کنول کی روداد زیست اور منزل سے ہمکنار کرانے میں کاروان علم فاؤنڈیشن کے کردار کے حوالے سے ان کے جذبات و احساسات سننے کی خاطر جس قدر بے تاب تھا، اتنا ہی اس درسگاہ کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا جہاں بصارت سے محروم ہونے والوں کی ہتھیلی پر امید کا چراغ رکھا اور انھیں علم کی روشنی سے منور کیا جاتا ہے۔ یہ درس گاہ اعزاز رکھتی ہے کہ وہاں سے علم کی روشنی پانے والوں نے زیست کے اندھیروں میں کبھی ٹھوکر نہیں کھائی۔

بینائی سے محروم افراد کو علم و ہنر سے آراستہ کرنے والا یہ ادارہ ایک عظیم انسان، کیپٹن مشیت الرحمن ملک نے قائم کیا ہے۔ میں دیوار پر لگی ان کی تصویر دیکھ رہا تھا کہ مجھے صائمہ گلزار آتی دکھائی دی۔ ان کی چال میں وہی اعتماد اور چہرے



پر دلنواز مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے۔

صائمہ گلزار نے بڑے پرتپاک انداز سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور کاروان علم فاؤنڈیشن کے دیگر کارکنان کی خیریت دریافت کرتی رہی۔ وہ ان دنوں کسی سرکاری یا نجی ادارے میں موزوں ملازمت کی متلاشی ہے۔ اس باہمت لڑکی نے ملازمت کے انتظار میں گھر بیٹھنے کے بجائے اپنی مادر علمی میں بلامعاوضہ خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ اب صائمہ گلزار الفیصل مرکز میں اپنے جیسے نابینا طلبہ و طالبات کو خودمختار اور فعال زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتی ہے۔ میرے استفسار پر اپنے عزم سے زیست کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے والی لڑکی نے بتایا:


صائمہ گلزار

''میرا تعلق فیصل آباد کی ایک پسماندہ بستی کے سفید پوش گھرانے سے ہے۔ میرے والد کریانہ اسٹور چلا کر گھریلو اخراجات پورے کرتے ہیں۔ چار سال کی عمر میں مجھے ٹائیفائیڈ بخار ہو گیا تھا جس کا اثر میری بینائی پر پڑا۔ میری بیماری کی بروقت تشخیص نہ ہو سکی اور والدین بھی غربت کی بنا پر مناسب علاج نہ کروا سکے۔

''جب مرض بڑھ گیا، تو میو اسپتال لاہور میں میرا علاج ہوا۔ ایک سال بعد میری طبیعت تو سنبھل گئی لیکن میری بصارت جاتی رہی۔ میں اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھی لہٰذا والدین نے مجھے گھر پر قرآن حفظ کروانے کا انتظام کر لیا۔ میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی کہ ایک دن میرے دادا ریڈیو پر پروگرام سن رہے تھے۔ اس میں الفیصل مرکز برائے نابینا کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسی وقت والدین سے اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔''

''میرے اصرار پر مجھے مرکز میں داخل کروا دیا گیا۔ میں نے وہاں ایک سال میں دو جماعتیں پڑھیں اور میٹرک کا امتحان فیصل آباد بورڈ سے پاس کیا۔ میں سائنس مضامین پڑھنا چاہتی تھی لیکن بصارت سے محرومی میری خواہش کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔''

''میں نے پھر گورنمنٹ کالج برائے خواتین، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد میں ایف اے میں داخلہ لیا۔ شروع میں میری بہن کالج میں میری مدد کے لیے موجود رہی۔ پھر میری ہم جماعت لڑکیوں سے دوستی ہو گئی۔ وہ اتنی اچھی اور مددگار تھیں کہ چار سال تک مجھے پڑھائی کے حوالے سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

''میری سہیلیاں مجھے سبق ریکارڈ کر دیتیں جسے میں یاد کر لیتی۔ وہ پڑھائی کے بعد بھی مجھے مختلف مضامین پڑھ کر سناتی تھیں۔ جو مضمون مشکل ہوتا، اس کا خلاصہ وہ اپنی آواز میں مجھے ریکارڈ کر دیتیں۔

''نصابی کتب کے علاوہ میری سہیلیاں جو اچھی کتاب پڑھتیں، وہ مجھے بھی پڑھ کر سناتیں۔ یوں کالج میں چار برس تعلیم پاتے ہوئے میں نے نصابی کتب کے علاوہ ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ بینائی سے محروم سمیرا کنول بھی میری ہم جماعت تھی۔ پورے کالج میں ہم دونوں طالبات ہی نابینا تھیں۔ اگر ہمیں مددگار سہیلیاں اور شفیق اساتذہ نہ ملتے تو شاید ہم چند دن بھی کالج میں گزار نہ پاتیں۔

''گریجوایشن کرنے کے بعد ہم دونوں نے پنجاب یونیورسٹی سے سپیشل ایجوکیشن میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری اس خواہش کے سامنے تین رکاوٹیں حائل تھیں۔ پہلی یہ کہ ہم نابینا تھیں۔ دوسری یہ کہ لڑکی ہونے کے باعث دوران تعلیم ہمیں مخصوص مشکلات آ سکتی تھیں۔ تیسری رکاوٹ یہ کہ

پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے وسائل ہم دونوں کے اہل خانہ فراہم نہیں کر سکتے تھے۔

"اس مرحلے پر عامر کمالوی نے ہماری ہمت بڑھائی۔ عامر کمالوی کا پورے پاکستان میں نابینا طلبہ سے رابطہ ہے اور وہ انھیں ہر ممکن مدد اور راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے والدین کو قائل کیا اور ہمیں بتایا کہ اگر ہمارا داخلہ پنجاب یونیورسٹی میں ہو گیا، تو لاہور کے ادارے، کاروان علم فاؤنڈیشن سے ہمیں تعلیمی ضروریات پوری کرنے کی خاطر وظیفہ مل جائے گا۔

"ہم دونوں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ چند دن بعد کاروان علم فاؤنڈیشن کے دفتر میں وظیفے کے سلسلے میں جانا ہوا۔ وہاں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور دیگر منتظمین سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی۔ کاروان نے دو سال تک ہمیں ہر تعلیمی ضرورت کے لیے مالی مدد فراہم کی اور یوں ہم نے اپنے خوابوں کی تعبیر پالی۔"

صائمہ گلزار نے آخر میں حکومت سے درخواست کی کہ سرکاری محکموں میں نابینا افراد کے لیے خصوصی کوٹا مقرر کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ جسمانی طور پر معذور افراد محدود نوعیت کی خدمات انجام دیتے لیکن نابینا افراد بے شمار خدمات بطریق احسن ادا کر سکتے ہیں۔

صائمہ گلزار سے ملاقات کے بعد میری منزل عارف والا تھی جہاں اس باہمت لڑکی کی سہیلی سمیرا کنول کا گھر واقع ہے۔ یہ لڑکی بھی ہمارے معاشرے کا ایک روشن ستارہ ہے۔ اس نے نامساعد حالات، پسماندگی، بینائی سے محرومی اور صنف نازک ہونے کے باوجود علم کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ عبور کی اور ایک تندرست اور فعال انسان کی طرح ایم اے تک تعلیم پائی۔

فیصل آباد سے عارف والا جاتے ہوئے میں یہ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ ایک نابینا لڑکی صرف حصول علم کی خاطر کئی برس تک اتنا طویل سفر عوامی ٹرانسپورٹ پر طے کرتی رہی۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ دوران سفر انسان کو کئی طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس بہادر لڑکی نے تمام تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

عارف والا میں سمیرا کنول اور دیگر افراد خانہ نے مسکراتے چہروں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ محبت اور اپنائیت بھرا ماحول پا کر سخت گرمی میں خستہ حال شاہراہ کے سفر کی تکان اتر گئی۔ میں نے ہنستی مسکراتی سمیرا کنول سے روداد زندگی سنانے کی درخواست کی، تو وہ پُراعتماد لہجے میں بولی:

"میرا آبائی تعلق ضلع فیصل آباد کے ایک نواحی گاؤں سے ہے۔ جب میں ایک سال کی تھی، تو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہم بہن بھائیوں کی پرورش کی ذمے داری میری والدہ کے کندھوں پر آ گئی۔ میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی اور میں تیسری جماعت میں پڑھ رہی تھی جب مجھے ٹائیفائیڈ بخار ہوا۔ اس بیماری نے مجھے بینائی سے محروم کر دیا۔ میری والدہ نے بساط بھر علاج کروایا لیکن میری بینائی نہ لوٹی۔

میں وہ تلخ لمحات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی جب میری زندگی میں اندھیرے لکھ دیے گئے۔ میں روز تیار ہو کر اسکول جاتی، کتابیں پڑھتی اور سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی۔ لیکن بینائی جاتے ہی میں جیتے جی مر گئی۔ مایوسی اور دکھ کے گہرے اندھیروں نے مجھے گھیر لیا۔ میرا کم سن ذہن بے بسی اور بے کسی کے دکھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اگر میری والدہ مجھے زندگی گزارنے کا قرینہ نہ سکھاتی، تو شاید میں زندہ نہیں رہ پاتی۔

"میری والدہ نے مجھ میں آگے بڑھنے کی تڑپ پیدا کی۔ بڑی بہنوں نے بھی میرا حوصلہ بڑھایا۔ ایک سال مجھے فیصل آباد میں الفیصل مرکز برائے نابینا میں داخل کروا دیا گیا۔ میری امی فکرمند تھیں کہ وہاں میری دیکھ بھال اور مدد کون کرے گا؟ خوش قسمتی سے ادارے میں مجھے مددگار

اساتذہ اور بہترین سہیلیاں مل گئیں۔

چند دن بعد صائمہ گلزار سے دوستی ہوئی جو آج بھی برقرار ہے۔ میں نے اس ادارے سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج برائے خواتین مدینہ ٹاؤن میں داخلہ لے لیا۔ الفیصل مرکز میں تمام طلبہ و طالبات نابینا تھیں، اس لیے کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ لیکن کالج میں ابتدا ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

بعض اوقات لڑکیاں کوئی ایسی ناخوشگوار بات کر دیتیں جس سے دل دکھی ہو جاتا۔ لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ بلکہ طالبات کو اس بات کا شعور دینے کا فیصلہ کیا کہ ایک معذور فرد کے احساسات کیا ہوتے ہیں اور انھیں کس طرح کے رویے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصے بعد ہماری لڑکیوں سے دوستیاں ہو گئیں۔ میں ہاسٹل میں رہتی تھی اور میری سہیلیاں مجھے ہر طرح کی مدد فراہم کرتیں۔



سمیرا کنول

''کالج میں، میں نے ہر طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ کھیلوں میں شریک ہوئی۔ کالج تقریبات میں نعت پڑھتی رہی۔ تفریحی دوروں پر بھی ہم دونوں کا جانا ہوا۔ ہمارا طرزِ عمل مسلسل صحت مند لڑکیوں کے مانند رہا۔ ہم نے اپنے رویے سے کالج کی لڑکیوں کو یہ پیغام دیا کہ بینائی سے محرومی کے باوجود نابینا فعال فرد کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔

''جن دنوں میں گریجوایشن کے آخری سال میں تھی تو میری دوسری بہن کی شادی ہو گئی۔ چناں چہ والدہ اکیلی رہ گئیں۔ تب میری بڑی بہن رفعت انھیں عارف والا اپنے پاس لے آئی۔ گریجوایشن کے بعد میں بھی ان کے پاس رہنے لگی۔ کچھ عرصہ قبل میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اب میں اپنی بہن کے گھر رہ رہی ہوں۔ گریجوایشن کے آخری دنوں میں ہمیں عامر کمالوی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اسپیشل ایجوکیشن کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے صائمہ کے ساتھ داخلہ لیا اور ہاسٹل میں رہائش پذیر ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد ہمیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

''میری پڑھائی و دیگر ضروریات کی ذمے داری میرے بہنوئی محمد شہزاد نے اٹھا رکھی تھی۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں کلرک ہیں۔ ان کی محدود آمدنی سے میرے تعلیمی اخراجات پورے ہونا ممکن نہیں تھے۔ چناں چہ عامر کمالوی نے ہمیں کاروانِ علم فاؤنڈیشن کے بارے میں بتایا۔ ہم نے اس علم دوست ادارے سے رابطہ کیا، تو ہمیں دو سال تک تمام تعلیمی ضروریات کے لیے مالی اعانت ملتی رہی۔''

سمیرا کنول کی بہن رفعت اور بہنوئی محمد شہزاد نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم اسے اپنی بڑی بیٹی سمجھتے ہیں اور یہ ہمارے لیے بالکل بوجھ نہیں۔ ہم کاروانِ علم فاؤنڈیشن کے بھی شکر گزار ہیں کہ ان کی مدد سے سمیرا کنول نے ایم۔اے کی تعلیم مکمل کر لی۔ اللہ نے چاہا، تو بہت جلد اسے ملازمت مل جائے گی اور اسے اچھا سا جیون ساتھی بھی ملے گا۔ سمیرا کنول اب مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی بھانجی عینیہ اس کی دوست اور مددگار ہے۔ محمد شہزاد کے گھر ہر فرد نے ہمیں احترام اور محبت سے نوازا۔ اعلیٰ اخلاقیات کے حامل اہلِ خانہ سے ملاقات کی خوش گوار یادیں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔

واپسی کے سفر میں ان گنت سوچوں نے میرا احاطہ کیے رکھا۔ میں سوچتا رہا کہ ایک عورت جب بینائی سے محروم ہو تو راہ میں آنے والی مشکلات کے سبب اس کی زندگی بہت کٹھن

ہو جاتی ہے۔ لیکن صائمہ گلزار اور سمیرا کنول نے ہمت نہیں ہاری، مسائل کا بہادری سے مقابلہ کیا، اعلیٰ تعلیم پائی اور دیگر معذوروں کے لیے روشن مثال بن گئیں۔ اگر حکومت انھیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق روزگار فراہم کر دے اور دونوں کو دردمند دل رکھنے والے شریک حیات نصیب ہو جائیں، تو انھیں جدوجہد کا ثمر مل جائے گا۔

کاروان علم فاؤنڈیشن یتیم اور خصوصی طلبہ کو ترجیحی بنیادوں پر وظائف جاری کرتی ہے۔ اس ادارے نے قومی تاریخ میں ایک اور اہم کام یہ کیا ہے کہ جن نابینا طلبہ نے بریل پر تعلیم حاصل کی تھی، ان میں سے تین نوجوانوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی نے تعلیمی اداروں میں تعلیمی اخراجات معاف کروانے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔

کاروان علم فاؤنڈیشن نے حکومت پنجاب کو پیش کش کی ہے کہ اگر حکومت خصوصی طلبہ کے تمام اخراجات معاف کر دے، تو انھیں خرچ طعام اور دیگر ضروریات کے لیے وظیفہ وہ فراہم کرے گی۔ کاروان علم کی جہد مسلسل سے آج الحمدللہ صوبہ پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخوا میں خصوصی طلبہ کے لیے مخصوص تمام تعلیمی اداروں میں تعلیمی اخراجات معاف ہو چکے۔ صوبہ سندھ اور بلوچستان میں بھی کوششیں جاری ہیں۔ امید ہے جلد ان صوبوں میں بھی خصوصی طلبہ کے لیے تعلیمی اخراجات معاف کروا لیے جائیں گے۔

مالی مشکلات سے دوچار افراد کے علاوہ جسمانی معذوری کے شکار افراد کی فلاح و بہبود کے لیے معاشرے کو بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ مخیر مرد وزن ان کی امداد کرتے رہتے ہیں، مگر اس کار خیر میں تیزی آنی چاہیے۔

پچھلے تیرہ برس سے کاروان علم فاؤنڈیشن غریب اور معذور طلبہ و طالبات کی دامے درمے سخنے مدد کر رہی ہے۔ اس دوران ادارے سے منسلک تمام لوگوں کی یہی سعی رہی کہ طالب علم کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچائی جائیں۔ امید ہے کہ ہماری خدمات کو ہم وطنوں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پذیرائی ملے گی۔

◆◆●

روشنی کا مینار

کاروان علم فاؤنڈیشن اپنے قیام سے لے کر آج تک 161 معذور طلبہ و طالبات کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے میں مالی اعانت فراہم کر چکی۔ ان میں 122 لڑکے اور 39 لڑکیاں شامل ہیں۔ کاروان علم فاؤنڈیشن کی مجموعی کارکردگی بھی قابل رشک ہے۔ اب تک مختلف شعبوں میں کل 4713 طلبہ و طالبات کو کروڑوں روپے کے وظائف جاری کیے جا چکے۔

کاروان علم فاؤنڈیشن نے مجموعی طور پر اب تک ایم بی بی ایس کے 1098، ڈی فارمیسی کے 80، فزیوتھراپی کے 40، بی ڈی ایس کے 46، ڈی وی ایم کے 107، ایم ایس سی کے 122، ایم اے کے 113، ایم بی اے کے 53، ایم کام کے 36، بی ایس سی انجینئرنگ کے 1270، بی کام آنرز کے 147، بی ایس آنرز کے 514، ایل ایل بی کے 12، بی بی اے آنرز کے 40، بی اے آنرز کے 35، بی اے کے 66، بی ایڈ/ بی ایس ایڈ کے 26، ڈپلوما ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کے 142، بی ٹیک/ بی ٹیک آنرز کے 19، ایف ایس سی/ ایف اے کے 530، آئی سی ایس/ آئی کام کے 59، میٹرک/ انڈر میٹرک کے 121 طلبہ و طالبات کو وظائف جاری کیے۔ علم کی جستجو میں گامزن جوہر قابل کو منزل سے ہم کنار کرنے کے لیے کاروان علم فاؤنڈیشن اپنا کردار ادا کر رہی ہے اور ان شاء اللہ نبھاتی رہے گی۔

یہ ۳۲۶ قبل مسیح کی بات ہے، یونانی حکمران اسکندر اعظم پنجاب کے راجا پورس کو شکست دے کر دریائے بیاس (ستلج) کے کنارے پہنچا۔ وہ اب دہلی اور کلکتہ کی سمت بڑھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی فوج نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا۔ یونانی فوجی اب وطن واپس پہنچ کر اپنے بیوی بچوں اور رشتے داروں سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی ضد کے آگے آخرکار اسکندر اعظم کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ واپس فارس (ایران) کی جانب چل پڑا۔

اس نے دریائے سندھ کے کنارے سفر طے کیا اور آخرکار بحیرہ عرب تک جا پہنچا۔ وہاں ساحل سمندر پر اس نے "اسکندریہ" نامی شہر آباد کیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ یہی شہر بعدازاں "ٹھٹھہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

اسکندریہ رک کر اسکندر اعظم نے آدھی فوج تو بحری جہازوں کے ذریعے ایران بھجوا دی۔ خود وہ باقی ماندہ فوج لیے "صحرائے گیڈروسیا" (Gedrosia) کی طرف بڑھا جسے فارسی میں "گدروزی صحرا" کہتے ہیں۔ تب اسکندر اعظم کو خبر نہ تھی کہ اس سفر کے ذریعے وہ شامت اعمال کو دعوت دے رہا ہے۔

دراصل صحرائے گدروزی میں خوراک تھی نہ پانی، چناں چہ یونانی فوج عجیب مشکل میں پھنس گئی۔ اوپر سے موسم بھی بے رحم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساٹھ دن بعد جب اسکندر اعظم

پاکستان میں معاشی انقلاب لانے والی

چین کی نئی شاہراہ ریشم

تجارت کے محفوظ اور مختصر راستے کی کھوج چینیوں کو تاریخی مقام، گوادر لے آئی

از صارم



صحرا پار کر کے ایران پہنچا تو اس کی آدھی سپاہ ہلاک ہو چکی تھی۔ نیز بہت سارا سامان بھی راستے کی صعوبتوں کی نذر ہوا۔ مورخین صحرائے گدروزی میں سفر کے فیصلے کو اسکندر اعظم کی ایشیائی مہم میں سب سے بڑی غلطی قرار دیتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ تقریباً ڈھائی ہزار سال گزرنے کے بعد دنیا کی ایک اور قوم... چینی بھی صحرائے گدروزی پار کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن ان کے پاس اونٹ یا گھوڑے نہیں بلکہ بلڈوزر اور دیگر دیوہیکل مشینری ہے۔ اس سے وہ صحرائے گدروزی یعنی آج کے مکران میں ریل پٹری، سڑک اور پائپ لائنیں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے، گوادر بندرگاہ کا نام بھی گدروزی ہی سے نکلا ہے۔

چینی حکومت کو یہاں ایک اہم ضرورت گوادر کھینچ لائی۔ چین میں استعمال ہونے والا ۸۰ فیصد تیل بحری جہازوں کے ذریعے آبنائے ملاکا (جنوب مشرقی ایشیا) سے گزرتا ہے۔ نیز مشرق وسطیٰ، یورپ اور افریقا سے چین کی بیشتر تجارت بھی اسی راستے سے ہوتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جیسے چین عسکری و معاشی طاقت بنتا جا رہا ہے، سپر پاور بن رہا ہے، امریکا سے اس کے تصادم کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ اور امریکا کے طیارہ بردار اور جنگی بحری جہاز اکثر آبنائے ملاکا میں رہتے ہیں۔ مزید برآں چین کے مخالف ملک، تائیوان کی طاقتور بحریہ دوران جنگ آبنائے ملاکا کی ناکہ بندی کر کے چینی معیشت کو مفلوج کر سکتی ہے۔ اس لیے چینی حکومت ایسے محفوظ زمینی راستے کی تلاش میں سرگرم تھی جس پر امریکی یا تائیوانی بحریہ اس پر وار نہ کر سکے۔ اسی تلاش کے نتیجے میں گوادر تا کاشغر کا زمینی راستہ سامنے آیا۔

یہ راستہ محفوظ ہی نہیں تھا، بلکہ مختصر بھی۔ ان خصوصیات نے گوادر کو چینی قوم کی نگاہوں میں مزید ممتاز بنا دیا۔

فی الوقت کویت، متحدہ عرب امارات یا قطر سے چلنے والا ٹینکر یا مال بردار بحری جہاز بحر ہند سے ہوتے، بحرالکاہل پہنچتا اور پھر آخری منزل، چینگ وا پر مسکن بناتا ہے۔ اس راستے کی طوالت تقریباً ۱۳ ہزار کلومیٹر ہے۔

دوسری طرف یہی ٹینکر یا مال بردار بحری جہاز گوادر پر لنگر انداز ہو تو وہاں سے تیل یا سامان محض چھے ہزار کلومیٹر کا راستہ طے کر کے چینگ پہنچتا ہے۔ یوں کم از کم سات چھے ہزار کلومیٹر کی بچت ہوتی ہے۔ گوادر کی اسی افادیت کے باعث چین نے اگلے چالیس برس تک اس بندرگاہ کا انتظام سنبھال لیا۔

یہی نہیں، ماہ اپریل ۲۰۱۵ء میں چینی صدر شی جن پنگ پاکستان آئے، تو اس موقع پر گوادر تا کاشغر شاہراہ بنانے، تیل کی پائپ لائن بچھانے، ریل کی پٹڑیاں تعمیر کرنے اور فائبر آپٹکس تاریں بچھانے کا اعلان ہوا۔ ان منصوبوں پر ۴۵ ارب ڈالر کا زرکثیر خرچ ہوگا۔ یہ تمام منصوبے چینی کمپنیاں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گی، مگر ان میں پاکستانی ہنرمند و کارکن بھی کام کر سکیں گے۔ یوں ہزارہا پاکستانیوں کو روزگار میسر آئے گا۔

یاد رہے، ماضی میں کاشغر تا دیبل اور بھنبھور مشہور زمانہ شاہراہ ریشم کا اہم راستہ تھا۔ اسی راستے کے ذریعے چینی مشرق وسطیٰ اور افریقا سے بحری تجارت کرتے۔ اب یہ تاریخی راستہ بڑا مختلف ہو چکا کہ دور جدید میں یہ گوادر تا کاشغر کی شکل میں ڈھل گیا۔ واضح رہے، زمانہ قدیم کی شاہراہ ریشم چار بڑے زمینی اور پانچ بحری راستوں پر مشتمل تھی۔

پاک چین اقتصادی راہداری کی تکمیل سے دونوں ممالک کی معیشت کو زبردست فائدہ پہنچے گا۔ چینی اس قابل ہو جائیں گے کہ گوادر کے راستے مشرق وسطیٰ، افریقا اور یورپ سے باآسانی تجارت کر سکیں۔ جبکہ پاکستانی حکومت کو ٹیکسوں کی مد میں اچھی خاصی آمدن ہوگی۔ مزید برآں وہ بین الاقوامی تجارتی مرکز بننے کے باعث خطے کا اہم ملک بن جائے گا۔ تب بھارتی حکمران چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوگی کہ پاکستان کے

خلاف خفیہ سازشیں کر سکے۔ پاکستان پر حملے کی صورت میں اسے سپر پاور، چین کا بھی مقابلہ کرنا پڑے گا۔

یاد رہے، چین بھارت کا بڑا تجارتی ساتھی ہے۔ لیکن پاکستان کا شدید مخالف بھارتی حکمران طبقہ کبھی نہیں چاہے گا کہ پاک چین اقتصادی راہداری کی تعمیر سے یہ مسلم ملک معاشی طور پر خوشحال ہو جائے۔ اسی لیے ''را'' کے ایجنٹ طالبان یا شدت پسندوں کے بھیس میں اس راہداری کی تنصیبات پر حملے کر سکتے ہیں۔ اسی خطرے کے پیش نظر حکومت پاکستان نے چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کا نیا ڈویژن قائم کیا۔ اس نئے ڈویژن میں دس ہزار فوجی جوان شامل ہوں گے۔ امید ہے کہ پاک فوج کے زیر سایہ پروجیکٹ کے تمام مراحل بخیر و خوبی انجام پائیں گے۔

چینی کمپنیاں پاکستان میں ہوا، کوئلے، گیس اور شمسی توانائی سے چلنے والے بجلی گھروں میں سرمایہ کاری کریں گی۔ یہ بجلی گھر تکمیل کے بعد ''۱۸ ہزار میگا واٹ'' بجلی پیدا کریں گے۔ یوں اگلے چار پانچ سال بعد پاکستان میں لوڈشیڈنگ بہت کم ہو جائے گی۔

چین ایٹمی ری ایکٹر لگانے میں بھی ہماری مدد کر رہا ہے۔ چین کی مدد سے ۲۰۲۳ء تک مزید چار ایٹمی ری ایکٹر تعمیر ہوں گے۔ جبکہ چار مزید پائپ لائن میں ہیں۔ گویا ۲۰۳۰ء میں یہ ایٹمی ری ایکٹر تقریباً ''آٹھ ہزار میگا واٹ'' بجلی بنا رہے ہوں گے۔

خیال ہے کہ ۲۰۲۰ء تک گوادر تا کاشغر راستہ مکمل طور پر کھل جائے گا۔ یوں چینیوں کو موقع ملے گا کہ وہ کم وقت اور کم اخراجات میں آزادی کے ساتھ عالمی تجارت کر سکیں اور یہی فوائد مدنظر رکھ کر انھوں نے گوادر کو اپنا مستقر بنایا۔

امریکا کی مشہور درس گاہ جان ہوپکنز یونیورسٹی سے پروفیسر فریڈرک ستار بطور ماہر سیاسیات وابستہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''پاک چین اقتصادی راہداری نہایت تزویراتی

سفیان ثوریؒ کے اقوال

☆ بدترین ہے وہ عالم جو امیروں اور بادشاہوں کا مصاحب بنے اور بہترین ہے وہ بادشاہ جو اہل علم کی صحبت اختیار کرے۔

☆ میں امرا کے ہاں جانے سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ میری آؤ بھگت کرنے لگیں، تو میں ان کی طرف مائل نہیں ہو جاؤں اور میرے سارے اعمالِ خیر ضائع نہ ہو جائیں۔

☆ دنیا کو جسم کی خاطر اختیار کرو اور آخرت کو دل کے لیے۔

☆ تواضع کا نتیجہ سلامت اور غرور کا نتیجہ ندامت ہے۔

(انتخاب: اصدق امین، اسلام آباد)

(Strategic) اہمیت رکھتی ہے۔ راہداری کی تکمیل کے بعد چین اس قابل ہو جائے گا کہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرق وسطی، افریقا اور یورپ تک رسائی حاصل کر سکے۔ اسی لیے اگلے بیس برس میں ''پاک چین اقتصادی راہداری'' چینیوں کے لیے اہم ترین تجارتی راستہ بن جائے گا۔

یاد رہے، چین روزانہ ۶۳ لاکھ بیرل تیل مشرق وسطی سے منگواتا ہے۔ بحری جہازوں کے ذریعے یہ تیل منگوانے پر وہ ایک کروڑ اسی لاکھ ڈالر خرچ کرتا ہے۔ لیکن یہی تیل اگر گوادر کے ذریعے چین تک پہنچے، تو ایک کروڑ ڈالر خرچ ہوں گے۔ یوں چینی حکومت روزانہ ۸۰ لاکھ ڈالر زرکثیر کی بچت کر سکے گی۔

اس سے بھی بڑا فائدہ یہ ہے کہ چین اپنا آدھی مصنوعات یورپ بھجواتا ہے۔ گوادر کے مختصر راستے سے سامان افریقی ممالک بھجوانے پر اخراجات کم آئیں گے۔ یوں چینی برآمدات کے سلسلے میں بھی رقم کی خاصی بچت ہوگی۔

◆◆◆

”حمید بھئی! بروز اتوار ارباب کو ساتھ لے کر صبح سویرے میرے گھر آ جانا۔ ناشتا اکٹھے ہی کریں گے۔“ دراصل میں نے اپنے کمرے کی ”سیٹنگ“ بدلنی ہے۔ خدیجہ آپی نے فون پر حکم دیا تو میں نے فوراً ہامی بھر لی۔

خدیجہ آپی کی شادی کو چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ وہ اتنی جلد اپنے سسرال میں گھل مل گئیں جیسے اپنے ہی خاندان میں بیاہی ہوں۔ ساس، سسر، نندیں، دیور بھی عزیز و اقارب خدیجہ آپی کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ وہ خاص طور پر بڑے بھائی کے [illegible] سے پوچھتے ”دلہن کہاں سے ڈھونڈ کے لائے ہو؟ بڑی سگھڑ اور پیاری ہے۔“ وقاص بھائی اپنی شریک حیات کو پا کر بہت خوش اور اپنی قسمت پر نازاں تھے۔

صوم و صلاۃ اور ”رسم و رواج“ کا پابند یہ خاندان لاہور کی قدیم آبادی لوہاری گیٹ میں سکونت پذیر ہے۔ اس علاقے میں مغلیہ دور کی کئی عمارتیں آج بھی ماضی کے طمطراق اور روپ میں استادہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر مغلیہ دور کی شان و شوکت یاد آنے لگتی ہے۔

میں نے خالہ زاد ارباب کو فون پر مطلع کیا کہ اتوار کے دن خدیجہ باجی کے ہاں جانا ہے، تیار رہنا۔ میں نماز فجر کے بعد تمھیں لینے آؤں گا۔ ارباب مجھ سے ایک دو سال چھوٹا لیکن جسمانی طور پر خاصا طاقتور ہے۔ اسی لیے خدیجہ آپی نے اسے

ایک پاکستانی کی فریاد

مجھے توہمات کی لعنت سے بچاؤ

اوٹ پٹانگ رسم و رواج میں گرفتار ہم وطن قرآن و سنت سے راہنمائی کیوں نہیں لیتے؟

[illegible]



بھی ساتھ لانے کو کہا تھا۔

صبح سات بجے ہم دونوں اکبری دروازے کی گنجان آبادی میں مغلیہ طرز پر بنے ایک شاندار چار منزلہ مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ شاد باغ کے سرسبز و شاداب اور کشادہ علاقے میں پلی بڑھی خدیجہ کو قسمت اندرون شہر کی پیچ در پیچ تنگ و تاریک گھر بار والی گلیوں میں لے آئی تھی۔ میں نے دروازے پر نصب گھنٹی بجانے کے بجائے خدیجہ آپی کو فون کیا تو انھوں نے تیسری منزل کی بالکونی سے ہمیں دیکھ دروازے کی زنجیر کھینچ دی۔ بالائی منزلوں میں ایسی زنجیر یا رسی بندھی ہوتی ہے جو نیچے کی جانب دروازے سے کھینچی جائے تو مہمان کے لیے گھر کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو خدیجہ آپی کے سوا تمام اہل خانہ سوئے ہوئے تھے۔

وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ڈبل بیڈ سنگھار میز فولادی الماری اور ایل سی ڈی کے علاوہ دیوار میں نصب چھوٹی موٹی چیزیں اس کمرے کا کل اثاثہ تھیں۔

خدیجہ باجی نے پاس پڑی کسی ہتھوڑی اور پیچ دار کس وغیرہ کا بندوبست پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ یہ اوزار ہمارے سامنے رکھ کر انھوں نے پلنگ کی جگہ سنگھار میز اور اس کی جگہ فولادی الماری رکھنے کو کہا البتہ ایل سی ڈی کی وہی جگہ متعین رہتی۔

ارباب اور میں مزدوروں کی طرح جت گئے۔ بھاری بھرکم گدے اٹھا ایک طرف رکھے اور پلنگ کے پیچ کھول اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر سنگھار میز خالی کر اسے بھی اپنی جگہ سے سرکایا۔ الماری جو کپڑوں اور دیگر اشیا سے لدی ہوئی تھی خالی کر ڈالی۔

خدیجہ آپی چھوٹا موٹا سامان اٹھا کر ادھر ادھر رکھتی رہی۔ اتنا سا کام کرنے ہی سے توانائی کمی محسوس ہوئی۔ وہ تو بھلا ہو خدیجہ باجی کا کہ انھوں نے بنا کہے ناشتہ تیار کر دیا... انڈوں کا آملیٹ حلوہ پوری سبز چائے اور دیسی گھی کے پراٹھے۔ مزا آ گیا۔ کھا کر توانائی کچھ دوبارہ بحال ہوئی۔ اب ہم پلنگ دوسری جانب رکھ کے جوڑنے لگے تو خدیجہ آپی کہنے لگیں ''ابھی ٹھہرو، میں اماں جان (ساس صاحبہ) کو بلا لاؤں تاکہ وہ بھی رائے دے دیں۔''

ارباب اور میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ یہ بات تھی تو پہلے ہی انھیں بلا لیتیں۔ خیر ہم دونوں اُن کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں خدیجہ آپی کی ساس کمرے میں آ گئیں اور سارا منظر دیکھ کر ماتھا پکڑ لیا۔ کہنے لگیں ''ارے پلنگ یہاں ہرگز نہیں رکھنا۔ اس جگہ کبھی کنواں ہوا کرتا تھا جسے ملبہ ڈال کر بند کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ کنویں کے اوپر چارپائی بچھانا اچھا شگون نہیں۔ یہ فوراً ہٹاؤ یہاں سے اور اسی جگہ رکھو۔''

ارباب اپنی محنت رائگاں جاتی دیکھ کر غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ کہنے لگا ''خالہ جان! یہ ہندوانہ باتیں ہیں، اسلام کا ایسی ''توہم پرستی'' سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتیں خدیجہ آپی نے خوشدلی سے اُن کی بات مان لی اور ہمیں آنکھوں کے اشارے سے سامان ویسے ہی رکھنے کو کہا۔ الٹے بھائی قریب کھڑے یہ سب دیکھ اور سن رہے تھے۔ ارباب کو توقع تھی کہ وہ ضرور کوئی مداوا کریں گے اور ہماری محنت رائگاں نہیں جانے گی۔ لیکن ان کی خاموشی سے عیاں تھا کہ وہ بھی ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ناچار ارباب اور میں دل ہی دل میں مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔ سامان لیے اکبری دروازے کی پیچ در پیچ جو گلی سے نکلے تھے کسی کے گھر کی راہ لی۔ راستے میں ارباب کا موضوع سخن ''توہم پرستی'' ہی رہا۔ اس کا زور اس بات پر تھا کہ شادی بیاہ خوشی غمی کی تقریبات اور حتیٰ کہ روزمرہ زندگی میں بھی ہندوانہ رسوم ہمارا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہیں۔ خدیجہ باجی کی ساس تو کنویں کی بات کر رہی ہیں لوگوں نے قبروں کے اوپر مکان بنا رکھے ہیں۔ لاہور کے قدیم علاقے مزنگ اور بیگم پورہ میں کئی مکان قبروں پر استادہ ہیں اور مکین ان میں بلاخوف و خطر رہ رہے ہیں۔

آج بھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر کی منڈیر پر کوا کائیں کائیں کرے تو مہمان آتا ہے۔ خاتون خانہ کے ہاتھ سے روٹی پکاتے ہوئے پیڑا گر جائے تو

گھر میں کوئی نہ کوئی مہمان آتا ہے۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ اتفاق سے ایسا ہو بھی جائے تو "کوے" اور "پیڑنے" کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کسی کام سے نکلے اور کالی بلی سامنے سے گزر گئی تو سمجھو کہ بدشگونی ہے لہٰذا جس مقصد کے لیے نکلے ہیں اُسے ملتوی کر دیں ورنہ جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔

روزمرہ زندگی کے کئی معاملات ایسے ہیں جن کا ایسی خرافات سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ مثلاً دلھن گھر داخل ہونے لگی تو بڑی بوڑھیاں باقاعدہ اسے روک کر پہلے دلہیز میں تیل گرائیں پھر وہ بچاری دلہیز پھلانگتی۔ یہ خالصتاً ہندوانہ رسم ہے جو ہمارے گھرانوں میں بھی رواج پا چکی۔ ایسے ہی دلھن جب بابل کا گھر چھوڑ پیا گھر سدھارنے لگے تو خشک چاولوں یا گندم کے دانوں سے بھری تھالی اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے جس سے دلھن دونوں ہاتھوں میں اناج بھر اپنے سر سے اوپر پیچھے کی طرف پھینکتی ہے۔ کم از کم تین بار دہرایا جاتا ہے جو سراسر رزق کی بے حرمتی ہے اور کسی اجر و ثواب یا نیکی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ان رسم و رواج کے کچھ دلدادہ ایسے مواقع پر کبوتر بھی آزاد کرتے ہیں۔

اسی طرح جب دلھن امید سے ہو تو زچگی کے آخری ایام سے کچھ روز پہلے "گود بھرائی" کی رسم ادا کی جاتی ہے جس کا ہمارے دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس رسم کا بوجھ بھی لڑکی والے ہی برداشت کرتے ہیں۔ زچہ کی جھولی میں سات مختلف پھل رکھے جاتے ہیں جو وقفے وقفے سے زچہ کو کھانے پڑتے ہیں۔ ان پھلوں میں سے اگر زچہ بے دھیانی میں پہلے سیب کھا لے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے۔

خدیجہ آپی کو بھی اس رسم سے گزرنا پڑا۔ اس کی ساس نے سات پھلوں کے علاوہ سات سبزیاں بھی رکھوائیں۔ پھر دلھن کے تن کے کپڑے، زیور، پھل اور سبزیاں بھی ہتھیا لیں۔ آپی نے یہ کہہ کر بمشکل طلائی چوڑیاں ان سے بچائیں کہ یہ میری ماں نے

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کہا

☆ جو شخص احمق کی صحبت میں رہے وہ بھی احمق ہے۔
☆ صاحب کرامت کو کرامت چھپانے کا حکم ہے۔
☆ مخلوق کی طرف متوجہ ہونا اور حق تعالیٰ سے منہ موڑ لینا ہی دنیا ہے۔
☆ مومن کے گھر کی زمین اخلاص ہے اور اس کے گھر کی دیواریں اعمال ہیں۔
☆ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ دو قدموں سے طے ہو جاتا ہے، ایک قدم اپنے نفس سے اٹھانا اور دوسرا مخلوق سے۔
☆ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے قلب نہایت وسیع ہو جاتا ہے۔

(خزینۂ ادب، انتخاب: تنویر حسین، نارووال)

مجھے دی ہیں یہ میں نہیں دوں گی۔

اس طرح کی بے شمار توہمات عجیب و غریب وہموں اور منتوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً بائیں آنکھ پھڑکے تو کوئی حادثہ یا نقصان یقینی سمجھا جاتا ہے۔ رات کے کسی پہر گھر کی چھت یا صحن میں بلی رونے خواہ وہ بچاری سردی یا بھوک کی وجہ سے کرلا رہی ہو تو اسے بلا سے نحوست اور اہل خانہ میں سے کسی ایک کی موت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ پھر اس بلا کو ٹالنے کے لیے مزید لمبے سیدھے پاپڑ بیلتے ہیں۔

بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کھجلی ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ "لکشمی" آنے والی ہے۔ اگر دائیں ہاتھ میں ہو تو نقصان کی علامت گردانا جاتا ہے۔ پاؤں میں کھجلی ہو تو یہ سفر کی علامت ہے۔

اکثر لوگ گھروں میں لگے مکڑی کے جالے کو بھی نحوست سمجھتے ہیں حالانکہ ان کا نحوست سے نہیں البتہ صفائی اور دیگر مکینوں کے سلیقے سے تعلق ہے جو صفائی ستھرائی سے غفلت

برتتے ہیں۔

میرے ایک دوست کی ہمشیر کے ہونے والے سسرالی شادی کی تاریخ طے کرنے آئے۔ انواع اقسام کا کھانا تناول کرنے کے بعد لڑکی والوں نے چاند کی ۱۳ تاریخ کی نوید سنائی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرنے لگے۔ سسر صاحب جو اپنی زوجہ کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے فرمانے لگے ''چاند کی ۳، ۱۳، ۲۳، ۸، ۱۷ اور ۲۷ کے علاوہ کوئی بھی تاریخ رکھ لیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن چاند کی یہ تاریخیں ہرگز موزوں نہیں۔'' ناچار لڑکی والوں کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

اکثر گھروں میں بچوں کو آئینہ دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے کہ کسی کو چوٹ لگ جائے گی۔ گھر میں آئینہ یا کانچ کا کوئی برتن ٹوٹ جائے تو یہ بدشگونی ہوتی ہے۔ گھر میں کوئی خالی قینچی چلائے تو سمجھا جاتا ہے کہ لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا کریں گے۔ اس بات میں اگر ذرا سی بھی صداقت ہو تو حجاموں کی دکانوں پر روزانہ کئی نعشیں گری ہوئی ہوں۔

نظر بد سے بچنے کے لیے کئی ٹوٹکے آزمائے جاتے ہیں۔ مثلاً بچے کے گال پر یہ سوچ کر سرمے یا کاجل سے نشان لگایا جاتا ہے کہ کالا رنگ نظر کی کاٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح مکان تعمیر کرتے ہوئے چوکھٹ پر ''گانا'' باندھا جاتا ہے۔ اکثر یہ ''گانا'' مالک مکان کی بہن باندھتی اور بھائی سے سفید جوڑا اور نقدی وصول کرتی ہے چاہے وہ بیچارہ سیمنٹ کی بوریاں ادھار اٹھا کے لایا ہو۔ جب تعمیر مکمل ہو جائے تو ''گانے'' کی جگہ گھوڑے یا گدھے کی استعمال شدہ نعل نصب کی جاتی ہے۔ اکثر رکشوں، بیل گاڑیوں اور نجی بسوں کے پیچھے کالا پراندہ، گھسا ہوا چمڑے کا ٹکڑا یا کسی بچے کی جوتی لٹکی نظر آتی ہے۔ گاڑی والوں کے نزدیک یہ نظر بد اور حادثے سے بچنے کا ٹوٹکا ہے۔

رات آپ معمول کے مطابق سوئے۔ صبح بیدار ہوئے۔ جوتی پہننے گئے تو جوتیاں ایک دوسرے پر رکھی تھیں۔ لوجی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ موصوف کو جلد ہی کوئی سفر درپیش ہے۔ اکثر محفلوں میں دیکھا گیا ہے کہ گفت وشنید کے دوران کوئی نو وارد اس محفل میں آجائے تو اسے یہ کہہ کر (کہ ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا) لمبی عمر کی نوید سنائی جاتی ہے اور بعض تو آنے والے کو ''ابلیس'' کہہ دیتے ہیں کہ ابھی تمہارا ذکر کیا اور تم شیطان کی طرح حاضر ہو گئے......

مجھے وہ لڑکا نہیں بھولتا جو بھارتی فلموں اور ڈراموں کا دلدادہ تھا۔ ہر وقت کیبل پر فلمیں دیکھتا رہتا۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں کی مخصوص دھوتی اور اشنان کے علاوہ اس کی زندگی میں ہندی ثقافت رچ بس گئی۔ کچھ دنوں بعد اس کے والد وفات پا گئے۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو موصوف باپ کی ''چتا'' جلانے کے لیے ٹال سے چار من لکڑیاں اٹھا لایا۔ یہ دیکھ کر سب نے لعنت ملامت کی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بیچارا بھول چکا تھا کہ مسلمان مردے جلاتے نہیں دفناتے ہیں۔

چند روز پہلے اپنے دوست کے ہاں کسی چینل پر بھارتی مزاحیہ اسٹیج شو ''کامیڈی نائٹس ود کپل'' دیکھنے کا موقع ملا۔ بھارتی فنکاروں نے اسٹیج پر تیر و نشتر ڈائیلاگ اور حرکتوں سے سامعین سے داد وصول کی۔ پھر ایک خاکہ دیکھ کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک لڑکا لڑکی کو آنکھ مار کر ''ڈیٹ'' پر چلنے کی پیشکش کرتا ہے۔ لڑکی برہم ہوتے ہوئے کہتی ہے ''تیرے گھر میں بہن نہیں ہے؟ جا ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر۔''

لڑکا کہتا ہے ''وہ تو کسی کے ساتھ ''ڈیٹ'' پر گئی ہوئی تو اپنی بات کرے۔''

ہمارے ہاں ایسے غیر مہذب ٹی وی پروگرام اب عام دکھائے جا رہے ہیں حالانکہ یہ کچے ذہنوں کے لیے زہر قاتل اور بے راہ روی پھیلانے کا سبب ہیں۔

ہمارے ہاں ایک نئی اوٹ پٹانگ رسمیں رواج پا چکیں جن سے چھٹکارا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر شادی بیاہ کی تقریبات میں ان کا خوب مظاہرہ ہوتا ہے۔ دولہا دلہن کو آئینہ دکھائی، دودھ پلائی، جوتی چرائی، ہاتھ پکڑائی اور دلہن کی گود میں بار

دیور کو بٹھانا...... یہ خالص ہندوانہ رسمیں ہیں جنھیں اپناتے ہوئے کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی۔ بلکہ ایسے مواقع پر عقلِ سلیم رکھنے والے بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں ”کچھ نہیں ہوتا‘ خوشی کا موقع ہے۔“

دودھ پلائی کی رسم میں جب دُلھا‘ دُلھن ایک ایک گھونٹ پی چکیں تو بچا دودھ کسی ایسی دوشیزہ یا نوجوان کو پلایا جاتا ہے جس کی بوجوہ شادی نہ ہو سکی۔ گویا یہ پینے سے اُس کی شادی بھی جلد ہو جائے گی۔

مجھے گوالمنڈی کا وہ دُلھا نہیں بھولتا جو ایک رسم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ موصوف جس گھر میں بیاہے گئے‘ وہاں رواج تھا کہ دُلھا دُلھن کو بانہوں سے اُٹھا کر اسٹیج پر لے جائے گا۔ شومئی قسمت دُلھن موٹی بھاری اور موصوف دبلے پتلے تھے۔ جیسے تیسے ”جانِ من“ کو اُٹھایا۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ بیچ راہ ”چندن بدن“ کی تاب نہ لا کر دُلھن کو زمین پر پٹخا اور خود دوہرے ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر براتی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ دُلھن بیچاری تمام عمر کمر درد میں مبتلا رہی۔

اب ایک قصبے کی شادی کا حال بھی جان لیجیے۔ دُلھا کو تیاری کے لیے عزیز و اقارب کی موجودگی میں نائی غسل کراتا ہے۔ چار آدمی سرخ چادر کے کونے تھامے دُلھا پر سایہ کیے رہتے ہیں۔ اس غسل کی خاص بات یہ ہے کہ دُلھے نے پانی سے بھرا مٹی کا گھڑا ایک ہاتھ سے اُٹھا کر اپنے اوپر اُنڈیلنا اور گھڑے کا ڈھکن جو دانستہ پکی مٹی کا رکھا جاتا ہے‘ اُسے پاؤں کی ایڑی سے چوٹ لگا کر توڑنا ہے تا کہ اُس کی شہ زوری عیاں ہو سکے۔ ان مراحل سے دُلھا کامیاب گزرے تو تالیاں بجا کر اُسے داد دی جاتی ہے ورنہ دوسری صورت میں بیچارے کی سبکی ہوتی ہے۔

میں اپنی ایک جاننے والی خاتون کے ہاتھ میں عجیب ہیئت کی شے دیکھ کر حیران رہ گیا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے موٹی لفافے میں لپٹی وہ ڈراؤنی شے میری طرف بڑھائی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی: اس سال ہم نے اونٹ کی قربانی کی تھی۔ یہ اُس کے نچلے دانت ہیں جو میں نے محفوظ کر لیے۔ اب خرادیے کے پاس لے جا رہی ہوں‘ وہ اسے چوڑی نکیا بنا کر اس میں سوراخ کرے گا۔ عرق النسا یا ٹانگ میں تکلیف ہو تو یہ دانت کالے دھاگے میں پرو کر ٹخنے کے اوپر باندھنے سے زندگی بھر تکلیف نہیں ہوگی۔

بعض لوگ اپنے دفاتر یا دکانوں میں اونٹ کی ران یا پنڈلی کی سالم ہڈی لٹکا دیتے ہیں کہ یہ بھی نظرِ بد سے بچاؤ اور باعث برکت ہے۔ میں ڈاکٹر اسپتال کے اشارے پر ٹھہرا بتی سبز ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ دائیں جانب کھڑی سیاہ پجارو پر نظر پڑی‘ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی اگلی اور پچھلی نمبر پلیٹ کے ساتھ کالا پراندہ خاص اہتمام سے بندھا ہوا تھا۔

آج کل اکثر مرد و زن نے کلائیوں پر سرخ دھاگا نظر آتا ہے۔ ایک واقف کار سے پوچھا یہ کیوں باندھ رکھا ہے‘ تو کہنے لگے ”یہ سندھ میں واقع سیہون شریف دربار کا ہے جو نہ صرف باعث برکت ہے بلکہ یہ باندھنے والا حادثات اور دشمنوں سے محفوظ رہتا ہے۔“ بے ساختہ مجھے بے نظیر بھٹو یاد آ گئیں جنھوں نے حادثے کے وقت ”امام ضامن“ باندھ رکھا تھا۔

اب انھیں کون بتائے کہ پانچ وقت کی نماز ہی تمام دکھوں‘ مصائب‘ مشکلات اور نظرِ بد کا مداوا ہے۔

یہ ماننے کی بات ہے کہ جو طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ہمیں بتائے بلکہ ان پر عمل پیرا ہو کر بھی دکھایا...... بس انہی میں ہماری نجات اور کامیابی ہے۔ اللہ پاک نے رزق دینے کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے لیکن بخشش کا وعدہ سب سے نہیں کیا۔ پھر کیوں لوگ رزق کے لیے پریشان اور مغفرت کے معاملے میں بے فکر ہیں؟ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تیرے اعمال سے ہے تیرا پریشان ہونا
ورنہ مشکل نہیں مشکل کا آساں ہونا
پورے عالم پہ حکومت ہو تیری اے مسلم
اگر تو سمجھ جائے اپنا مسلماں ہونا

ایک شہر میں چند لیکچر دینے گیا۔ اس شہر کی خاص بات یہ تھی کہ وہاں نفسیاتی امراض کا بہت بڑا اسپتال واقع تھا جسے عرف عام میں لوگ "پاگل خانہ" کہتے ہیں۔ میں لیکچر دے کر نکلا تو ظہر کی اذان میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ میرے ساتھ گاڑی میں ممتاز مبلغ اور داعی عبدالعزیز بھی تھا۔ میں نے اس سے کہا: "عبدالعزیز! ہمارے پاس وقت ہے۔ میں یہاں ایک جگہ جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟ یہاں ایک قدیم کتب خانہ ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں، ذہنی امراض کے اسپتال جانا ہے۔"

وہ بولا: "پاگل خانے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہنسا اور مزاحیہ انداز میں کہنے لگا: "کیوں؟ دماغ کا معائنہ کرانا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں، ہم عبرت حاصل کر کے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے۔"

پاگل خانے میں وقت گزار کر

سبق جو پاگلوں سے ملا

مصائب شمار کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا حساب ضرور لگا لیجیے

ڈاکٹر محمد عبدالرحمن العریفی



عبدالعزیز خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ لہرایا۔ وہ معمول سے زیادہ جذباتی مزاج کا مالک تھا۔ بہرحال اس نے گاڑی پاگل خانے جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ہم وہاں پہنچے، تو سامنے ایک افسردہ عمارت استادہ دکھائی دی جسے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ہم نگران ڈاکٹر سے ملے۔ انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور اسپتال کا دورہ کرانے لے گئے۔

ہم پہلے ایک برآمدے میں پہنچے جس کے دونوں اطراف کمرے بنے تھے۔ وہاں ہمیں عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں۔ ہمیں دائیں طرف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، تو ایک بستر پر آدمی اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا، تو انھوں نے بتایا، ہر پانچ چھے گھنٹے بعد اس پاگل کو مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ میں نے لاحول ولا قوۃ پڑھا اور پوچھا: "یہ شخص کب سے اس حال میں ہے؟"

انھوں نے کہا: "دس سال سے زائد عرصہ ہو گیا۔"

چند قدم آگے ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے میں سوراخ تھا جس سے ایک آدمی باہر جھانک رہا تھا۔ وہ عجیب و غریب اور سمجھ میں نہ آنے والے اشارے کرتا تھا۔ میں نے کمرے کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ فرش اور دیواریں گہرے نسواری رنگ کی تھیں۔ ڈاکٹر نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ بھی پاگل ہے۔

میں نے کہا: "یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ عقلمند ہوتا، تو ہم اسے یہاں نہ دیکھتے لیکن اس کا ماجرا کیا ہے؟"

ڈاکٹر کہنے لگے: "اس آدمی کو دیوار نظر آئے، تو مشتعل ہو جاتا ہے۔ ہاتھوں، پاؤں اور کبھی سر سے دیوار کو ضربیں مارتا رہتا ہے۔ کبھی انگلیاں تڑوا بیٹھتا ہے، کبھی ٹانگیں اور کبھی سر زخمی کر لیتا ہے۔" ڈاکٹر نے افسردگی سے کہا: "ہم اس کا علاج نہیں کر سکے لہٰذا کمرے میں بند کر دیا۔ دیواروں اور فرش پر فوم لگا دیا ہے تاکہ وہ جیسے چاہے اپنی جنون اس پر نکالتا رہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے چل دیے۔


دوسروں سے بے خبر بچکانہ حرکات کرتی ایک پاگل لڑکی

میں اور عبدالعزیز وہاں کھڑے دعا پڑھنے لگے جو اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر دہرانے کے لیے سکھائی ہے:

"اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اس بیماری سے عافیت میں رکھا جس میں تمھیں مبتلا کیا اور یوں اس نے ہمیں اپنی بیشتر مخلوق پر فضیلت عطا کی۔" (جامع الترمذی۔ سنن ابن ماجہ)

ہم پھر اگلے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ ایک کمرے میں کوئی بستر نہیں تھا۔ وہاں کئی آدمی موجود اور اپنے حال میں مست تھے۔ ایک ناچ، تو دوسرا گا رہا تھا۔ کچھ آدمیوں کو کرسیوں پر بٹھا کے رسیوں سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے بے تحاشا زور لگا

رہے تھے۔ ڈاکٹر بتانے لگے: "یہ سامنے پڑی ہر شے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ کھڑکیاں توڑتے، دروازے اکھاڑتے اور برقی آلات خراب کر دیتے ہیں۔ اس لیے ہم صبح سے شام تک انھیں اسی طرح باندھ کر رکھتے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "یہ لوگ کب سے اس حال میں ہیں؟"

وہ بولے: "پہلا آدمی دس سال اور دوسرا سات سال سے ہے۔ یہ نیا ہے اسے پانچ سال ہوئے ہیں۔"

میں ان کی حالت پر افسوس کرتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر میں نے کہا: "اب ہمیں باہر کا راستہ دکھا دیجیے۔"

وہ بولے: "ایک کمرا رہ گیا ہے، وہ بھی دیکھ لیجیے۔"

وہ ہمیں اس کمرے کی طرف لے گئے۔ دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ مجھے توقع تھی کہ کسی ناچتے گاتے یا ادھم مچاتے مریض سے سابقہ پڑے گا، لیکن یہاں تو منظر ہی عجیب تھا۔ ایک آدمی جس کی عمر پچاس سال سے اوپر، بالوں میں سفیدی نمایاں تھی، زمین پر سمٹ کر بیٹھا ہماری طرف ترچھی ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اہم بات یہ کہ وہ بالکل برہنہ تھا۔

میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ بتانے لگے: "اس شخص کو ہم نے جب بھی کپڑے پہنائے، وہ دانتوں سے پھاڑ کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے اسے دن میں دس دس کپڑے پہنائے اور اس نے ہر بار کپڑوں کا یہی حشر کیا۔ یہ شخص اپنے جسم پر ایک چیتھڑا بھی برداشت نہیں کرتا۔ ہم نے تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب سردی ہو یا گرمی، یہ بے لباس ہی رہتا ہے۔"

میں کمرے سے نکل آیا۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا: "اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

وہ بولے: "ابھی چند اور کمرے باقی ہیں۔"

میں نے کہا: "جتنا دیکھ لیا کافی ہے۔"

ہم خاموشی سے اسپتال کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ڈاکٹر کو جیسے کچھ یاد آیا، بولے: "شیخ! یہاں ایک بڑا تاجر بھی مقیم ہے۔ کثیر دولت کا مالک ہے۔ دو سال ہوئے، اس کی عقل میں ذرا خلل آ گیا۔ اس کے بیٹے اسے یہاں چھوڑ گئے۔ ایک اور انجینئر تھا۔ وہ بھی....."

ڈاکٹر پھر ان افراد کا تذکرہ کرنے لگے جو عزت و شرف کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد ذلت کے گہرے گڑھوں میں جا گرے۔ کچھ دولت مند ہونے کے بعد فقیری زندگی گزار رہے ہیں۔

میں یہ عبرت ناک داستانیں جان کر سوچنے لگا: پاک ہے وہ ذات جس نے بندوں میں رزق تقسیم کیا، تو جس کو چاہا دیا اور جسے چاہا محروم رکھا۔ اللہ تعالیٰ آدمی کو مال و دولت، حسب و نسب اور منصب رفیع سے نوازتا ہے۔ لیکن جب چاہے عقل چھین کر اسے پاگل خانے بھی پہنچا دیتا ہے۔ دوسرے کو مال و دولت اور حسب و نسب کے ساتھ عقلمندی عطا کرتا لیکن صحت سے محروم کر دیتا ہے۔ مال و دولت کی فراوانی کے باوجود وہ بیس، تیس سال اور کبھی تمام عمر بستر پر گزارتا ہے۔ کسی کو صحت، قوت اور عقل دے، تو مال سے محروم کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہر اس آدمی کے لیے ضروری ہے، جسے اللہ نے کسی نہ کسی آزمائش میں ڈالا کہ وہ مصائب شمار کرنے سے پہلے رب کریم کی نعمتوں کو حساب میں لائے۔

اگر اللہ نے مال سے محروم رکھا، تو صحت دی ہو گی۔ صحت نہیں دی تو عقل سے نوازا ہو گا۔ عقل کم دی تب مسلمان تو بنایا ہی ہے۔ اسلام کی نعمت بھی معمولی نہیں۔ اس شخص کی زندگی مبارک ہے جو اسلام پر جیے اور اسلام پر مرے۔ اس لیے ہم میں سے ہر مسلمان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، الحمدللہ۔

صحابہ کرامؓ کے بھی یہی جذبات تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو سریہ ذات السلاسل لڑنے کے لیے شام کی طرف روانہ کیا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ وہاں پہنچے، تو دشمن کی بڑی تعداد دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا اور کمک طلب کی۔ آپؐ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کو ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کمک کے لیے روانہ

ہونے والے اس لشکر کے امیر تھے جس میں ابوبکرؓ کے علاوہ کبار مہاجرین بھی شامل ہوئے۔

روانگی کے وقت آپ ﷺ نے ابوعبیدہؓ سے فرمایا: ''آپ دونوں آپس میں اختلاف مت کرنا۔'' حضرت ابوعبیدہؓ روانہ ہوگئے۔ شام کے علاقے میں حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس پہنچے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: ''آپ صرف کمک کے طور پر آئے ہیں لشکر کا سپہ سالار میں ہوں۔''

حضرت ابوعبیدہؓ بولے: ''نہیں، میں اپنے اور آپ اپنے لشکر کے سپہ سالار ہیں۔'' وہ نرم خو اور صلح جو آدمی تھے۔

حضرت عمروؓ نے ان سے کہا: ''آپ میری کمک میں آئے ہیں۔''

حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا: ''عمرو بھائی! رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ دونوں اختلاف نہ کرنا، اس لیے میں آپ کی بات مانوں گا۔''

حضرت عمروؓ بولے: ''پھر میں آپ کا بھی سپہ سالار ہوں۔ آپ صرف میری کمک ہیں۔''

حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ بات تسلیم کرلی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے آگے بڑھ کر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جنگ اختتام پذیر ہوئی تو سب سے پہلے حضرت عوفؓ بن مالک مدینہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ آپ ﷺ نے ان سے جنگ کا احوال دریافت کیا۔ انھوں نے آپ ﷺ کو حضرت عبیدہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کے درمیان ہونے والی گفتگو کے متعلق بتایا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ ابوعبیدہؓ بن جراح پر رحم کرے۔''

(دلائل النبوۃ للبیہقی صفحہ ۴۰۲)

اس تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی کے تاریک رخ سے پہلے اس کے روشن پہلوؤں پر نظر ڈال لیا کیجیے۔ یوں آپ مشکلات و مسائل سے نبرد آزما ہوتے بھی خوشگوار زندگی گزار سکیں گے۔

جوانانِ تیغ بند

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظرِ حنا کی عروسِ زمینِ شام
اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آ کر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہؐ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ ''وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام!
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے''

(علامہ اقبال)



نجومی صاحب، بتایئے تو

یہ ہفتہ کیسا رہے گا؟

محمد یعقوب غزنوی

جب ایک نوجوان نے ستاروں کی چال اور ہاتھوں کی لکیروں پر بھروسا کیا، تو اس پر کیا گذری...... قہقہہ بار قلمی تحفہ

ہمارے دوست، بدھو میاں کو کہیں سے پتا چل گیا کہ ہم اپنے تمام کاموں کا آغاز علم نجوم کی مدد سے اور ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کرتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، بدھو میاں نے ہر طرح سے ہمیں یقین دلایا کہ وہ علم نجوم اور ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے ماہر ہیں۔ اگر کیرو بھی آج زندہ ہوتا تو ان کے آگے ہاتھ پھیلانے سے گریز نہ کرتا۔

چناں چہ مجبوراً ہم نے بھی بدھو میاں کے آگے ہاتھ پھیلا دیا، کچھ مانگنے نہیں بلکہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ذرا لکیریں دیکھ کر بتائیے، یہ ہفتہ ہمارے لیے کیسا رہے گا؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے، کن چیزوں سے احتیاط و اجتناب کرنا ہوگا۔

بدھو میاں نے علم نجوم کے کسی ماہر پروفیسر کی طرح ہمارا ہاتھ بے دردی سے توڑ مروڑ اور الٹ پلٹ کر دیکھا، کبھی خلاؤں میں گھورا اور کبھی ہمیں، تھوڑی دیر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے پھر آنکھیں بند کیے ہمیں پورے ہفتے کی تفصیلات مع احتیاط بتا ڈالیں۔

ہمارے ہفتے کا آغاز اتوار سے ہوا۔ بقول بدھو میاں لکیریں کہتی ہیں کہ آج کے دن گفتگو میں مکمل احتیاط کی ضرورت ہے۔ جھوٹ بولنے سے گریز کیا جائے۔ رقم کے حصول میں ناکامی ہوگی۔ کسی اجنبی سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

چناں چہ ہم محتاط ہو گئے۔ شام کو دوست احباب ملنے آئے۔ فرصت میں پایا تو ایک جلسے میں لے گئے اور "ہم زندہ قوم ہیں" کے موضوع پر تقریر کروا ڈالی۔ واپسی پر ایک دوست دو سو روپے ادھار لے گئے۔

بدھو میاں کا کہنا تھا کہ پیر کا دن مایوسی کے عالم میں گزرے گا۔ افسردگی کا غلبہ رہے گا۔ بات بات پر غصہ آئے گا۔ مزاج میں چڑچڑا پن دوسروں کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوگا۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ پر قابو رکھا جائے۔

چناں چہ ہم نے صبح ہی سے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ کہیں سے کسی بھی طرح خوشی کا کوئی جراثومہ ہم تک نہ پہنچے ورنہ ستاروں اور لکیروں میں جنگ ہونے کا خدشہ ہے۔ لیکن پیر کے روز صبح ہی سے خوشیوں کو ہم پر ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آتا رہا۔ جس سے بات کرتے، وہ خوش خبری سناتا۔ گھر سے رکا ہوا جیب خرچ اسی دن بحال ہوا۔ اسی خوشی میں ہم نے تمام بہن بھائیوں کو چکن تکے کی دعوت دے ڈالی۔

منگل کے بارے میں بدھو میاں نے ہمیں بتایا تھا کہ سفر خوش گوار رہے گا۔ ہمسفر سے اچھی گپ شپ رہے گی۔ ماحول اور طبیعت ہشاش بشاش رہے گی۔ لیکن عجیب بات کہ منگل کی صبح ہی سے ہمارے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ چناں چہ تمام امور سے چھٹی کی اور سارا دن بے سدھ سوتے رہے۔ اگرچہ بعد میں گھر والوں سے لعن طعن سننے کو ملی جس نے طبیعت حد درجہ مکدر رکھی۔

بدھ کی مصروفیات کے بارے میں بدھو میاں نے بڑے ماہرانہ انداز میں اطلاع دی تھی کہ آج کا دن آپ کے لیے بڑی مسرت و طمانیت کا باعث ہے۔ کوئی ایسا واقعہ رونما ہوگا جس سے آپ کی خوشگوار یادیں وابستہ ہوں گی۔ ہم بہت خوش تھے کہ آج ہم پہ مسرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ لیکن ہماری ہی کوشش کے باوجود بدھ کو سارا دن خوشی و مسرت سے کوئی علیک سلیک نہ ہو سکی۔ اسی غم میں شام کو گھر واپسی پر منی بس کے کنڈکٹر سے جھڑپ ہوگئی۔ بات مزید بڑھی اور ہماری نئی قمیص کا گریبان چاک ہوگیا۔

جمعرات کی پیش گوئی کے مطابق بدھو میاں کا ارشاد تھا کہ دوستوں سے ملنے میں اجتناب برتو کیونکہ ان سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ہم سارا دن دوستوں سے منہ چھپائے پھرتے رہے۔ لیکن اچانک دوپہر کے بعد ایک دوست کے ہاتھ چڑھ گئے جو اتوار کو دو سو روپے ادھار لے گیا تھا۔ آج وہ بڑے شکریے کے ساتھ پیسے واپس کر گیا۔

جمعہ کے بارے میں ہماری لکیروں اور ستاروں نے ہاتھ جوڑ کر بدھو میاں کو بتایا تھا کہ آج کا سارا دن تخلیقی سرگرمیوں میں گزرے گا۔ لیکن آپ چاہیں تو اپنی مصروفیات مختصر کر کے کہیں سیر و تفریح کو جا سکتے ہیں۔ دل کا حال سنا دینے کے لیے آج کا دن بڑا ہی مبارک ثابت ہوگا۔ آپ کا ستارہ روشن ہے اپنی عقلمندی سے فائدہ اٹھائیے۔

لیکن جمعہ کی صبح ہی گھر والوں نے ہماری تخلیقی سرگرمیوں کا تیا پانچا کرنے کی تیاری کر لی۔ چھے مرتبہ بازار جا کر مختلف چیزیں لانا پڑیں۔ ابھی ہم اپنی مصروفیات مختصر کر کے سیر و تفریح پر جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ ہمارے چچا کو حادثہ پیش آ گیا۔ چناں چہ فوراً اسپتال جانا پڑا۔ وہاں چچا کی لڑکی کو تنہا پا کر سوچا کہ حال دل اسی سے کہہ ہی دیا جائے۔ سو رٹے رٹائے محبت بھرے "ڈائیلاگ" ایک کے بعد ایک بند اس کے گوش گزار کر دیا۔

اس کمبخت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہماری شکایت اسپتال ہی میں موجود بڑے بھیا سے کر دی۔ انھوں نے قہر آلود نظروں سے ہمیں گھورا۔ ہمیں اپنا روشن ستارا تاریک ہوتا نظر آیا۔ لیکن ہم نے اپنی عقلمندی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے راہ فرار اختیار کی اور خود کو بچانے میں کامیاب ہوگئے۔

ہفتے کا دن بدھو میاں کے مطابق ہمارے لیے بڑا ہی کٹھن تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق آج کے دن ہمارے مزاج میں غصے کا شدید رجحان پایا جائے گا۔ اپنے جذبات پر قابو نہ رہے گا اور کسی عزیز سے ہاتھا پائی کا خطرہ ہے۔

سارا دن گزر گیا کچھ بھی نہ ہوا۔ اب شام ہو چکی اور ہمیں بدھو میاں پر شدید غصہ آ رہا ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر قابو نہیں کیونکہ اس پورے ہفتے بدھو میاں کی تمام پیش گوئیاں الٹ ثابت ہوئیں۔ اگر وہ آ گئے تو ان سے ہاتھا پائی تو ضرور ہوگی۔ کم از کم اس طرح ہم آج کے دن تو بدھو میاں کے مطابق گزار سکتے ہیں نا سو ضرور کریں گے۔

دنیا کی حسین ترین عورتوں سے زیادہ قیمتی

میری انمول بیوی

پریشانی و غم میں گھر کر جب ایک شوہر کو اپنی ایثار پسند شریکِ حیات کی ندرت و اہمیت کا اندازہ ہوا

ایم اسلم



قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ہم نے کائنات میں ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ انھیں سکون اور راحت حاصل ہو سکے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں جب حضرت حوا کو دیکھا، تو آپ کا حسن و جمال دیکھتے ہی رہ گئے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا "اے پروردگار! یہ کون سی مخلوق ہے جسے دیکھ کر میں اپنے دل میں کشش محسوس کرتا اور اس کی جانب کھنچا چلا جاتا ہوں؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا! اے آدم علیہ السلام یہ آپ ہی کے جسم کا حصہ ہے۔ آپ کی دل جوئی کے لیے اسے پیدا کیا گیا۔ یہ آپ کے دل کو سکون اور راحت پہنچائے اور نسل انسانی سے دنیا آباد کرے گی۔" اس میں شک نہیں کہ بیوی اور شوہر کی حیثیت سے مرد اور عورت کو قرآن پاک میں ایک دوسرے کا لباس کہا گیا۔

شادی کے مضبوط رشتے میں بندھنے کے بعد حکمت خداوندی سے انسان نہ صرف نسل انسانی کی افزائش کا باعث بنتا ہے بلکہ غیر محسوس انداز میں عموماً میاں بیوی ایک دوسرے سے والہانہ محبت بھی کرنے لگتے ہیں۔ گو ابتداً محبت کا اظہار کم ہوتا ہے، لیکن جوں جوں زندگی کی شاہراہ پر اکٹھے روز و شب گزریں، تو نہ چاہتے ہوئے بھی چاہت کا مضبوط رشتہ خود بخود استوار ہو جاتا ہے۔

محبت کا یہ اظہار بطور خاص اس وقت زیادہ شدت اختیار کرتا ہے جب دونوں میں سے کوئی ایک دنیا سے رخصت ہو یا کسی طویل بیماری کا شکار ہو جائے۔ میرے ایک دوست مجیب عالم کو اللہ تعالیٰ نے دولت، عزت، شہرت اور شرافت غرض ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا۔ دونوں میاں بیوی تمام تر مشکلات سے نبرد آزما زندگی کی شاہراہ پر بڑھ رہے تھے۔ اچانک بیوی کو یکے بعد دیگرے کئی موذی بیماریوں نے گھیر لیا۔ حتی المقدور علاج کروانے کے باوجود وہ فانی دنیا سے

رخصت ہوگئی۔

ایک شام میری محبوب عالم سے ملاقات ہوئی، تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اداسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں لیکن کوئی بھی عورت میری بیوی کی کمی پوری نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "بیوی چل بسے، تو لوگ دوسری شادی بھی تو کر لیتے ہیں۔"

انھوں نے جواب دیا "شادی تو میں بھی کر سکتا ہوں لیکن جس طرح کسی دیوار سے اینٹ نکال کر دوبارہ اس خوبصورتی سے لگائی نہیں جا سکتی، اسی طرح کوئی بھی دوسری بیوی پہلی زوجہ کی جگہ نہیں لے پاتی۔ اگر میں دوسری شادی کروں تو بے شک مجھے تسکین تو مل جائے گی لیکن نئی عورت گھر کی ذمے داریوں سے شاید ہی عہدہ برآ ہو سکے۔ اول بچے اسے بحیثیت ماں قبول نہیں کریں گے۔ اولاد اور بیوی کے درمیان کشمکش میرے لیے مزید عذاب بنے گی۔ اب زندگی میرے لیے بہت بڑا امتحان بن چکی۔ میں کس سے بات کروں اور کون میری بات سن کر مجھے دلاسا دے؟ عجیب مخمصے کا شکار ہوں۔"

دوست کی باتیں سن کر میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا، تو مجھ پر چند لمحوں کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ وجہ یہی کہ بیگم نے اپنے بہترین اور خوش دلانہ رویے سے مجھے بھی گزشتہ ۳۳ سال سے قلبی راحت اور سکون دے رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو جائے، تو غم اور پریشانی کے عالم میں مجھے حوصلہ کون دے گا، قدم قدم پر میرے لیے آسانیاں کون پیدا کرے گا؟

میں نے دوست کے سامنے اپنی کیفیت ظاہر کیے بغیر رب سے دعا کی کہ موت سے، تو کوئی بچ نہیں سکتا، لیکن میرے ساتھی کو مجھ سے جدا نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تو شاید میرے بغیر زندگی گزار لے، لیکن میرے لیے اس کی جدائی موت سے پہلے مرنے کا سامان پیدا کر دے گی۔ اگر یہ کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جتنا مجھے چاہتی ہے، اس سے کئی گنا زیادہ میں بیگم کے لیے محبت کا احساس رکھتا ہوں۔

میرے دل و دماغ میں ابھی تک دوست کی باتیں گونج رہی تھیں کہ ایک دن اچانک بیگم کو گردے میں شدید درد ہوا۔ ڈاکٹر نے وقتی شفا کے لیے دوائی تو دے دی لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ ذرا الٹرا ساؤنڈ کروا لیں تاکہ درد کی اصل وجہ معلوم ہو سکے۔ حجاز اسپتال سے الٹرا ساؤنڈ کروایا، تو انکشاف ہوا کہ بایاں گردہ جسامت میں چھوٹا اور دائیں گردے میں پتھری ہے۔

بیگم کی پریشانی اپنی جگہ لیکن اس بیماری کی آڑ میں مجھے وہ مٹھی سے کھسکتی محسوس ہوئی۔ اس کی جدائی کے تصور ہی سے میں کانپ گیا۔ جب ہم اسپتال سے گھر آنے لگے، میں نے محسوس کیا کہ میری چاہتوں کے تمام دھارے صرف بیگم کی جانب ہی بہنے لگے ہیں۔ پہلے کبھی کبھار نوک جھوک ہو جاتی تھی، لیکن اب میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا دل کبھی نہیں دکھاؤں گا بلکہ وہ جو کہے گی، مانوں گا اور جو چاہے گی ویسا ہی کروں گا۔

میں مرنے کے بعد قبر پر اظہار محبت کی خاطر سیب رکھنے والا نہیں، اسی لیے فیصلہ کیا کہ اس کی صحت یابی کے لیے رقم کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر ممکن اقدامات اٹھائے جائیں۔ میرے یہ جذبات صرف مجھ تک محدود تھے، ان کی خبر موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھی بیگم کو ہرگز نہیں تھی۔ بعد میں میرا خوش دلانہ رویہ محسوس کرتے ہوئے بیگم نے کہا "شاید میری بیماری کی وجہ سے آپ کچھ زیادہ فراخ دل ہو رہے ہیں۔"

یہ سوچ کر کہ وہ دل میں پریشان نہ ہو جائے، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن جونہی لہر دل سے دماغ کی طرف اٹھتی، وہ مجھے بیگم کی بیماری کی شدت کا بخوبی احساس دلا دیتی۔

رات کو ہم گھر کے بالائی کمرے میں سونے پہنچے، تو حسب معمول بیگم نے پہلے میرا بستر صاف کر کے چھت والا پنکھا چلا کر کمرے کا درجہ حرارت کم کیا۔ جب گرمی کا احساس کچھ

کم ہوا تب مجھے بستر پر لیٹنے کی اجازت ملی۔ جب وہ یہ سارا کام نہایت سلیقہ مندی سے اور ہنگامی بنیادوں پر کر رہی تھی، تو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا میں اس کی عدم موجودگی کا تصور کر کے کانپ رہا تھا۔ دل میں بار بار اس احساس نے جنم لیا کہ اگر اسے کچھ ہوا، تو میرے سارے کام کون کرے گا؟

بے شک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے گھر دو سلیقہ مند اور وفا شعار بیٹیاں، بہو کے روپ میں موجود ہیں۔ وہ میرے آرام اور ضرورتوں کا خیال بھی رکھتی ہیں۔ لیکن بیگم کی براہ راست توجہ جو مجھے گزشتہ ۳۲ سال سے میسر ہے، اس کی کمی تو کسی طرح پوری نہیں کی جا سکتی۔ ان لمحات میں بیگم کی ایک ایک خوبی میرے ذہن و دل میں اجاگر ہو رہی تھی۔

جب جناح اسپتال کے ماہر ڈاکٹر کو خون اور الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دکھائی، تو اس نے دوا لکھنے کے بجائے انمول ریسرچ سنٹر سے کروانے کے لیے مزید ایک ٹیسٹ لکھ دیا۔ انمول کا نام سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یا اللہ رحم! کہیں ایسا تو نہیں کہ جسم کے کسی حصے میں کوئی اور موذی بیماری پنپ رہی ہو؟

جب انمول پہنچا، تو میں اپنی تشویش اور کرب کو دانستہ چھپا رہا تھا لیکن مضبوط اعصاب رکھنے والی بیگم بھی پریشان ہو کر مجھ سے پوچھنے لگی ''ڈاکٹر نے مجھے یہاں کیوں بھجوایا ہے؟ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''ہرگز ایسی کوئی بات نہیں۔'' لیکن اس کی تشویش اپنی جگہ قائم رہی۔ ٹیسٹ کا وقت ایک دن بعد طے ہوا جس کے اخراجات دو ہزار روپے تھے۔ ہر نماز کے بعد بیگم کی سلامتی کی دعا کرتا رہا۔ دوسرے دن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بیگم کو لے کر انمول ریسرچ سنٹر جا سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی بیماریاں اور دکھ بھول کر صرف اسے بچانے کی ہر ممکن جستجو کر رہا تھا۔

بیٹے شاہد کے ساتھ بیگم انمول ریسرچ سنٹر گئی۔ وہاں اسے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا، یہ وہی بتا سکتی ہے لیکن میں بار بار موبائل پر بیٹے سے رابطہ کر ٹیسٹ کے متعلق آگاہی حاصل کرتا رہا۔ شام ڈھلے جب گھر لوٹا، تو بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر آدھا گھنٹا مشین میں لیٹا کر کمپیوٹر پر اسکریننگ کرتے رہے۔ اللہ خیر کرے کوئی اور بیماری نہ نکل آئے۔

بظاہر بیگم کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا لیکن یوں محسوس ہوا، وہ صرف مجھے دکھانے کے لیے تھا تاکہ میری پریشانی میں مزید اضافہ نہ ہو۔ بہرکیف تمام نمازوں میں میری دعاؤں کا مرکز و محور بیگم کی سلامتی ہی رہی۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر یہی دعا مانگتا رہا، پروردگار، جتنی بھی زندگی ہو صحت اور تندرستی کے ساتھ دینا۔ اگر اسے کچھ ہوا، تو میرا زندہ رہنا بھی شاید ممکن نہ رہے۔

اس لمحے وہ مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت اور انمول عورت دکھائی دی۔ وہ ہرگز ملکہ حسن نہیں لیکن وفاؤں کی فراوانی نے اسے میرے لیے اتنا انمول بنا دیا کہ اس کی جدائی کا تصور کر کے بھی کلیجا منہ کو آتا۔ دنیا میں عورتوں کی ہرگز کمی نہیں، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت عورتیں مل جاتی ہیں۔ لیکن وہ سب حسینائیں میرے لیے صفر ہو گئیں۔ مجھے تو اسی عورت کو ہر حال میں بچانے کی جستجو کرنی تھی جس کی وفاؤں نے گزشتہ ۳۲ سال سے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

اگلے دن مجھے ایک دوست کا یہ ایس ایم ایس موصول ہوا، جس کی عبارت یہ تھی: ''صدقہ ہر مصیبت ٹال دیتا ہے، لیکن اس مصیبت کو نہیں ٹالتا جس سے نکاح کیا جائے''۔ یہ ایس ایم ایس محض مذاق تھا لیکن مجھے اس لیے اچھا نہیں لگا کہ میں تو بیگم کو بیماریوں سے بچانے کے لیے ساری دنیا سے ٹکرانے کا عزم رکھتا ہوں۔ جبکہ دوست بیگم کو ایسی مخلوق قرار دے رہا ہے جو صدقے سے بھی ٹالی نہیں جا سکتی۔

اگلے دن انمول ریسرچ سنٹر کی رپورٹ ملنی تھی۔ سارا

دن اسی پریشانی میں مبتلا رہا کہ نجانے کیسی رپورٹ آتی ہے۔ دو بجے دوپہر بیٹے نے فون پر بتایا کہ رپورٹ میں صرف پتھری ہی کا ذکر ہے، پھر بھی ڈاکٹروں کی رائے لینا ضروری ہے۔ گھر پہنچا، تو میں نے بھی رپورٹ پڑھی۔ اس میں صرف گردے میں پتھری کی موجودگی بتائی گئی تھی۔

دوست احباب سے بات کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہومیو پیتھک میں آپریشن کے بغیر پتھری کا علاج ممکن ہے۔ بلکہ میرے ایک دوست نے بتایا کہ ان کے بہنوئی کے گردے میں بھی پتھری تھی جو ہومیو پیتھک علاج سے ختم ہو چلی۔ یہ باتیں میرے لیے حوصلے کا باعث بن گئیں۔ جب سائرہ میموریل اسپتال میں بیگم کا الٹرا ساؤنڈ (دوسری رائے حاصل کرنے کے لیے) کروایا، تو پتھری گردے کے بجائے پتے میں نظر آئی۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں میں کس کی رپورٹ ٹھیک ہے، لیکن پتھری کی موجودگی نے بیگم سے زیادہ مجھے پریشان کر دیا۔ اللہ اس کی حفاظت کرے اور میرے گھر کو آباد و شاداب رکھے۔ (آمین)

یہ تو جیون ساتھی کے حوالے سے میری کیفیت تھی لیکن مشاہدے میں ایسے کئی مرد و زن آئے جن کی زندگی اتنی مثالی نہیں تھی۔ ایک جوان عورت کا شوہر حادثے میں فوت ہو گیا۔ خاتون نے ساری عمر محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کی پرورش کی لیکن جب بچے جوان ہوئے، تو ماں کی قربانیوں کا صلہ دینے کے بجائے اس کے کردار ہی کو شکی نظر سے دیکھنے لگے۔ خاتون نے یہ پیغام چھوڑ کر خودکشی کر لی کہ جس اولاد کے لیے میں نے اپنی جوانی محنت مزدوری میں صرف کر دی، آج وہی مجھ پر نشتر زنی کرتی ہے۔

ہمارے محلے میں مسجد کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹی سی دکان آتی ہے۔ دکان کا مالک ساٹھ ستر کے پیٹے میں ہے۔ میں آتے جاتے اس سے گپ شپ لڑاتا ہوں۔ ایک دن یونہی بات چلتے چلتے جیون ساتھی تک پہنچ گئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا ”کاش میری بیوی دنیا سے رخصت نہ ہوتی۔ جو سکون و قرار اس نے مجھے دے رکھا تھا، وہ اب عنقا ہے۔ اس کے بعد زندگی کانٹوں کی سیج پر گزار رہا ہوں۔“

میں نے کہا کہ آپ دوسری شادی کر لیتے۔ بولا ”اپنے بچوں کو سوتیلے پن سے بچانے کے لیے شادی نہیں کی۔ لیکن جن بچوں کے لیے اپنی زندگی قربان کی، وہ مجھے چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جا بسے۔ بیٹے کبھی کبھی فون پر خیریت دریافت کر لیتے ہیں۔ شاید وہ اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔“

بزرگ پھر کہنے لگے ”قدرت نے بطور خاص پہلی بیوی کو مرد کے لیے نعمت غیر مترقبہ بنایا ہے۔ زندگی اس وقت تک خوشگوار اور پرمسرت رہتی ہے جب دونوں ساتھی زندہ رہیں۔ اگر ایک بھی دنیا سے چلا جائے، تو معاشرہ دوسرے کو اپنے سوتیلے سلوک سے موت کے سپرد کر دیتا ہے۔ حالانکہ جیون ساتھی جدا ہونے کے بعد ماں یا باپ کو پہلے سے زیادہ محبت و نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

لیکن اولاد عموماً بات بات پر لڑتی ہے، مثلاً ماں کس کے ساتھ رہے گی، کون بیٹا اسے روٹی کھلائے گا اور کتنے دن اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں گے۔ جیون میں اکثر ان باتوں پر نوبت تکرار تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ ماں جس کے بغیر بچپن میں نیند بھی نہیں آتی تھی، وہی بیٹوں پر بوجھ بن کر اپنی حیثیت اور اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ اس لمحے بچے ماں کی ساری محبت اور قربانیاں بھول جاتے ہیں۔ اولاد کے سکھ چین کی خاطر ساری رات جاگنے والی ماں ایک بوجھ بن جاتی ہے۔

ماں شفقت، محبت، ایثار اور چاہت کا وہ بے کراں سمندر ہے جس کی رگوں میں اولاد کے لیے بے پناہ محبت خون کی صورت گردش کرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہی ماں بوڑھی ہو کر

جب اولاد کی کفالت میں آتے، تو بیٹے اسے برداشت کرنے ہی کو تیار نہیں ہوتے۔ میں نے نافرمان بیٹوں کو ماں سے بدزبانی کرتے خود دیکھا ہے۔ موت انسان کو اسی وقت ملتی ہے جب اس کا مقررہ وقت آ پہنچے۔ لیکن میں نے کئی عمر رسیدہ اور بیوہ عورتوں کو اولاد کی نافرمانی اور طعنہ زنی کے باعث اپنے کانوں سے موت مانگتے سنا ہے۔

اسلامی اور مشرقی روایات ہمیں والدین کا احترام کرنا سکھاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ تم میں سے جس کے والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں، انھیں اف تک نہ کہو اور ان کی عزت کا خیال رکھو جس طرح انھوں نے بچپن میں تمھارا رکھا تھا۔ اور یہ کہا گیا کہ اولاد کو ماں باپ کے سامنے اس طرح مودب کھڑا ہونا اور ان کا حکم ماننا چاہیے جیسے بادشاہ کے سامنے غلام۔

نبی کریم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ ماں اور باپ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا بھی اولاد کے لیے بہت گناہ ہے۔ ماں کے پاؤں اور باپ کی پیشانی کو بوسہ دینے کو کعبہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لیکن افسوس کہ تیزی سے بدلتی قدروں نے اسلامی روایات کو یکسر بھلا دیا۔ اب زیر کفالت آنے والے والدین کو پہلے جیسی عزت اور احترام دینا دقیانوسی بات سمجھا جاتا ہے۔

بیوی کی حیثیت سے عورت مرد کے لیے زندگی کی آخری سانس تک راحت و سکون کا سامان پیدا کرتی ہے۔ اولاد کی پرورش کرنے اور گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے ساتھ ساتھ عزت و عصمت کی محافظ بنتی ہے۔ مرد اپنی جان جوکھوں میں ڈال اور مونی صعوبتوں سے عہدہ برآ ہو کر عورت کو معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ چناں چہ دونوں کا ملاپ معاشرے میں مثبت قدروں کی افزائش اور رشتوں کے تقدس برقرار رکھنے کا باعث بنتا ہے۔ پھر رشتوں کی ایسی زنجیر بن جاتی ہے اگر کوئی ایک کڑی بھی درمیان سے نکلے تو اسے برقرار رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

بڑھاپے میں عورت ہو یا مرد، ہر انسان کو بیماریاں اس قدر پریشان کرتی ہیں کہ نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے بھی زبان سے بے ساختہ ہائے یا اوئی کی صدا نکل جاتی ہے۔ لیکن اس لمحے ڈھارس بندھتی ہے جب ساتھ والی چارپائی پر لیٹا جیون ساتھی تشویش بھرے لہجے میں پوچھتا ہے "کیا ہوا، میں دبا دوں آپ کو۔ تکلیف اگر زیادہ ہے تو دوائی کھلا دوں؟"

اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا ہے، لیکن اس کا یہی ہمدردانہ لہجہ اور محبت بھری بات زخموں پر مرہم بن کر کسی حد تک تکلیف کا مداوا کر دیتی ہے۔ قدرت نے خواہ مخواہ کائنات میں بسنے والی مخلوق کے جوڑے نہیں بنا دیے، اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانش کا واضح اظہار پوشیدہ ہے۔

غیر معمولی نظام تربیت

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت لگایا گیا۔ اس کا کام انھی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا نظام تربیت ہے جو روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے۔ روزہ سال بھر میں ایک مہینا کا غیر معمولی نظام تربیت (Special Training Course) ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۰ گھنٹے تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے، وہ شدید ہو جائیں۔

(اخذ و ترتیب: صلاح الدین کاشمیری)



مشورہ حاضر ہے

رخسانہ فضل

قارئین اُردو ڈائجسٹ نے حسب توقع ''مشورہ حاضر ہے'' کا خیر مقدم کیا ہے ہمیں کثیر تعداد میں سوالات موصول ہو رہے ہیں۔ نمبر آنے پر ہر سوال کا جواب شافی انداز میں دیا جائے گا۔ میری سعی ہوتی ہے کہ جواب کو اتنا بھرپور بنا دیا جائے کہ سبھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ صرف سوال بھجوانے کے لیے میرا نمبر نوٹ فرمالیں: ۰۳۰۳_۴۴۸۰۸۱۴

بولنے میں دقت

س: میری عمر ۸۰ سال ہے۔ چند سال پہلے تک میری آواز ٹھیک تھی۔ مگر اب میں رک رک کر بولتی ہوں اور بولتے ہوئے تکلیف بھی ہوتی ہے۔

(صدف ارشاد، خانیوال)

ج: بڑھاپے میں بعض بیماریوں کے باعث بولنے کی قوت جاتی رہتی ہیں۔ ان بیماریوں میں عدم کلام (Aphasia)، تصلب متعدد (Multiple Sclerosis)، التصلب الجانبی الضموری (Amyotrophic Lateral Sclerosis)، پارکنسن (رعشہ یا لرزہ) مرض، زوال عقل (Dementia) اور حسِ سماعت کا خاتمہ شامل ہیں۔

درج بالا بیماریوں میں سے کوئی بیماری چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا کر کے بولنے کے عضلات گھٹا دیتی ہے۔ غرض ہر بیماری کسی نہ کسی طور بولنے کی قوت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لہٰذا پہلے اس بات کی تشخیص ضروری ہے کہ کس بیماری کے باعث آپ بولنے کی قوت کھو بیٹھیں تب آپ کا علاج آسان ہو جائے گا۔ تشخیص کی خاطر کسی اچھے معالج سے رجوع کیجیے۔

چہرے پر خشکی

میری بیگم کے چہرے کی جلد خشک ہے، اس پر انھیں تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیز موسم گرما میں وہ داد کا نشانہ بن جاتی ہے۔ علاج بتائیے۔

(نعیم سید، کینیڈا)

ج: انسانی جلد کی چار اقسام ہیں: عام (نارمل)، چکنی، خشک اور حساس۔ خشک جلد والے مرد و زن کی جلد میں نمی نہیں ہوتی۔ اس لیے انھیں کسی نم شے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جلد تروتازہ رہے۔ عرف عام میں ایسی اشیا ''موائسچر'' کہلاتی ہیں۔

یوں تو بازار میں کئی اقسام کے موائسچر دستیاب ہیں، مگر ذیل میں بعض قدرتی اشیا سے گھر میں بنانے کا طریق بتایا گیا ہے:

کیلے کا گودا اور دہی ہم وزن لیجیے اور انہیں اچھی طرح ملا لیں۔ یہ گودا خشک جلد پہ لگائیے اور آدھ گھنٹے تک چھوڑ دیجیے۔ پھر نیم گرم پانی سے دھو لیجیے۔ یہ نسخہ ہفتے میں دو تین دفعہ آزمائیے۔ جلد کو تروتازہ رکھے گا۔ یہ قدرتی نسخہ جلد سے مردہ خلیے بھی دور کرتا ہے۔ بازار میں دستیاب مہنگے موائسچرز سے بدرجہا بہتر ہے۔

ایک چمچ زیتون کا تیل لیجیے۔ اس میں انڈے کی دو زردیاں ڈالیے۔ پھر لیموں اور گلاب کے عرق کے چند قطرے ڈال دیجیے۔ تمام چیزوں کو اچھی طرح ملائیے۔ پھر آمیزہ خشک جلد پر لگائیے اور آدھ گھنٹے کے لیے چھوڑ دیجیے۔ یہ نسخہ بھی جلد کی خشکی دور کرتا ہے۔

جلد کی خشکی سے چھٹکارا پانے کا ایک اور آسان طریقہ یہ ہے: ایک چمچ چینی میں آدھے لیموں کا رس ملائیے۔ یہ آمیزہ پھر روئی میں ڈبو کر خشک جلد پر لگائیے اور آدھ گھنٹے تک چھوڑ دیجیے۔ یہ نسخہ بھی جلد کی خشکی دور کرتا ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے منہ دھو لیجیے۔ یہ قدرتی نسخہ آپ روزانہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ ان نسخہ جات کی مدد سے مسلسل جلد خشک رہنے کی شکایت جاتی رہے گی۔

داد ایک چھوتی مرض ہے۔ بعض اقسام کی پھپھوندیاں اسے پیدا کرتی ہیں۔ داد میں جلد پہ چھوٹے چھوٹے دانے نکلتے ہیں جو رفتہ رفتہ پھیل جاتے ہیں۔ اس کا علاج مختلف کریموں مثلاً مائیکونزول (Miconazole)، ٹربینافائن (Terbinafine)، کلوٹریمزول (Clotrimazole)، کیٹوکونزول (Ketoconazole) وغیرہ سے ہوتا ہے۔ عموماً یہ کریمیں دو تین ہفتے تک لگانا پڑتی ہیں۔ قدرتی علاج کے چند نسخے درج ذیل ہیں:

زیتون کا تیل ۳ چمچ اور خالص شہد تین چمچ لیجیے۔ انھیں اچھی طرح ملا لیجیے۔ پھر لہسن کے دو جووں کا پیسٹ تیار کیجیے۔ وہ بھی درج بالا آمیزہ میں ملا دیجیے۔ یہ آمیزہ پھر داد سے متاثرہ جلد پر لگائیے۔ ایک گھنٹے بعد جلد دھو لیجیے۔ کم از کم دو ہفتے تک روزانہ دو تین بار یہ آمیزہ داد پہ لگائیے۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔

دوسرا سہل نسخہ یہ ہے کہ داد پہ ناریل کا تیل چند منٹ کے لیے نرمی سے ملیے۔ یہ تیل صاف نہ کیجیے۔ بلکہ دن میں تین چار بار تیل لگائیے جبکہ رات کو بھی لگائیں۔ دو ہفتے میں داد جاتی رہے گی۔ تب بھی مزید ایک ہفتہ دانوں پر تیل ضرور لگائیے۔

نمک بھی داد کے علاج میں مفید ہے۔ ایک چٹکی نمک لیجیے اور اس میں تھوڑا سا پانی ملائیں۔ یہ نمک پھر نرم کپڑے کی مدد سے دانوں پر ملیے۔ روزانہ پندرہ بیس منٹ تک یہ عمل کیجیے۔ امید ہے کہ دونوں میں سے کوئی قدرتی نسخہ استعمال کرنے سے افاقہ ہوگا۔

پانچ ماہ کا بچہ

میرا پانچ ماہ کا بچہ سینے کی چھوت میں مبتلا ہے۔ اسے بخار بھی رہتا ہے مشورہ دیجیے۔ (شہلا منڈی بہاؤالدین)

آپ کا بیٹا "التھاب القصبیات" (Bronchiolitis) نامی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس بیماری میں وائرس کی وجہ سے پھیپھڑوں میں واقع ننھی منی ہوائی نالیاں سوج جاتی ہیں۔ یہ بیماری خصوصاً تین سے چھے ماہی بچوں کو نشانہ بناتی ہے۔ اس میں مبتلا بچے بخار، خشک کھانسی، بھوک کی کمی اور بہتی ناک کا شکار رہتے ہیں۔

اس بیماری میں ایک دو ہفتے تک بچے کو عموماً کوئی دوا نہیں دی جاتی۔ اس مدت میں مرض کافور ہو جائے، تو فبہا ورنہ بیماری کی شدت دیکھ کر ڈاکٹر ادویہ دیتا ہے۔ لہٰذا بچے کا پہلے طبی معائنہ کرانا ضروری ہے۔ اس عمر میں ویسے بھی ڈاکٹر سے مشورہ لیے بغیر بچے کو کسی قسم کی دوا نہ کھلائیے۔

حلق میں زخم

س: میں جب بھی کوئی گرم یا ٹھنڈی چیز کھاؤں، تو میرے حلق میں زخم ہو جاتا ہے۔ منہ میں خارش ہوتی اور چھینکیں آتی ہیں۔ یہ خرابی کیسے دور ہوگی۔

(نایاب، کراچی)

بیان کردہ علامات ظاہر کرتی ہیں کہ آپ کے منہ کے عضلات کمزور ہو چکے۔ چناں چہ وہ گرم یا ٹھنڈی غذا کھانے پر ردعمل دکھاتے اور زخم پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے منہ میں کئی اقسام کے عضلات پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا صرف طبی معائنے ہی سے پتا چلے گا کہ آپ کے منہ میں کون سے عضلات کمزور ہو چکے۔

آپ اچھے ڈاکٹر سے ملیے اور تفصیل سے اپنی بیماری کے متعلق بتائیے۔ امید ہے کہ بیماری کی تشخیص کے بعد دوا کھانے سے منہ کے عضلات ٹھیک ہو جائیں گے۔

کپڑے میں رنگ

میرا سبز رنگ کا سوٹ ہے جس میں جامنی رنگ کا جوڑ لگا تھا۔ یہ جوڑ اب رنگ چھوڑ رہا ہے جس کی وجہ سارا جوڑا خراب ہو چکا۔ کیا جامنی رنگ اتر سکتا ہے؟

(فاطمہ، چترال)

اگر ایک لباس پر دوسرے کپڑے کا رنگ چڑھ جائے، تو عموماً بلیچ کرنے سے صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کے سوٹ میں لگا جوڑ رنگ چھوڑ رہا ہے۔ جب تک یہ جوڑ نہیں اترتا، سبز رنگ سوٹ پہ جامنی رنگ مسلسل چڑھتا رہے گا چاہے اسے جتنی مرضی بلیچ کر لیں۔ بازار میں دستیاب کیمیکلز سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ناف میں درد

س: میری عمر ۳۰ سال ہے۔ کچھ عرصہ سے میری ناف میں درد ہے۔ شدید ہو، تو ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ کیا یہ تکلیف زیادہ کام کرنے کی وجہ سے جنمتی ہے۔

(صالحہ، کراچی)

ناف میں درد ہونا سنجیدہ مسئلہ ہے۔ وجہ یہ کہ کئی بیماریاں یہ درد پیدا کرتی ہیں۔ ان میں بعض خطرناک ہیں جیسے چھوٹی آنت کا سرطان! دیگر امراض میں یہ شامل ہیں: چھوٹی آنت کی سوزش (Chronic enteritis)، اپنڈکس، ناف کا درد (Herniated navel)، چھوٹی آنت میں تھیلیاں بن جانا (Diverticulitis of Small Intestine) پیٹ کا [illegible] (Migraine)۔

غرض پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ کو کس بیماری کے باعث ناف کا درد شروع ہوا۔ یہ جاننے کی خاطر کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیجیے اور اس سے ناف کا معائنہ کرائیے۔ درست تشخیص کے بعد ہی درد کا علاج ہو سکے گا۔

شیاٹیکا کا درد

شیاٹیکا یا عرق النسا کے درد کا علاج بتائیے۔

([illegible]، کراچی)

شیاٹیکا کمر کے نچلے حصے میں واقع ایک نس کا نام ہے۔

اس نس کی پانچ شاخیں پھوٹ کر دونوں ٹانگوں اور پیروں تک جاتی ہیں۔ جب موٹاپے، زیادہ کام کرنے یا کسی بھی وجہ سے نس یا اس کی شاخ سوج جائے، تو انسان ہلکا یا شدید درد محسوس کرتا ہے۔ سنگین صورتوں میں انسان اٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔

عرق النسا کا گھریلو علاج یہ ہے کہ جھکیے نہیں اور نہ ہی کوئی بھاری چیز اٹھائیے۔ نرم گدے والی کرسی پر نہ بیٹھیے۔ ان باتوں سے درد بڑھ جائے گا۔ جس جگہ درد ہے، وہاں برف کی ڈلی گول دائروں میں کسی سے پھروائیے۔ اس کے بعد درد کی جگہ کو ہیٹر یا کسی اور شے سے حدت پہنچائیے۔ یہ گرم سرد علاج عموماً درد کی شدت میں کمی لاتا ہے۔

مریض اگر کسی سخت جگہ پر لیٹ جائے اور گھٹنوں کے نیچے تکیہ رکھ لے، تو درد میں افاقہ ہوتا ہے۔ وہ گھٹنوں کے درمیان تکیہ رکھ پہلو پہ بھی لیٹ سکتا ہے یوں کمر سیدھی رہتی ہے۔

مزید برآں مریض دو دن سے زیادہ بستر پر نہ لیٹے ورنہ درد بڑھ جاتا ہے۔ یاد رہے، یہ درد عموماً دو ہفتے برقرار رہتا ہے۔ لہٰذا چلتے پھرتے، کام کرتے قابل برداشت سرگرمیاں انجام دیجیے اور خود کو کسی مشکل میں نہ ڈالیے۔

اگر شیاٹیکا کا درد دو ہفتے سے زیادہ بڑھ جائے، پھر ڈاکٹر مختلف ادویہ دیتے ہیں۔ یہ عموماً سکن یا درد دور کرنے والی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیشہ یاد دہ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد لیجیے کیونکہ ہر مریض میں درد کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ گھر بیٹھے اپنا علاج کرنے سے مرض خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا پاؤں پہ خود ہی کلہاڑی نہ ماریے۔

خشک ہونٹ

موسم گرما ہو یا سرما، میرے ہونٹ خشک رہتے ہیں۔ ان پر پپڑیاں بھی رہتی ہیں۔ یہ کیسے درست ہوں گے۔ نیز ہونٹوں کا رواں دور کرنے والا نسخہ بھی بتائیے۔ (صالحہ، حیدر آباد)

یہ حقیقت ہے کہ خشک اور پپڑیاں جمے ہونٹ برے لگتے ہیں اور ان کی وجہ سے شخصیت کا سارا حسن گہنا جاتا ہے۔ ہونٹ وٹامن کی کمی، الرجی، نمی کی کمی دھوپ میں زیادہ رہنے اور سخت موسم کی وجہ سے خشک ہوتے ہیں۔ یہ خرابی دور کرنے کے گھریلو ٹوٹکے درج ذیل ہیں:

دو چمچ چینی میں ایک چمچ شہد ملائیے۔ یہ آمیزہ ہونٹوں پر لگائیے اور چند منٹ تک چھوڑ دیجیے۔ پھر آہستہ آہستہ انگلیوں کے ذریعے ہونٹ ملیے۔ یوں ہونٹوں پر جمے مردہ خلیے الگ ہو جاتے ہیں۔ چند منٹ ملنے کے بعد ہونٹ نیم گرم پانی سے دھو ڈالیے۔

شہد جراثیم کش قدرتی تحفہ ہے اور بہترین موائسچر پیدا کرنے والی شے بھی۔ دن میں سات آٹھ بار شہد اپنے خشک ہونٹوں پر ملیے۔ نیز گلیسرین اور شہد ہم وزن لے کر آمیزہ بنائیے۔ یہ آمیزہ رات سوتے وقت ہونٹوں پر لگائیے۔ صبح آپ کو ہونٹ نرم اور تر و تازہ ملیں گے۔

ناریل کا تیل بھی عمدہ قدرتی موائسچرائزر ہے۔ اسے بھی دن میں کئی بار ہونٹوں پر لگائیے۔ یہ خصوصاً ہونٹوں کو گرمی اور سردی کے مضر اثرات سے بچاتا ہے۔ آپ زیتون کا تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

ہونٹ کی پپڑیاں دور کرنے میں ملائی کرشماتی اثر رکھتی ہے۔ ہونٹوں پر ملائی لگائیے اور دس منٹ تک چھوڑ دیجیے۔ پھر نیم گرم پانی میں روئی ڈبو کر اس سے ہونٹ صاف کیجیے۔ روزانہ یہ عمل کیجیے تاکہ ہونٹوں کی جلد صاف شفاف ہو جائے۔

ہارمونوں کے توازن میں خرابی یا جینیاتی خرابیوں کی وجہ سے خواتین کے ہونٹوں پر رواں نکل آتا ہے۔ یہ اگر نظر آئے، تو نسوانی دلکشی کو ماند کر ڈالتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ رواں گھریلو علاج سے ختم کرنا ممکن ہے۔ ایک چمچ ہلدی، ایک چمچ پانی میں ملائیے۔ یہ آمیزہ پھر ہونٹوں پر لگا دیجیے۔ آدھ گھنٹے بعد آمیزہ

اگر کر سخت ہو جائے گا۔ تب اسے آرام سے اتار دیں۔

یہ آمیزہ مسلسل چار ہفتے تک روزانہ لبوں کے اوپر لگائیے۔ اس نسخے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ روّاں جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ یوں پھر وقتاً فوقتاً روّاں صاف کرنے کی ترکیبیں نہیں آزمانی پڑتیں۔

گلے میں سفید نشان

میرے حلق میں سفید دھبے سے پڑے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ بتائیے۔ (اقرا، کراچی)

منہ میں سفید دھبے مختلف بیماریوں کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ ان میں نمایاں بیماریاں یہ ہیں: سٹریپ تھروٹ (Strep Throat)، ٹونسیلولتھ (Tonsilolith)، ٹونسیلائٹس (Tonsillitis)، دہنی تھرش (Oral Thrush)، دہنی ہرپیز (Oral Herpes)، کینڈیڈیا سز (Candidiasis)، چھوتی خون انفیکشنز (Infections Mononucleosis) اور لیوکوپلاکیا (Leukoplakia)۔

درج بالا امراض میں لیوکوپلاکیا سرطانی بیماری ہے۔ لہٰذا منہ میں جنم لینے والے سفید دھبوں کو معمولی مت سمجھیے۔ ان سب بیماریوں کا طریق علاج مختلف ہے۔ لہٰذا پہلے ڈاکٹر کو دکھائیے تاکہ آپ جان سکیں، کس بیماری کے باعث آپ کے منہ میں سفید دھبے پڑے ہیں۔ تبھی ان کا علاج ہو سکے گا۔

پیلے دانے

میری آنکھ کی پتلی میں پیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے دانے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھیے۔

(ثمینہ، اسلام آباد)

گرد و غبار اور دھوپ میں زیادہ رہنے کی وجہ سے آنکھوں میں پیلے و سفید رنگ کے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ یہ دور سے دانوں کے مانند نظر آتے ہیں۔ طبی اصطلاح میں ایسے دانے نکلنے کی حالت پنگوکولا (Pinguecula) کہلاتی ہے۔

یہ دانے اگر چھوٹے رہیں، تو نقصان نہیں پہنچاتے۔ لیکن یہ دیکھنے میں رکاوٹ بننے لگیں، تو ماہر امراض چشم مختلف طریقوں سے اس کا علاج کرتے ہیں۔ یہ دانے غیر سرطانی ہیں تاہم بہتر ہے کہ آپ کسی اچھے ماہر امراض چشم سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرا لیجیے۔

پیروں میں درد

میری عمر ۶۴ سال ہے۔ میرے پیروں میں سوجن ہے اور درد بھی۔ کیا ایسا زیادہ چلنے کی وجہ سے ہوتا ہے؟

(عارفہ شمیم، کراچی)

ہمارے پیر پورے جسم کا وزن سنبھالتے ہیں۔ اسی لیے پیروں کی کسی شریان، عضلے، نس، رباط وغیرہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچے، تو وہ سوج کر تکلیف دینے لگتی ہے۔ جدید طبی سائنس پیروں کی "۲۰۰" سے زائد بیماریاں یا خلل دریافت کر چکی۔

زیادہ پیدل چلنے سے بھی پیروں کی کم از کم دس تکالیف جنم لیتی ہیں۔ ان میں یہ خلل شامل ہیں: پلانٹار فاشئیٹس (Planter Fascitis)، ان گروون ٹونیل (Ingrown Toenail)، بونیون (Bunion)، اکلیز ٹینڈنٹس (Achilles tendinitis)، لمبر سٹرین (Lumber strain)، نیوروما (Neuroma)، شن سپلنٹس (Shin Splints)، برسائٹس (Bursitis)، رنرز نی (Runner's Knee) اور سٹریس فریکچر (Stress Fracture)۔

تکالیف کی درج بالا اقسام پیروں کی کوئی نس، شریان یا عضلہ سوجنے سے جنم لیتی ہے۔ گھریلو علاج یہ ہے کہ پیروں پر برف سے ٹکور کیجیے۔ نیز زیادہ سے زیادہ آرام کریں۔ درد کم کرنے والی دوا بھی کھا سکتی ہے۔ اگر ان اقدامات کے بعد بھی تکلیف نہ جائے، تو اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔ وہ تشخیص کے بعد بہتر علاج کر سکے گا۔

میں کمزور ہوں

میری عمر ۲۴ سال ہے۔ میں بچپن سے کمزور ہوں۔ ایسا مشورہ دیجیے کہ میرا وزن بڑھ سکے۔

(وسی، بلوچستان)

وزن گھٹانا نہیں بڑھانا بھی بہت مشکل ہے۔ بہرحال آپ سب سے پہلے تو دن میں پانچ چھے ہلکے پھلکے کھانے کھائیے۔ اپنی غذا میں گوشت، انڈے، سالم اناج، مغزیات، ڈیری مصنوعات اور دالیں شامل رکھیے۔ ان میں موجود پروٹین عضلات کا گوشت بڑھائے گا۔

بازاری کھانوں، برگروں اور دیگر کھانوں سے پرہیز کیجیے۔ گو یہ کھانے بھی وزن بڑھاتے ہیں مگر ان کے نقصانات زیادہ ہیں، فوائد کم۔ البتہ چاول اور آلو کھا سکتے ہیں۔ کھانے سے پہلے، دوران اور بعد میں پانی نہ پیجیے کیونکہ یہ پیٹ کو بھر دیتا ہے اور انسان کم کھانا کھاتا ہے۔

عمدہ غذا کھانے کے علاوہ ورزش بھی کیجیے لیکن معتدل مقدار میں۔ مزید برآں ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی کچھ کھائیے، یہ وزن بڑھانے کا سہل نسخہ ہے۔ اگر کھانے پینے سے آپ کا ضرورت سے زیادہ وزن بڑھ جائے تو کھانا کم کر دیجیے۔

خارش کا مریض

میں خارش کا مریض ہوں۔ اس خارش کی وجہ سے میرے بال جھڑ رہے ہیں۔ اور سر پر گنج کے ٹکڑے نمودار ہو چکے۔ یہ خارش کیونکر دور ہو گی؟

(راشد، آزاد کشمیر)

ہماری جلد پر لاکھوں ننھے منے دکھائی نہ دینے والے کیڑے (Mites) پائے جاتے ہیں۔ ان کیڑوں کی بعض اقسام جسم میں خارش پیدا کرتی ہیں۔ جب یہ خارش سر تک پہنچ جائے تو پھر بال بھی گرا دیتی ہے۔ اسی قسم کی شدید خارش جسم میں ننھے منے سرخ دانے بھی پیدا کرتی ہے۔

خارش کا خوش قسمتی سے گھریلو علاج دستیاب ہے۔ اس ضمن میں نیم کا تیل مفید ہے۔ نیم کا تیل صاف ستھرے کپڑے پر ڈالیے۔ یہ کپڑا پھر نرمی سے خارش زدہ جگہوں پر پھیریے۔ تیل پندرہ بیس منٹ تک لگا رہنے دیجیے تاکہ کیڑے مر جائیں۔

یہ عمل دن میں دو بار صبح شام دہرائیے۔ نیم کا تیل نہ صرف دانے مٹاتا اور سوجن کم کرتا بلکہ خارش بھی ختم کر دیتا ہے۔

گندھک بھی خارش کا موثر علاج ہے۔ ایک حصہ گندھک میں بیس حصے ویزلین یا پٹرولیم جیلی ملائیے۔ دونوں کو اچھی طرح ملا لیجیے۔ یہ آمیزہ پھر خارش زدہ جلد پر لگائیے اور اُسے لگا چھوڑ دیجیے۔ صبح یا دوپہر کو لگائیے، شام کے وقت نہا لیجیے۔ یہ نسخہ چند ہفتوں میں خارش ختم کر ڈالتا ہے۔

ہڈیوں کی کمزوری

میری ہڈیاں کمزور ہیں۔ انھیں طاقتور بنانے کے لیے مشورہ دیجیے۔ میری عمر ۶۳ سال ہے۔

(قاضی حبیب احمد، ملتان)

انسان جب تک جوان رہے، اس کی ہڈیاں مضبوط اور توانا رہتی ہیں۔ لیکن جوں ہی بڑھاپا حملہ کرے، وہ کمزور ہونے لگتی ہیں۔ یہ کمزوری روکنے میں غذا کا بنیادی کردار ہے۔ انسان اگر مطلوبہ غذا باقاعدگی سے کھاتے رہے، تو اس کی ہڈیاں آخر دم تک مضبوط رہتی ہیں۔

کیلشیم ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ لہٰذا آپ اپنی غذا میں دودھ، دہی اور پنیر شامل کیجیے۔ اس عمر میں آپ کو روزانہ ۱۰۰۰ ملی گرام کیلشیم لینا چاہیے۔ آپ کیلشیم کی گولیاں کھا کر بھی یہ ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ یاد رکھیے کہ جسم میں کیلشیم جذب کرانے کے لیے وٹامن ڈی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لہٰذا روزانہ بیس پچیس منٹ دھوپ میں ضرور بیٹھیے۔ دھوپ اس وٹامن سے مالا مال ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ کیلشیم اور وٹامن ڈی کے ذریعے آپ اپنی ہڈیاں مضبوط بنا سکیں گے۔

جب دو اسمگلر بری طرح پھنس گئے

پولیس ہمارے پیچھے ہے

مشہور ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے اور واقعی کبھی کبھی وہ پانی میں مگرمچھ بھی نہیں دیکھ پاتا

جارج برنارڈ شا

آج میں آپ کو اپنے عزیز دوست کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ میرا دوست ایڈورڈ اسمگلر ہے مگر صحیح معنوں میں ایک آرٹ ڈیلر اور فن کا شیدائی۔ اس کا کام یہ ہے کہ آرٹ کے نادر نمونے ادھر سے اودھر کرتا رہے اور انھیں ان کے قدر دانوں کو بیچ کر اپنا معاوضہ وصول کر لے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں



نادر و نایاب تصاویر بکھری پڑی ہیں۔ اسی طرح بے انتہا دولت مند لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک اپنے شوق کے ہاتھوں گراں قدر رقم لٹا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایڈورڈ کا ایسے لوگوں کو تلاش کرنا اور ان سے معاملہ طے کر لینا ہی اس کی کاریگری ہے۔

مثال کے طور پر ایک زندہ دل ادھیڑ عمر خاتون خوبیِ تقدیر سے بیٹھے بٹھائے ایک کروڑ ڈالر کی مالکہ بن گئی۔ ایک روز لندن کے ایک ارب پتی کے دل میں سمائی کہ اسے وان گف کی بنائی ہوئی خوبصورت گلدستے والی پینٹنگ کی ضرورت ہے جسے وہ اپنی خواب گاہ میں سجا سکے۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے کسی دوست سے کیا۔ وہ میرے دوست ایڈورڈ سے واقف تھا۔ چناں چہ معاملہ اب ایڈورڈ کے ہاتھ میں آ گیا۔

اب اسے بھی قسمت کی خوبی ہی سمجھ لیجیے کہ صرف دو ہفتے قبل ایڈورڈ نے زیورچ میں وان گف کی ایسی ہی ایک دل آویز پینٹنگ دیکھی تھی۔ یہ تصویر ایک ولندیزی خاتون کی



عقلیت تھی۔ ایڈورڈ نے خاتون کو نجانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ محض ایک سو ڈالر میں تصویر ایڈورڈ کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئی۔ تصویر لے کر ایڈورڈ فوراً لندن روانہ ہو گیا جہاں ادب کا قدر دان اس کا منتظر تھا۔ فوراً ہی ایڈورڈ کو ایک بھاری رقم کا چیک مل گیا۔ تو یہ ہے میرے دوست ایڈورڈ کا کاروبار۔

اس کے پاس یہ معلومات رہتی ہیں کہ کس قسم کا مال کہاں مل رہا ہے، کس طرح طلب و رسد کا فرق ادا اور اپنا منافع حاصل کرنا ہے۔ اصلی اور نقلی مال کی اس کاروبار میں کوئی حیثیت نہیں۔

ایک رات ہم دونوں پیرس کے شاندار ریستوران میں بیٹھے تھے۔ اچانک ایڈورڈ نے انکشاف کیا "اس وقت مائیکل اینجلو کے دو شاندار نمونے میرے قبضے میں ہیں۔ اگر کوئی گاہک تمہاری نظروں میں ہو تو خیال رکھنا۔"

"ایک وقت دو تصاویر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ایڈورڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "یہ تصاویر مجھے آسانی سے مل سکتی ہیں اور مارکیٹ میں ان کی مانگ بھی ہے۔"

اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور پھر مجھے تکتے ہوئے بولا "تم کہانیاں لکھتے ہو۔ تم نے کئی ایسی کہانیاں بھی لکھیں جن میں آرٹ کے نوادرات یا نمونوں کی چوری کی داستانیں رقم ہیں۔ پھر چوری کا مال ٹھکانے لگانے میں جس ہمت، شجاعت اور جواں مردی کی ضرورت ہے، انھیں بھی اپنی کہانیوں میں خوب نمک مرچ لگا کر ذکر کرتے ہو۔ لیکن کیا کبھی عملی زندگی میں تمھیں ان حادثات سے گزرنے کا اتفاق ہوا؟ کیا تم ایسا کوئی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند کرو گے؟"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آج تم میرے ساتھ رہو اور دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مجھے آج رات بارہ بجے ایک معرکہ انجام دینا ہے۔" ایڈورڈ نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

جارج برنارڈ شا



آئرلینڈ کے ممتاز ڈراما نگار، افسانہ نگار اور ادیب، جارج برنارڈ شا ۲۶ جولائی ۱۸۵۶ء کو ڈبلن شہر میں پیدا ہوئے۔ ۲ نومبر ۱۹۵۰ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی تخلیقات معاشرتی موضوعات پر ہیں جن میں طنز و مزاح کا رنگ نمایاں ہے۔ شا نے تعلیم، شادی، مذہب، حکومت، صحت اور طبقاتی تقسیم کو ڈراموں کا موضوع بنایا۔ آپ واحد ادیب ہیں جنھیں ادب کا نوبل انعام (۱۹۵۶ء میں) اور اکیڈمی ایوارڈ (۱۹۳۸ء میں) ملا۔

"بہت خوب....." میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "لیکن آج میرے پاس وقت بالکل نہیں۔ میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "بہادری کے کارنامے تو تمھاری کہانیوں کی زینت ہوتے ہیں، ہے نا! زندگی یہ ہے اور اس کا صحیح لطف کیا مفہوم رکھتا ہے، یہ کسی بلند حوصلہ شخص سے پوچھو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست!" میں نے کہا۔ پھر اچانک میری غیرت جوش میں آگئی۔ "بتاؤ کہاں چلنا ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔" میں بول اٹھا۔

ایڈورڈ ہنسا اور کہا "آج مائیکل اینجلو کے دو نمونے ٹھکانے لگانے ہیں جو میرے قبضے میں آچکے۔ لیکن اس مرتبہ یہ کاروبار خفیہ طور پر نہیں بلکہ سرعام اور بڑی قسمتوں کی رونق میں انجام پائے گا۔ میں تمھیں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" ہم دونوں نے پھر جلدی جلدی کھانا کھایا اور مطلوبہ

مادام کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ اپارٹمنٹ ایک بوسیدہ سی عمارت میں واقع تھا۔ لیکن جس ڈرائنگ روم میں ہم داخل ہوئے وہ نہایت ہی شاندار اور عالیشان تھا۔ قدیم فرانسیسی روایات کے مطابق تمام فرنیچر کمرے کے بالکل درمیان بڑے خوبصورت طریقے سے سجا تھا۔ مادام تھریسیا بذات خود بھی اپنے ڈرائنگ روم کی طرح سجی سجائی اور پروقار نظر آئی۔

ایڈورڈ نے میرا تعارف کرایا اور مادام نے سرد مہری سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد وہ اور ایڈورڈ فرانسیسی میں بڑے زور و شور سے کاروباری گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ فرانسیسی میں خود بھی بہت شد بد رکھتا ہوں لیکن وہ دونوں اتنی تیزی سے بات کر رہے تھے کہ میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد مادام اٹھی اور دیوار میں رکھی ایک مقفل الماری کی طرف بڑھی۔ اندر سے اس نے دو تصویریں نکالیں اور دونوں دوبارہ گفت و شنید کرنے لگے۔ لیکن میں نے اس بار کوئی توجہ نہ دی۔

یہ دو کم عمر اور زرد رو لڑکیوں کی تصویریں تھیں جن کے چہرے پر معصومیت برس رہی تھی۔ ان کی نم آنکھیں ان کے حسن میں مزید چار چاند لگا رہی تھیں۔ لیکن اصل حسن تو آرٹسٹ کا کمال فن تھا۔ اسے دیکھ کر آرٹسٹ کی انگلیاں چومنے کو دل چاہتا۔ واقعی ان تصویروں کی قیمت کسی بھی قدردان سے اچھی خاصی مل سکتی تھی۔

قیمت کا مسئلہ طے ہوتے ہی ایڈورڈ نے اپنا بریف کیس کھول کر میز پر رکھ دیا۔ بریف کیس میں ہزاروں فرانک کے نوٹوں کی بالکل نئی گڈیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ یہ رقم میرے خواب و خیال سے بھی زیادہ تھی۔ مارے حیرت کے میرے ہونٹوں سے سیٹی نکل گئی۔ مادام تیزی سے جھپٹی اور تمام نوٹ مع بریف کیس سینے سے بھینچ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بادامی رنگ کا چھوٹا سا کاغذی لفافہ تھا۔ اس نے تصویریں لفافے میں رکھیں اور ایڈورڈ کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔

گھر پہنچ کر میں پر سکون نیند سو گیا۔ لیکن صبح اٹھتے ہی مجھے اس خوف نے گھیر لیا کہ کہیں کسی نے مجھے مادام تھریسیا کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو۔ اگر بعد میں کبھی تصویروں کی وجہ سے کوئی معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ دنوں کے لیے پیرس سے باہر چلا جاؤں۔ میں نے اپنے فیصلے کا ذکر ایڈورڈ سے کیا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "تم نے صحیح فیصلہ کیا۔ میں سوئٹزرلینڈ جا رہا ہوں تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

"لیکن میں سوئٹزرلینڈ جانے کے موڈ میں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم میرے ساتھ چلو۔ اس کے بعد جہاں جی چاہے چلے جانا" ایڈورڈ نے زور دیا۔

"تم مجھے سوئٹزرلینڈ جانے پر مجبور کیوں کر رہے ہو؟ کیا وہاں کوئی اور سودا کرنا ہے؟ اگر ایسا ہے بھی تو کیا میرے بغیر کام نہیں ہو سکتا؟" میں نے تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

ایڈورڈ میرے سوالات سن کر غصے میں آیا لیکن اس نے خفیہ رازدارانہ لہجے میں مجھے سمجھانا شروع کیا۔ "کل دو پینٹنگز میں نے سوئٹزرلینڈ میں ایک قدردان کے حوالے کرنی ہیں۔ آدھی رقم وہ پیشگی دے چکا۔ بقیہ تصویریں دینے کے بعد وصول کرنی ہے۔ خرچہ میں برداشت کروں گا۔"

ایڈورڈ نے مجھے لالچ دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "تم تو جانتے ہو کہ کسٹم والوں کی نظر میں میری حیثیت مشکوک ہے۔ میرے پاس وہ غیر قانونی تصویریں ہیں۔ اگر پکڑا گیا تو سیدھا جیل جاؤں گا جبکہ تصویریں تمہارے سامان میں ہوں

گی اور ہم دونوں لاتعلق رہ کر سفر کریں گے۔ اس طرح بچنے کے امکانات کافی زیادہ ہیں۔ پھر بھی کوئی گڑبڑ ہوئی، تو میں تمام الزام اپنے سر لے لوں گا اور تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تم میرے دوست ہو نا؟" اس نے یاس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

بادل ناخواستہ میں نے ہامی بھر لی۔ میری فطرت میں یہ کمزوری بھی ہے کہ میں کسی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کو میری مدد کی ضرورت ہو، تو میں اپنا نقصان کر کے بھی اس کا کام کر دیتا ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا۔ میرے اقرار پر ایڈورڈ میرے گلے لگ گیا۔ اگلے ہی دن ہم سفر پر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

اچانک ریل رک گئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "میں کہاں ہوں اور یہ ریل یہاں کیوں رک گئی ہے؟" میں حواس باختہ ہو کر چلایا۔ پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بتیاں جل رہی تھیں۔ باہر بے انتہا شور تھا اور اس سے بھی زیادہ ہنگامہ ہمارے دروازے پر تھا۔ دروازہ دھڑادھڑ پیٹا جا رہا تھا اور چیخ و پکار مسلسل جاری تھی۔

"ہم بل باؤس اسٹیشن پر ہیں..... فرنچ کسٹم اسٹیشن۔" ایڈورڈ نے مجھے پریشان دیکھ کر مطلع کیا۔

"ارے نہیں!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور ساتھ ہی پھر دروازہ مسلسل دھڑ دھڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ ایڈورڈ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ فوراً ہی ایک پستہ قد کسٹم آفیسر اندر داخل ہوا۔ ایڈورڈ اسے بتانے لگا کہ ہم لوگ سیاح ہیں اور چند روز سیر و تفریح کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ میں ایڈورڈ کی باتیں حیرت سے منہ کھولے سن رہا تھا۔ اس کی خوبصورت اور ماہرانہ فرنچ نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر امریکی لب و لہجے میں اپنا مافی الضمیر ادا کر رہا تھا۔

"اپنا سامان کھولو!" افسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں تلاشی لوں گا۔" اس نے ایڈورڈ کا سامان چیک کیا اور پھر میری طرف مڑا۔ سوٹ کیس سے فارغ ہونے کے بعد اس کی نگاہیں بادامی رنگ کے بوسیدہ لفافے پر جم کر رہ گئیں۔ "وہ کیا چیز ہے؟ اسے نیچے اتارو!"

مجبوراً مجھے لفافہ نیچے اتارنا پڑا۔ آفیسر نے لفافہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور تصویریں باہر نکال کر حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔ اس نے تصویروں کو کھڑکی کے سہارے سیدھا کھڑا کیا اور خود پیچھے ہٹ کر بہ نظر غائر ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مسلسل تصویروں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ فرط مسرت سے گلنار ہوتا گیا۔ اچانک وہ ہماری جانب مڑا اور تیز لہجے میں بولا "ان تصویروں کو اسی طرح چھوڑ دو۔ میں اپنے چیف کو لے کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میری جان نکلی جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد میں بے دم ہو کر گر پڑا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ "اف خدایا!" میں گھگیایا۔ "یہاں تو کوئی ہمارا واقف بھی نہیں۔ اتنی رات گئے ہم کس سے مدد طلب کریں گے۔"

ایڈورڈ کی حالت خود خراب ہو رہی تھی۔ میری بات پر اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی اور کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں کسٹم آفیسر کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ کوئی لاکھوں فرانک کی قیمتی تصویر ایسے خستہ حال لفافے میں لے کر سفر کر سکتا ہے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ یہ کوئی عام سی تصویریں ہیں۔"

"خیر! کسٹم والے اس قدر احمق نہیں ہوتے۔" میں نے اس کا تمسخر اڑایا۔ "میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ اگر کسٹم آفیسر ہوتا تو سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آتا کہ کسی قیمتی چیز کو پھٹے پرانے لفافے میں رکھ کر چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"تم احمقانہ خیال کو اپنے ہی پاس رہنے دو۔" ایڈورڈ

میری بات پر ناراض ہو گیا۔" اپنے دانت منہ کے اندر رکھو اور چہرے پر یوں ہونق پن طاری کر لو جیسے تم کچھ جانتے ہی نہیں۔" وہ پھر منہ ہی منہ میں نجانے کیا بڑبڑانے لگا۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا اور گاڑی دھیرے دھیرے رینگنے لگی۔ کسٹم آفیسر کا کوئی پتا نہ تھا۔ ہم دونوں مستعد ہو کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ گاڑی واقعی چل پڑی تھی اور فوراً ہی اسٹیشن کی روشنی پیچھے رہ گئی۔ میں نے طویل انگڑائی لی اور مسرور ہو کر باہر کی رونقیں دیکھنے میں غرق ہو گیا۔ لیکن جلد ہی یہ خوشی غم میں تبدیل ہونے لگی۔ ذرا دیر گزری تھی کہ زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں اور ریل پھر کھڑی ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے ہمارے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور کسٹم آفیسر ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک تو وہی پستہ قد جونیئر افسر تھا اور دوسرا اس کا چیف۔

چیف افسر نے ہم دونوں کو تعظیم دی اور آگے بڑھ کر تصویروں کو بہ غور دیکھنے لگا۔ "کیا یہ تصویریں آپ کی ہیں؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ قوت گویائی جواب دے گئی۔ مجبوراً میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

چیف نے اپنی عینک کے شیشے صاف کیے اور ایک بار پھر تصویروں پر جھک گیا۔ "بہت ہی پیاری اور دیدہ زیب پینٹنگ ہے۔ نہایت نفیس اور خوبصورت۔" اس نے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا اور بڑی سعادت مندی اور عجز سے کہنے لگا:

"میں خود بھی ایک مصور ہوں۔ مجھے مصوری سے عشق ہے۔ میں اپنی فرصت کا تمام وقت پینٹنگ ہی پر صرف کرتا ہوں۔ میرے دل میں آرٹسٹوں کی بے حد قدر و منزلت ہے۔ آپ بھی ایک عمدہ مصور ہیں اور میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اتنی زبردست تصویر بنائی۔ اس وقت میری نگاہوں میں آپ کا درجہ ایک ہیرو کی طرح ہے۔ خدا نے آپ کو بڑی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ کا انداز نرالا اور منفرد ہے۔ میں آپ کی عظمت کا معترف ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر تعظیمی انداز میں اپنی گردن خم کی اور خوشی سے معمور چہرہ لیے باہر نکل آیا۔

کسٹم افسر کے باہر نکلتے ہی ریل نے ایک زبردست جھٹکا لیا اور چل پڑی۔ ہم دونوں مبہوت ہو کر سوچنے لگے۔ "یہ کیا ہو گیا اور کیسے ہو گیا!" ہم نے سوچا اور اپنی اپنی جگہ پھر مسکرانے لگے۔

◆◆◆

سہانا موسم

آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا اور ہر طرف کھیتوں میں چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح رمضان کا مہینا گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے۔ جس میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوف خدا اور حب خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام کر رہا ہو، تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو، تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(روزہ اور رمضان، خرم مراد، انتخاب: الطیب جان، واہ کینٹ)

مزاح

ماضی کے ''نامور'' شاعر

حکیم خانہ خرآب چمکار آبادی سے ملیے

اس تاریخی شخصیت کا قصہ بے بدل جو دوسری بیوی سے لڑتے ہوئے کام آئے

محمد ناصر خان



آج میری تحقیق وتنقید کا محور جناب حکیم خانہ خراب چمکار آبادی ہیں اور ان کا ''دیوان خانہ خراب''۔ میری تحقیق سے پہلے اس قدیم نسخے پر صاحب ذوق جھینگر اور ادب کی عاشق زار دیمک محترمہ اپنی برادری سمیت خاصی ایڈیٹنگ کر چکی تھیں۔

بڑی مشکلوں سے بچایا اسے
خرابوں سے میں ڈھونڈ لایا اسے

دوسری اہم بات بھی محل نظر رہے کہ اس مضمون کے تمام حوالے مستند تذکرات، ٹُو ٹوک سوانح حیات اور بے سر و بے لاگ حالات شعرا جیسی بازاری قسم کی کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ اس لیے برادر نقادین کرام، اعتراض برائے اعتراض کے متقدین عظام اور محققان کل وعقد محتاط رہیں کہ جملہ حقوق برائے تنقید مزید میرے نام میں محفوظ و مامون ہیں۔

نام

تذکرہ گمنام شعرا میں جسے آپ کے معاصر حکیم ستیاناس عطائی نے تالیف کیا، آپ کے بہت سے نام درج کیے ہیں۔

سب سے مضبوط روایت ٹارزن صدیقی کی ہے جو بدیسی شاعر تھے اور شاعری کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کی خاک چھانتے پھرے۔ صادق آباد میں آ کر صدیقی کے لقب سے ملقب ہوئے۔ آپ نے حکیم صاحب کا صحیح اور سالم نام ''بدتمیز خان'' لکھا ہے۔ ٹارزن صدیقی کی تحریر کا حوالہ مندرجہ ذیل ہے:

Mr. Bad Tameez Khan hailed from some alien land, possibly Herat and due to poverty he settled in Chamkarabad in India

(مسٹر بدتمیز خان کا تعلق کسی اجنبی دیس شاید ہرات سے تھا۔ غربت کے باعث وہ ہندوستان چلے آئے اور چکار آباد میں آباد ہوئے)

مزید کئی تذکرہ نویسوں اور مختلف معاصرین نے بھی الٹی سیدھی چھلانگیں لگائی ہیں۔ ایک صاحب نے آپ کا نام نامی اسم گرامی "بے تمیز خان" لکھا ہے حالانکہ "بے" اور "بد" کے درمیان فرق کی عمیق خلیج حائل ہے۔ دوسرے ایک صاحب نے یوں قلم تراشا ہے:

"اصل نام تمیجو خان تھا مگر پیار سے لوگ انھیں تمیجو چمار اور پھر تمیجو چمار کہنے پر اتر آئے۔"

(سوانح تمیجو چمار جلد ہشتم صفحہ دیمک چاٹ گئی)

راقم الحروف نے آپ کی اصلیت و نام کے بارے میں بہتیری دوڑ دھوپ کی۔ پتا چلا، راقم کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات وثوق کی حدود سے باہر نکل چکی ہے۔ آپ کا اصلی اور خالص دیسی نام خان تمیز گل تھا۔ آپ پیار اور ادب کی طرف سے بھی نہایت ادب فہم تھے۔ نام کی تصدیق کے لیے انھی کا ایک شعر آپ کی نذر ہے:

دلدل پھنسا ہے یار کا دلدل میں گل کا پاؤں
چل مل کے ہم نکالیں اسے اے تمیز گل

(پروفیسر خواجہ یزدانی نے اس شعر کو کسی اور گل سے منسوب کیا ہے جو سراسر غلط العام اور بدنیتی پر محمول کیا جا سکتا ہے)

پیدائش

صدی کے وسط میں جنتری کی کسی تاریخ بروز بدھ آپ اپنے ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے۔ پیدائش کے تین سو پینسٹھویں دن تقریباً غزلیں رو رو کر بیان کیں اور یوں باقاعدہ اپنی شاعری کی داغ بیل ڈال دی۔ بعد میں خانہ خراب کے تخلص سے مخلص ہو کر اپنی زندگی میں خوب نام کمایا۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ پیدائش یوں کہی:

کیا بات پوچھتے ہو خانہ خراب کی
اس میں بدھ کا روز بنتا مگر مہینہ جون کا نکلتا ہے۔ سال بے وزن ہے۔

تعلیم

شاعری کا اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ بطن مادر پرائمری اسکول وکھ آباد سے ملا۔ مزید تعلیم کے لیے آپ کو بے پر کی بھیج دیا گیا۔ بعد میں آخری ڈگری کشور ہندوستان کی سب سے بڑی شاعر گھر یونیورسٹی، لاہور سے جتھیائی۔ شاعری کے ساتھ حکمت بھی کرنے لگے۔ لوگ انھیں اپنا مرض بتاتے، آپ ان کو شعر سناتے۔

معلوم ہوتا ہے آپ کی عمر کا خطیر حصہ جڑی بوٹی حکمت میں ہی صرف ہوا کیونکہ مفتی روشن دین حلوائی نے اپنی مشہور، مگر نایاب کتاب "ایک برفی ہزار لڈو" میں آپ سے دکان حکمت پر اپنی ملاقات حسرت آیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"دروغ بگردن راوی و چناب، آخر روز (سال مٹا ہوا ہے) بندہ چکار آباد رسیدم۔ ایشان بر دکان طب نشستہ بودند۔ چہار زانو زدہ یک رفتہ سلامی عرض کردم۔ بالب ہائے بستہ ہندی جواب دارند۔ ورفتہ منم۔" (ایک برفی ہزار لڈو صفحہ ۱)

شادی اور اولاد

نصیب جاہلاں روایات سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے شادی بھی کی۔ تحقیق کے خراب کی شادی خانہ آبادی کس تاریخ کو انجام پائی، کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک چینی سوانح نگار چیں شوں شانگ نے جاپانی مورخ اوانگا بونگا کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے۔

"His wife was too much social. Social

activities involved her so much that one day, and forever she forgot the track back to her home. This made our great poet weep and weep under the moonlit sky of old past days. Then he married a second blonde.

(ان کی بیگم سماجی کارکن تھیں۔ ایک دن سماجی سرگرمیوں میں ایسی محو ہوئیں کہ گھر پلٹنا ہی بھول گئیں۔ اسی پہ ہمارے عظیم شاعر پہروں چاند کی روشنی تلے روتے رہے۔ انھوں نے پھر دوسری ماہ پارہ سے بیاہ رچالیا۔ لیکن دوسری سوانح عمری سے پتا لگتا ہے کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپ کی جائز اور دوسری اولاد کا شمار انگلیوں کی پوروں پر ہو سکنا کارے دارد ہے۔ معدودے چند شعرا کرام کے نقطہ نظر کے اکثریت نسلاً بعد نسل حکیم خانہ خراب کی اولاد معنوی گنے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وفات

آپ ایک کم سو برس کے تھے کہ دوسری بیوی کے کام آئے۔ آپ کے سر، سینہ اور بازوؤں پر بھنکنیوں کے تین نشانات پائے گئے۔ پوسٹ مارٹم کے سے ڈاکٹروں نے ایک چمٹا آپ کے پیٹ اور بیلن کے ٹکڑے کھوپڑی سے برآمد کیے۔ آپ کی وفات پر پورے ہند و سندھ میں رات کے وقت خوشی اور خموشی چھائی رہی اور اکثر دیپ گل کر دیے گئے۔ آپ کے سفر آخرت کی تاریخ یہ نکلی:

خس کم جہاں پاک
خانہ خراب مرد بیباک
مرد زمرگ حسرت ناک

پروفیسر ڈاکٹر شالی نے اپنی کتاب "لیوڈا گا ہے" میں حکیم خانہ خراب کو شہید لکھا ہے۔ چینی اور مشرقی علما کا بھی یہی خیال ہے مگر شگفتہ کالا باغوی نے اپنی کتاب "تحقیق فتاویٰ" میں اسے حرام موت قرار دیا۔

کتابیں

آپ نے لے دے کے کل چار کتابیں تصنیف کیں:

(۱) قصہ چہار درویش پارینہ..........پنج قصص فارسی نثر

(۲) تحفۃ الخواتین (عربی نظم).........یہ کتاب عورتوں کی جملہ خصوصیتوں سے متعلق ہے۔

(۳) دنیا گھر دے باگاں دا.........ہندکو غزلیں اور نظمیں

(۴) دیوان خانہ خراب ....کتابی کیڑے چٹ کر گئے۔ جلد محفوظ ہے مگر اس پر مکھیوں کی کارستانیوں کے اتنے نشانات پائے گئے کہ نام تک سوائے راقم کے کوئی مائی کا لعل نہیں پڑھ سکتا اور من آنم کہ من دانم۔

خصوصیات کلام

بہت سے پیشہ ور نقاد آپ کے مداح اور تذکرہ نویس معترف گزرے ہیں۔ مولانا زکام کھانسوی اور نزلہ بخاری نے تو آپ کو آسمان شاعری کا مدار ستارہ قرار دیا۔ ابن لائیلہ نے جنھوں نے اردو شعرا کا "تذکرۃ الشعرا الہندی" لکھا، آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لاریب فیہ الحکیم الخانۃ الخراب الہندی شاعر عظیم وقدیم و کان نادرۃ الدہر۔ (الشعرا الہندی جلد اول)

آپ کے دیوان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے، خارجی اثرات اور اندرونی کیفیات سے متاثر ہو کر لکھے ہوئے شعر کئی دیوانوں پر بھاری ہیں۔ ہمارے ہند کے شعرا میں حکیم خانہ خراب امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری کا سواد غم ذات اور غم دوراں سے عبارت ہے۔ آپ کا ذوق جمالیات، جمالیات کے تمام حدیں پھلانگتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عشق وہ کھیل نہیں ہے جسے لونڈے کھیلیں

ڈاکٹر: جب کار ایک عورت چلا رہی تھی، تو تمہیں سڑک سے دور ہٹ جانا چاہیے تھا۔
مریض: کون سی سڑک؟ میں تو پارک میں لیٹا ہوا تھا۔
(احسن کمال یوسفزئی، اسلام آباد)

سر کھل جاتے ہیں ضربت کے پڑتے پڑتے

یہ رقیب رو سیاہ اور ظالم سماج کی چیرہ دستیوں کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ اس شعر میں تو رمزیت کا فن انتہا کو چھو چکا، وسعت اور گہرائی ملاحظہ ہو۔

جب سے تجھ کو دیکھ لیا ہے
اپنا خانہ خراب کیا ہے

تشبیہات شاعری کا جز ہوتی ہے۔ حکیم خانہ خراب کے زیر استعمال استعارات میں جدت، تشبیہات میں ندرت اور کلام میں شوخی بیاں اور نئے نئے مضامین باندھنے میں آپ کو خصوصی دسترس حاصل ہے۔

تیری زلفیں گھوڑے کی دم
گاہے پنکھا، گاہے خر دم

شعروں کی بیت ترنم اور متنوع بحور سے مزین ہوتی ہیں۔ سادگی، آسانی اور روانی ملاحظہ ہو۔

گورے گورے گالوں پہ کالا تل ایسے
رکھا ہو کوئلہ، ملائی پہ جیسے

کوئلے اور تل کی مثال اور ملائی اور گال کی رعایت سماں باندھ دی۔

آپ اپنا تخلص مقطع میں یوں کھپا دیا کرتے کہ وہ معانی سے پُر لفظ بن جاتا۔ مشتے از خروارے چند مقطعے ملاحظہ ہوں:

ایک دوسری جگہ فرمایا:

سائیں سسر ہوں کہ سالیاں سالے
ان کے دم سے ہوا ہے خانہ خراب

اب اس شعر کی صداقت بانگ دہل فریاد کر رہی ہے۔

صنم تو ایک طرف ہے، مریض کا بھی یہاں
ہمارے ذوق طبابت سے ہوا خانہ خراب

اس میں تھوڑا سا ابتذال در آیا ہے، مگر صداقت سے مفر نہیں۔

کافی چھان بین کے بعد یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچی کہ

حکیم خانہ خراب کو موسیقی سے بھی خدا داد شغف کا لگاؤ تھا۔ بیشتر غزلوں کے ٹکڑے قوالی میں لگا لگا کر قوال آپ کی مترنم بحور سے محفلوں میں چار چاند لگاتے رہے۔ حروف کی تکرار سے موسیقی پیدا کرنے میں آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ مثال سے نمایاں کرتا ہوں:

کس سے کہیں کیا پایا ہے
دل دے کر دکھ دیکھا ہے

ننھی بحور میں آپ کی غزلیں سبز مرچیں ہیں، جتنی چھوٹی اتنی تیکھی۔ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے، جیسے ایک خوش اندام حسینہ ندی کنارے گھاس کے مخملیں فرش پر محو خواب ہو اور کوئی شریر چنچل مکھی دھیرے دھیرے اس قتالہ کے تلوے سے گلاب کی نازک پتیاں چھو کر گدگدا رہی ہو۔

دل کی دنیا دل کی دنیا
لٹ گئی لٹ گئی آ
میں گھبرو اور تو البیلی
تو بھی رانی میں بھی شاہ
لوگ ہمیں سب کہتے ہیں
خانہ خراب عفی اللہ

حکیم خانہ خراب کی فکری معنویت، مزاج کی جبلی اداسی، الفاظ کا خوش رنگ چناؤ، مترنم بحریں، مضمون کا ارتکاز اور ادائیگی کا اختصار وہ خوبیاں ہیں جو ان کے قارئین کو مجبور کر دیں گی کہ دیوان بار بار پڑھنے پر آمادہ کریں گی۔

"ششش! ارے او ششش! رک تو سہی۔ میری بات تو سن۔"

برآمدے کی کونے سے آنے والی زوردار آواز نے نرس فرحانہ کو چونکا دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر آواز دینے والے چہرے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

"ششش! باجی! بیٹا! میں انار گل کی ساس، امانت بیگم، بات تو سن۔" لمبی سی سرخ سفید امانت بیگم اپنا برقع سنبھالتی تیزی سے فرحانہ کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

"امانت بیگم... کیسی ہے تو...؟" قریب آ کر اس نے خاصی [illegible] سے پوچھا۔

اپنی معصوم بیٹی کے

"تم قاتل ہو"

دقیانوسی خیالات رکھنے والے ایک ناخواندہ باپ کا الم ناک قصہ

[illegible]

"اماں! اسپتال میں یوں آوازیں دینا منع ہے۔ مریض پریشان ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے؟ انار گل کیسی ہے؟ تم اسے پھر داخل کرانے تو نہیں آ گئیں؟" فرحانہ امانت بیگم کے سلام کا جواب دے کر بولی۔

انار گل وارڈ کی مستقل مریضہ تھی۔ پچھلے دس برس میں اس کے سات بیٹے اسی سرکاری اسپتال ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ سال میں کئی مرتبہ وہ یہیں پائی جاتی، ہر بار پہلے سے زیادہ کمزور، لاغر اور بیمار۔ اور یہ امانت بیگم، اس کی ساس، اسی طرح چست، خوشی سے جھومتی جھامتی، ہر آنے جانے والے سے لڑتی جھگڑتی سارے اسپتال کے عملے کا سر کھاتی پھرتی تھی۔

"ہاں ہاں... ماشااللہ پھر [illegible] والی ہوں۔ اس بار بیٹی بتائی ہے ڈاکٹرنی نے۔" امانت بیگم چہکی۔ اور مسکرانے لگی۔

"اماں! اللہ سے ڈرو۔ وہ ہر مرتبہ مرتے مرتے بچتی



ہے۔ ہر بار تم ڈاکٹرنی سے کالین کھاتی ہو، اور وہ تمہارا قصائی بیٹا بھی۔ اور پھر یہیں آجاتی ہو۔ مر جاؤ گی، تو ہمارے اوپر الزام ڈال کر خود بری الذمہ ہو جانا کہ اللہ کی مرضی یہی تھی۔"

فرحانہ اس مرتبہ "پھر" کا سن کر طیش میں آگئی۔

"نا پہلے سات اولادیں مری ہیں جو اب مروں گی۔ ساری دنیا بچے پیدا کرتی ہے۔ ہم نے بھی کیے۔ یہ کوئی انوکھی ہے؟ اور تم خدا کے لیے ہمیں تریاں نہ لگایا کرو۔ خوشی کے موقع پر دھمکیاں دے کر بدشگونی نہ کرو۔ آؤ دیکھو انار کلی تمہارا پوچھ رہی تھی۔"

امانت بیگم کو وقت ایسی باتیں سننے اور برداشت کرنے کی عادی ہو گیا کرتی۔ اسپتال میں فرحانہ کی زچہ بچہ وارڈ کی مستقل اور پرانی وہاں کی مستقل مریضہ!

فرحانہ بانو کا پہلا بیٹا اچھی طرح یاد تھا۔ صحت مند، تندرست اور مضبوط پورا گول مٹول بچہ اب اس کے شوہر رشید قصائی نے پورے محلے کو مٹھائی کھلانے کے علاوہ پیسے بھی بطور بخشش دیے تھے۔ ٹھیک گیارہ ماہ بعد دوسرا اور پھر ہر سال ایک بیٹا پیدا ہوا۔ انار کلی صحت ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ خراب ہوئی۔

اس کے حالات سے فرحانہ واقف تھی۔ اب اس میں مٹھائی اور بخشش قبول ہوتی جا رہی تھی۔ قصائی اب خوشی کے دنوں میں گھر اچھی بھی باتیں کرتا۔ امانت بیگم سمجھاتے بیٹھے کمزور صحت پر باتیں سناتی۔ اور اپنی ہمت سے کہتی بھی کہ اس نے بچے جننے کے ساتھ پیسے کو سنبھالے۔ شوہر کے ہوش سنبھالنے اور گوشت بنانے جیسے کاموں میں بھی ساتھ دیا۔

فرحانہ امانت بیگم کے ساتھ چل دی۔ سرکاری اسپتال کے زچہ بچہ وارڈ کی رونقیں کبھی کم نہ ہوتیں۔ بلکہ مریضوں کی زیادتی سے کبھی کبھی بچے بدلنے جیسے سنگین سانحات بھی جنم لیتے۔ بیٹوں کے وارث سب لوگ ہوتے اور بیٹیوں کو دوسرے کے متھے چڑھانے کی کوششیں ہوتی۔ فرحانہ روز صبح و شام لوگوں کی اصلیت بے نقاب ہوتے دیکھتی اور عورتوں کی چالاکیاں،

کانٹوں بھرا راستہ

جب ہم دینی، درس قرآن و حدیث میں بیٹھتے ہیں، تو نیند کیوں آتی ہے؟

جبکہ دنیائی محفل موسیقی وغیرہ میں ساری رات جاگے، تو بھی نیند نہیں آتی؟

بزرگ نے جواب دیا:

"نیند ہمیشہ پھولوں کی سیج پہ آتی ہے، کانٹوں پہ نہیں۔

(رضوان حیدر، مظفر گڑھ)

ہمت، حوصلہ اور صبر بھی۔

امانت بیگم، انار کلی کے بستر پر جھڑی ہوئی۔ وہ بمشکل تیس برس کی ہوگی مگر زردی اس کے چہرے پر یوں نمایاں تھی جیسے یرقان کی پرانی مریضہ ہو۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی تازگی کہیں کھو چکی تھی۔ جانے نیند میں تھی یا بے ہوش۔ بہرحال دنیا جہان سے بے خبر ایک کمزور سا وجود بستر پر لیٹا تھا۔

فرحانہ قریب آئی۔ سرہانے کے قریب بیماری اور تشخیص کے کاغذات دھرے تھے۔ آٹھویں زچگی اور خون کی شدید کمی! دیگر بیماریاں بھی درج تھیں۔ فرحانہ وارڈ سے باہر رشید کے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ دس برس کے دوران رشید میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرخ سفید اونچا لمبا رشید اب موٹی توند کے ساتھ لوگوں میں نمایاں نظر آتا جبکہ انار کلی کو بستر پر دکھ دیا۔

"انار کلی کا خون کا نظام ہو گیا......" اس نے امانت بیگم سے پوچھا اور اسے ساتھ لے کر رشید قصائی کے پاس آگئی۔

"دیکھیں رشید! جلدی کریں۔ یہ خون کی بوتل تو بڑی مشکل سے ڈاکٹر نے اسی دن چوبیس کا انتظام کرنے کو کہا ہے۔ تم تو اسپتال میں ہوتی ہو، کوئی انتظام کر دو۔"

امانت بیگم کی اس مستقل خوش مزاجی کا راز سامنے آ گیا۔

"اماں! سب سے سستا خون تو تمھارے بیٹے سے ملے گا۔ اچھا بھی اور تازہ بھی! ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، پچھلی مرتبہ چیک کیا، تو دونوں کا خون مل گیا تھا۔" فرحانہ شیدے کو دیکھ کر بولی۔

"شششڑ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بھلا میں اناری، اپنی بیوی کو خون کیسے دے سکتا ہوں؟" شیدا اچھا بھلا گڑبڑا گیا۔

"کیوں!....؟ کیا بیمار ہو؟ کمزور ہو؟ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں خون نہیں دے سکتے؟" فرحانہ تیزی سے بولی۔

"شششڑ! میں اس کا خاوند ہوں۔ بھلا خون کیسے دے سکتا ہوں؟ ہمارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔" شیدا بڑی دلیل لے آیا۔

"یہ دین سا نیا ہے؟ کس مولانا سے یہ لے کر آئے؟ اور نکاح تو تمھارا خون نہ دینے سے بھی ٹوٹ جائے گا۔" فرحانہ غصے سے بولی۔

"وہ کیسے؟" اس نئے مسئلے نے امانت بی بی کو بھی چونکا دیا۔

"ظاہر ہے اناری کی حالت خراب ہے۔ تم خون نہیں دو گے اور خرید بھی نہیں سکتے۔ اگر سستا خریدا تو وہ کسی نشئی کا ہوگا، بہت خراب! اناری ان تینوں صورتوں میں مر جائے گی اور تمھارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ نکاح برقرار رکھنے کے لیے فریقین کا زندہ ہونا ضروری ہے۔" فرحانہ بے رحمی سے بولی۔

"شششڑ! کچھ تو کرو۔ دیکھو میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" شیدا اب کچھ پریشانی میں مبتلا ہوا۔

"اچھا چلو تمھارا تو نکاح ٹوٹے گا۔ یہ تمھاری اماں تو بالکل تندرست ہے۔ اس کا خون لے لیتے ہیں۔ کم از کم دو بوتلیں تو نکل ہی آئیں گی۔ خاصا فالتو خون ہے اس میں۔" فرحانہ اب امانت بیگم کی طرف مڑی۔

"شششڑ! تمیز سے بات کرو۔ میں بڈھی کھوسٹ اور بیمار، مجھ سے کیا خون نکلے گا؟" امانت بیگم کی آواز میں نقاہت آن پہنچی۔ قریب تھا کہ وہ وہیں ڈھے جاتی۔

"شیدے! تو فون لگا کر اناری کے بھائیوں کو! خون ہمیشہ لڑکی کے میکے والے دیتے ہیں۔ آخر لڑکی انہی کی ہے۔ ایک خون دوسرا کفن دفن میکے کا فرض اور ذمے داری ہوتا ہے۔" امانت بیگم نے سب سے آسان حل نکالا۔

"یہ سات بیٹے جو اس نے جنے ہیں، وہ تو سب سسرال والوں کے ہیں۔ اور ان بیٹوں کی ماں کو خون کی ضرورت ہے تو یہ اس کے میکے کا فرض بن گیا۔ کیسی خود غرض ساس ہو اور کیسے مطلب پرست شوہر۔ شیدے! تم کیا سوچ رہے ہو؟ وقت کم ہے۔ اگر اناری مر گئی تو سات آٹھ بچوں کے باپ کو دوسری بیوی کہاں سے ملے گی؟ خون دینا کوئی مشکل نہیں۔ تم صحت مند اور جوان ہو۔ تمھیں کوئی بیماری بھی نہیں۔ ایک دو ماہ میں اتنا ہی خون تمھارا جسم خود بخود بنا لے گا۔" فرحانہ نے شیدے کو سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ شیدے کا رنگ نرس کی باتیں سن کر اڑ گیا۔

"اماں! میں اناری کے بھائیوں کو فون کر کے آتا ہوں۔" وہ فوراً باہر کی طرف لپکا۔ امانت بیگم اس کے پیچھے تھی۔ فرحانہ وارڈ میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب ماں بیٹا جلد واپس نہیں آئیں گے۔ اناری کے میکے والے بھی خون کے نام پر شور تو مچا سکتے تھے مگر خون دینے کی ہمت وہ بھی نہ کرتے۔ جانے اس سلسلے میں کتنے توہمات اور خدشات ہیں اور کب اس معاشرے سے ختم ہوں گے۔

اناری تنہا تڑپ رہی تھی۔ آٹھواں بچہ ہونے کی خوشی اناری کے چہرے پر رقصاں تھی، مگر بدن میں خون کی بوندیں اس تیزی سے کم ہو رہی تھیں کہ خطرہ تھا، بچہ ماں کی محبت سے محروم ہو جائے۔

آخر فرحانہ نے اسپتال میں میڈیکل طلبہ کو اطلاع کروائی۔ ایک نیک دل طالب علم نے خون دیا۔ یوں اناری موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔ مگر شیدا قصائی اور امانت بیگم دوبارہ پلٹ کر ہی نہ آئے۔ اناری کے بھائی بھی تمام جھگڑے گھریلو سطح پر ہی سلجھا رہے تھے۔ یوں اسی دوران ایک

اور بخت جواد دنیا میں آگئی۔ چوتھے روز اناری کی حالت خاصی سنبھل چکی تھی۔ وہ بچی کو گود میں لے کر بیٹھنے کے قابل ہوئی، تو شیدا اور اُس کی ماں منی کاکی کو لینے آپہنچے۔

''شششٹر! ہماری چھٹی کا کاغذ بنا دو۔'' امانت بیگم نے فرحانہ کے کمرے میں آکر درخواست کی۔

''آگئیں اماں جی! یاد آگئی اپنی بہو! اگر یہ مر جاتی، تو تمھارا سارا شہر اسپتال کے سامنے دھرنا دے ڈالتا۔ سارا قصور ہم اسپتال والوں کا ہوتا اور تم سب مظلوم! خون، دوا اور پیسوں کا انتظام کرنے سے یوں بھاگے جیسے یہ تمھاری کچھ نہیں لگتی۔ دل تو چاہتا ہے کہ اگر قانون اجازت دے، تو تمھارے اور شیدے کے خلاف اقدامِ قتل کا پرچہ کروا دوں۔'' فرحانہ کو شدید غصہ تھا۔

وہ ابھی کچھ اور کہنے والی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ کو آتا دیکھ کر چپ ہوگئی۔ ''کیا مسئلہ ہے؟ کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' ڈاکٹر صاحبہ نے سختی سے پوچھا۔

''جی ہماری مریضہ کو چھٹی دے دیں۔ یہ آپ کی نرس ہم سے بدتمیزی کررہی ہے۔ حال آپ کے اسپتال کا خراب ہے۔ نہ دوا ملتی ہے، نہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اور آپ کا عملہ بیچارے غریبوں سے بدتمیزی کرتا، ناراض ہوتا اور الزام لگاتا ہے۔'' امانت بیگم حسبِ عادت زور زور سے بولنے لگی۔

''اماں! تم نے اپنا مریض لاوارث چھوڑا اور الزام ہم پہ لگارہی ہو۔'' فرحانہ پھر غصے سے بولی۔

''لاوارث کیوں؟ آتو گئے ہیں۔ اب تم چھٹی دو۔ تمھارا فرض تھا مریض کا علاج کرنا، کون سا احسان کیا ہے؟ میرا شیدا بہت سے اخبار والوں کو بھی گوشت بیچتا ہے۔ بس ایک دو کلو گوشت پر ہی اخبار والا شسٹر فرحانہ کے خلاف ایسی خبر لگائے گا کہ مزہ آجائے۔ پھر دیتی رہنا صفائیاں۔'' امانت بیگم دھمکی دے کر باہر چل دی۔

''یہ آج کل کی لڑکیوں کو غذا کھاتے موت پڑتی ہے۔ پھر سسرال والوں کو بدنام کرنے کے لیے ہفتہ ہفتہ اسپتال میں آرام کرتی ہیں۔ ہم ساسیں گھر اور ان کی اولادوں کو سنبھالیں، پھر بھی برے! میرے گھر میں آخر کس چیز کی کمی ہے؟ یہ اناری کی تو شکل ہی ایسی مسکین ہے۔ روز بیمار پڑ جاتی ہے اور دنیا مجھے اور میرے بیٹے کو ظالم سمجھتی ہے۔ کم بخت پتا نہیں اس ششٹر کو کون سی کہانیاں سناتی ہے۔ گھر جا کر پوچھتی ہوں اس اناری سے۔'' امانت بیگم بڑبڑاتی ہوئی وارڈ میں آگئی۔ فرحانہ نے چھٹی کی پرچی بنائی، ڈاکٹر کی دواؤں کا نسخہ حوالے کیا اور اناری پر رحم بھری نگاہ ڈال کے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

محلّے میں چھوٹے بچوں کو پولیو قطرے پلانے کی مہم کے سلسلے میں عورتیں گھر گھر جاکر قطرے پلارہی تھیں۔ اناری کے گھر میں، تو پانچ سال سے کم عمر کے پانچ بچے موجود تھے۔ اناری نے سب کو قطرے پلوائے۔ چاروں بڑے بچے، تو بھلے چنگے رہے مگر جانے کیوں چھوٹی کاکی کو بخار چڑھ گیا۔ چند دن ڈاکٹر کے پاس آنے جانے کی مصروفیت میں رات کا کھانا نہ پک سکا۔ ایک رات شیدا ہوٹل کی دال کھا کر ایسے غصے میں آیا کہ اعلان کردیا ''آئندہ اس پولیو والی سے کسی بچے کو قطرے نہیں پلوانے!''

قطروں کی اگلی مہم اگلے ماہ پھر شروع ہوئی۔ مگر شیدے قصائی نے اپنے بچوں کو قطرے پلانے سے انکار کردیا۔ بچوں کو گھر میں بند کرکے وہ خود باہر بیٹھ گیا۔ شیدے کی نہ کو ہاں میں بدلنا کسی صورت ممکن نہ تھا۔ بقول امانت بیگم آخر مرد کا بچہ تھا اور مرد کی زبان ایک ہی ہوتی ہے۔ بعدازاں محکمہ صحت کی بھی دو ٹیمیں آئیں مگر شیدے کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔ شیدے کی ضد کی حمایت امانت بیگم دل و جان سے کررہی تھیں۔ پولیو کی اگلی دو مہموں میں بھی کاکی اور باقی چاروں بچے قطروں سے محروم رہے۔

☆☆☆

آئی گرمیوں کے دن تھے۔ زچہ بچہ وارڈ کی گہما گہمی حسب معمول عروج پر تھی۔ "شششر!" جانی پہچانی آواز پر فرحانہ نے مڑ کر دیکھا۔ امانت بیگم اپنے بے حد پھیلے بدن سمیت تیز تیز چلتی آرہی تھی۔ وہ رک گئی۔

"ہاں اماں کیا بات ہے؟ کیا اناری پھر آگئی۔ اس مرتبہ زیادہ جلدی نہیں؟ ابھی تو بچی بمشکل چھ ماہ کی ہوگی۔" فرحانہ نے اندازہ لگایا۔

"شششر! ہم اناری نہیں کا کی کو لائے ہیں۔ دو دن سے بچہ داخل ہے۔ شیدا بہت پریشان ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟" "بچی خاصی کمزور تھی اس لیے بیمار ہو گئی۔" فرحانہ نے اندازہ لگایا۔

"ڈاکٹر کہتے ہیں بچی کو ... ہوا ہے۔ تمہاری ڈاکٹرنی بہت اچھی ہے۔ اناری تو مر رہی تھی اس نے ٹھیک کر دیا۔ آپریشن کے بعد ٹانکے نہیں لگائے بلکہ ... لگی ہے۔ خون کے بغیر ہی اناری کا علاج کر دیا۔ اپنی ڈاکٹرنی سے شیدو کی کا کی کا بھی علاج کروا دو۔" امانت بیگم آج واقعی پریشان تھی۔

"اماں کیا پولیو کے قطرے نہیں پلائے تھے؟ ہم تو ہیں شہر میں رہتی ہو۔ اور ہماری لڑکیاں گھر گھر جا کر قطرے پلاتی ہیں۔" فرحانہ حیرت سے بولی۔

"بس تجھے تو پتا ہے شیدے کی ضد کا! اس نے سوچا کہ قطرے پینے سے بچی بیمار ہو جاتی ہے۔ بخار چڑھ جاتا ہے۔ اس لیے منع کر دیا۔ قطرے پلانے والے تو بار بار ہمارے گھر آئے تھے مگر شیدا گھر پہ تالا ڈال کر بیٹھا رہا۔ مجھے یقین ہے تمہاری ڈاکٹرنی کا کی کو ٹھیک کر دے گی۔ آخر تم لوگوں نے اناری کو بھی تو بچا لیا تھا۔" امانت بیگم گڑگڑائی۔

فرحانہ اماں کو ہمدردی اور غصے سے دیکھتی رہ گئی۔ باپ کی خبط ضد نے ایک معصوم اور بے گناہ جان کو زندگی بھر کے لیے معذور کر دیا تھا... اور پورے ملک کو ساری دنیا کے سامنے

اقوالِ مفکرین

☆ اسلام دولت کی مساوی تقسیم کا نہیں منصفانہ تقسیم کا قائل ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

☆ شریعت بہت بڑا فلسفہ ہے اور کوئی حکیم فلاسفر نہیں ہو سکتا جب تک وہ عبادت گزار اور شریعت کے فرائض ادا کرنے میں پابند نہ ہو۔ (ابوزید بلخی)

☆ عقل مند سے خیر کی ہر حالت میں امید رکھنی چاہیے اور نادان کے شر سے ہر صورت میں ڈرنا چاہیے۔ (ابوسہل)

☆ اگر ہمارے جسم میں ہماری روح کو زنگ لگ چکا ہے، تو ایک دن اسے سان پر چڑھایا جائے گا۔ (ابوالعلا معری)

☆ اگر تو پست ہے، تو خود شناسی کے ذریعے اپنے آپ کو بلند کر اور اگر خدا تک پہنچنا چاہتے، تو پہلے اپنے آپ سے نزدیک ہو جا۔ (علامہ اقبال)

(انتخاب: نوکر عباس ہاشمی، مظفر گڑھ)

شرمندہ بھی کر دیا۔

آج امانت بیگم اور اس کے پیچھے کھڑا شیدا اپنی غلطی کا الزام نہ حکومت کو دے سکتے تھے نہ محکمہ صحت کو۔ نہ معاشرے کو اور نہ مذہب کو! یہ شیدے کی اپنی نادانی تھی۔ اس کی اکلوتی کا کی... منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والی لاڈلی بچی باپ کی غلطی کے باعث ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی۔

فرحانہ سوچنے لگی ایسے ضدی اور جاہل باپوں کے خلاف اقدام قتل کا پرچہ درج ہونا چاہیے۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ ان کے خلاف جنگ عزت کا مقدمہ کرے۔ ان چند لوگوں کی وجہ سے پاکستان کا نام دنیا بھر میں بدنام ہو رہا ہے۔ اس ذلت کا اندازہ ہر اس پاکستانی کو ہوتا جو بیرون ممالک جاتے ہوئے انہی ضدی لوگوں کی وجہ سے ہوائی اڈے پہ پولیو کے قطرے پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

◆◆◆

موسم گرما کا خاص تحفہ

چھاچھ

معدے کی صفائی کرکے ہمیں
تندرست و توانا رکھنے والی قدرتی نعمت

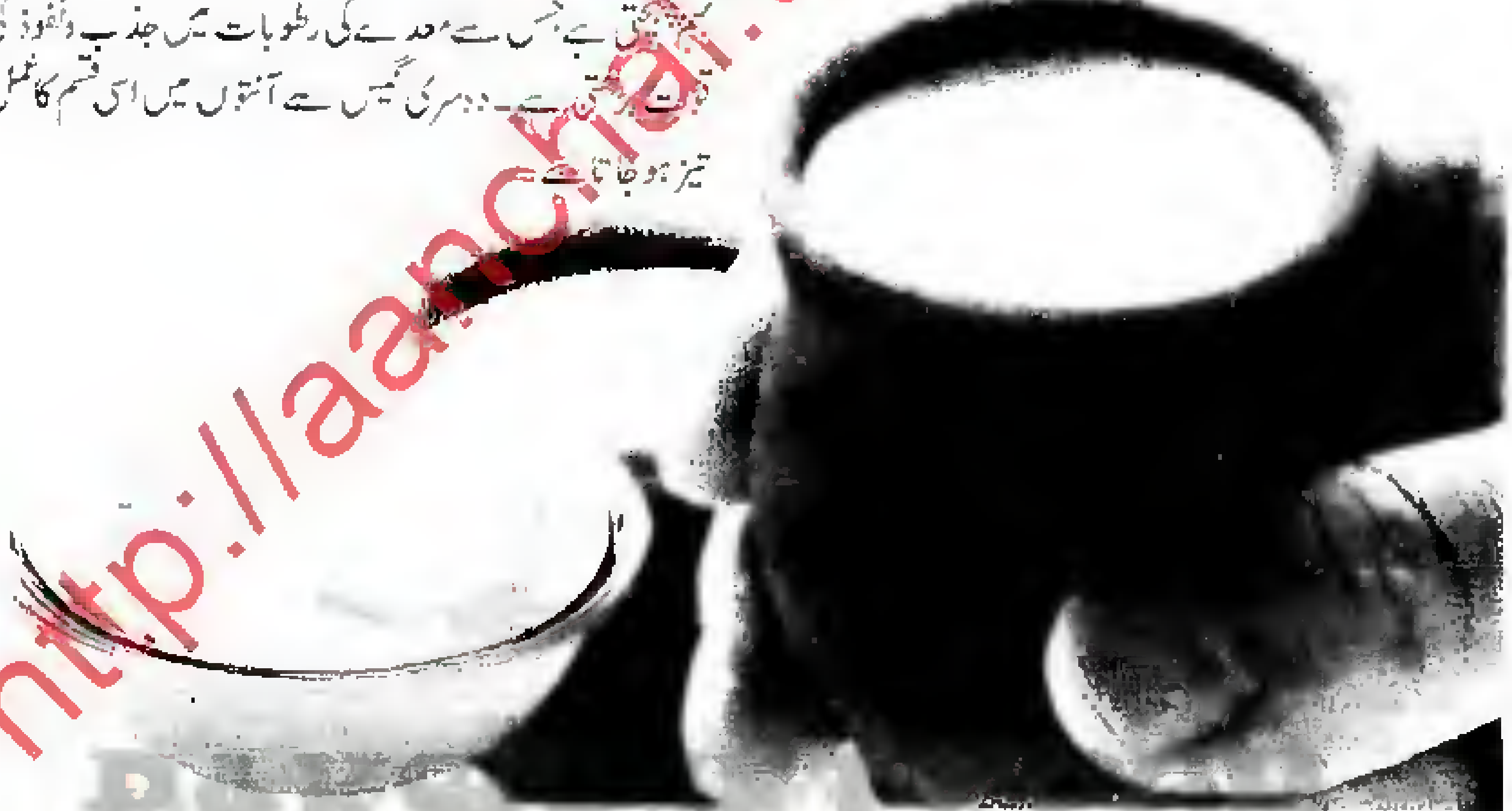
محمد خلیل چودھری

دنیا کے کئی ممالک میں دہی، لسی اور چھاچھ ہزاروں سال سے روزمرہ غذا کا جزو ہے۔ پہلے چھاچھ بھیڑوں، بکریوں، اونٹنیوں اور بھینسوں کے دودھ سے تیار کی جاتی تھی۔ کئی زبانوں میں مروج اس کے ناموں سے درازی عمر کا مفہوم نکلتا ہے۔ قدیم مصر میں بھینسوں کا دودھ ترش کرکے بازار میں فروخت ہوتا تھا۔ دہی کو نہ صرف فراعنہ مصر کے دسترخوان تک رسائی حاصل تھی بلکہ عوام میں بھی یہ لذیذ اور لطیف غذا بہت مقبول رہی۔ آج بھی مصر میں گائے اور بکریوں کی چھاچھ بکثرت استعمال ہوتی اور ہر کھانے کے ساتھ بطور مشروب پی جاتی ہے۔

قدیم لوگ چھاچھ کو دوا کے طور پر بھی تجویز کیا کرتے۔ یونان کے طبیب اسے معدہ، جگر اور فشار خون کی بیماریوں میں بکثرت استعمال کراتے۔ تمام دنیا میں یہ انسان کی پسندیدہ غذا ہے، لیکن بہت کم لوگ اس کی ماہیت اور خواص سے اچھی طرح واقف ہیں۔

لسی، دہی اور چھاچھ میں شامل یعنی دودھ کا ترشہ بڑی مقدار میں شامل ہوتا ہے۔ اس ترشے سے آنتوں کے مضر صحت جراثیم فنا ہوتے ہیں اور غذا ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں تھوڑا سا الکحل اور کاربونک ایسڈ بھی موجود ہوتا ہے۔ ان مادوں کے ذریعے غذائی نالی کے اعصاب کو تقویت پہنچتی ہے۔

جس وقت چھاچھ معدے میں پہنچے اور اسے جسمانی حرارت ملے، تو جراثیمی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نتیجے میں دو قسم کی گیسیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک گیس سے غذائی مواد کو ایسی ہوا پہنچتی ہے جس سے معدے کی رطوبات میں جذب و نفوذ کی قوت بڑھتی ہے۔ دوسری گیس سے آنتوں میں اسی قسم کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔



نتیجہ یہ کہ غذا آنتوں میں رک کر خشک نہیں ہونے پاتی اور نہ ہی اس کے اجزا میں مضر صحت تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔ یوں فطری طریقے سے بآسانی فضلہ خارج ہو جاتا ہے۔ آنتوں کی صفائی کے لیے ادویہ استعمال کی جائیں، تو جسم میں غیر طبعی تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

یاد رہے، دہی کو بلو کر مکھن نکالنے کے بعد جو پانی رہ جائے، وہ چھاچھ کہلاتا ہے۔ اس میں چکنائی کی مقدار کم ہوتی ہے اور پانی کی زیادہ۔ یہ بھی دہی کی طرح زود ہضم غذا ہے۔

اگر فضلہ بھی آنتوں میں رک جائے، تو جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں۔ نتیجے میں تخمیر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس طرح جو زہریلا مواد پیدا ہو، وہ خون میں جذب ہو کر جگر، گردوں اور دماغ وغیرہ کے لیے سخت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ملین اور مسہل ادویہ سے بھی فضلات دفع کرنا ممکن ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یوں فضلات کا دفع کرنا صحت بخش نہیں۔

روزانہ چھاچھ کا استعمال تیزاب لبنی (Lactic Acid) کی وجہ سے آنتیں صاف رکھتا ہے۔ وہ پرانا قبض بھی آسانی سے رفع کرتا ہے۔ علاوہ ازیں دہی کے صحت دوست جراثیم غذا میں بڑی مقدار میں حیاتین ب (وٹامن بی) پیدا کرتے ہیں۔ چھاچھ کا یومیہ استعمال بعض امراض قلب، عصبی خرابیوں اور قبض دور کر دیتا ہے۔ یہ خلل حیاتین ب کی کمی سے جنم لیتے ہیں۔

مقوی اعصاب

ایک سائنس دان کا قول ہے کہ دہی کے تیزاب دماغ رواں دواں رکھنے میں ایندھن جیسا کام کرتے ہیں۔ وہ اعصاب کو زہریلے مادوں سے نجات دلاتے ہیں۔ اس اعتبار سے چھاچھ یا دہی مقوی اعصاب بھی ہے۔ ان سے اشتہا (بھوک) بڑھانے، خوراک ہضم کرنے اور تغذیہ میں مدد ملتی ہے۔

بچوں کے امراض کا شافی علاج

اگر بچوں کو چھاچھ یومیہ استعمال کرائی جائے، تو ان کے دانت نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔ اور بچے امراض دندان میں مبتلا نہیں ہوتے۔ چھاچھ بچوں کی بہت سی بیماریوں کا شافی علاج ہے۔

اسہال مزمن کا علاج

جن ممالک میں ملیریا بہت ہوتا ہو، وہاں اسہال مزمن کے مریضوں کو چھاچھ پلانا مفید ہے۔

موٹاپے میں مفید

چھاچھ فربہی کم کرنے میں بھی فائدہ مند ہے کیونکہ اس میں غذائی حراروں (کیلوریز) کی تعداد کم ہوتی ہے۔ وہ معدے میں طویل عرصہ رہتی ہے، یوں ضرورت سے زیادہ بھوک جنم نہیں لیتی۔ بھوک کی وجہ ہے معدے میں جو ارد ہو

غیبت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضورﷺ کے زمانے میں دو عورتوں نے روزہ رکھا۔ دن گزرنے کے ساتھ بھوک اور پیاس کی شدت سے ان کی حالت خراب ہوگئی۔ انھوں نے حضورﷺ کی خدمت میں آدمی بھیجا اور افطار کی اجازت طلب کی۔ آپﷺ نے اس آدمی کو ایک پیالہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں سے کہنا کہ جو کچھ تم نے کھایا ہے، اس پیالہ میں قے کردو۔ ایک عورت نے قے کی، تو آدھا پیالہ گوشت اور خون سے بھر گیا، دوسری نے قے کی، تو پیالہ پورا بھر گیا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے اس غذا سے روزہ تو رکھا جو اللہ نے حلال کی ہے اور جو چیز اس نے حرام کی ہے، اسے کھاتی رہیں۔ ایک دوسرے کے پاس بیٹھیں، تو دونوں نے لوگوں کی غیبت شروع کر دی۔ دونوں نے لوگوں کا جو گوشت کھایا تھا، وہی پیالے میں ہے۔

(احیاء العلوم، جلد اول۔ ترجمہ و ترتیب: خرم مراد)

چھاچھ اسے رفع کرتی ہے۔ چھاچھ کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں تھوڑا سا شہد یا شکر ملا لیجیے۔ کچی ترکاریوں کا کچومر یا پھل بھی ملا سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں پنجاب اور خیبر پختونخوا میں دہی یا چھاچھ کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ گرمیوں میں نہایت پتلی چھاچھ سادہ پانی کے بجائے پی جاتی ہے۔

راقم جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے آبائی گاؤں، گھکڑ جاتے، تو وہاں چاٹی کی لسی کے ساتھ دوپہر کو تندور والی روٹی اور اچار پر مشتمل کھانا اپنا منفرد مزا رکھتا ہے۔ لسی کے ساتھ خالص تندور کی روٹی کھانے کے بعد بڑے مزے کی نیند آتی ہے۔

اطبائے طب مشرق چھاچھ کے صرف پانی کو جس سے پنیر کے اجزا جدا کر لیے جاتے ہیں، بطور دوا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ دہی کا پانی (ماء الجبن) بکثرت کئی امراض میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ماء الجبن زیادہ تر بکری کے دودھ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس غرض سے مخصوص قسم کی بکری پالی یا خریدی جاتی ہے۔ نیز اسے مخصوص قسم کا چارہ دیا جاتا ہے۔ ایسی بکری کے دودھ سے ماء الجبن حاصل کر کے اسے مطلوبہ ادویہ کے ساتھ استعمال کرایا جاتا ہے۔

استعمال میں احتیاط

یہ یاد رہے کہ زیادہ ترش چھاچھ سے اکثر نقصان بھی ہوتا ہے۔ چھاچھ تازہ ہونی چاہیے جو زیادہ ترش نہ ہو۔ موسم سرما میں چھاچھ یا دہی کے ساتھ تھوڑا لہسن یا زیرہ شامل کرنے سے وہ نقصان دہ نہیں رہتی۔

دراصل ترشی اعصاب کے لیے مضر ہے۔ کمزور اعصاب کے مریضوں میں ترشی خواہ کسی چیز کی ہو، نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ طب جدید میں ترش اشیا استعمال کراتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے جس سے انسان کو اکثر نقصان پہنچتا ہے۔

گرما گرم حالت میں اگر فوری طور پر کسی ترش مشروب کو (بالخصوص جب وہ چھونے سے ٹھنڈا بھی ہو) استعمال کر لیا جائے، تو اس سے نمونیا، درد اعصاب اور فالج کا حملہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ نزلہ تو اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات کسی وجہ سے ایسا نہ ہو۔

گرم حالت میں اس قسم کی بے احتیاطی سے لوگ عموماً نزلے کا شکار رہتے ہیں۔ پھر اشیا گرم اور سرد حالت میں استعمال کرنے سے ان کے اثرات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جسم میں پہنچ کر سردی پیدا کرنے والی چیز اگر گرم کر کے استعمال کی جائے، تو وہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ چناں چہ تربوز یا شہد کو ویسے ہی کھانے اور خصوصاً ٹھنڈے پانی میں گھول کر پی لینے سے اس کے اثرات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ موسم سرما میں دہی یا چھاچھ کو قدرے گرم کر لیا جائے، تو نقصان کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ اس میں زیرہ اور لہسن جیسی گرم اشیا شامل کر لی جائیں تو ضرر کا خطرہ نہیں رہتا۔

◆◆◆

ہری مرچیں

☆ شریف آدمی وہ ہوتا ہے جو کسی کا کام کرنے سے انکار نہ کرے مگر جس کا کام کرنے سے ہر آدمی انکار کر دے۔

☆ کچی بات کہنے سے پہلے اگر اسے بار بار تولا جائے، تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ لیڈر سچ بولتا ہے۔

☆ جیسے جیسے آپ کے دانت گرتے جائیں، ویسے ویسے لوگ آپ کو کاٹنے کے لیے دوڑیں۔

(عارفہ انیس، کراچی)



طب و صحت نمبر
جولائی ۲۰۱۵ء

ایک عربی کہاوت ہے: ''جو تندرست ہو، وہ اُمید رکھتا ہے اور جو اُمید رکھے، وہ ہر شے کا مالک ہے۔'' یہ خوبصورت کہاوت صحت و تندرستی کی اہمیت بخوبی اجاگر کرتی ہے۔

آج لاکھوں پرھوں ہم وطن مہنگے علاج، ڈاکٹروں کی نایابی، اسپتالوں کی کمی اور امراض سے آگاہی نہ ہونے کے سبب ان گنت بیماریوں میں مبتلا ہیں اور ان کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ ان کی تکالیف مدنظر رکھ کر ادارہ اُردو ڈائجسٹ نے فیصلہ کیا کہ ہم وطنوں کو امراض سے متعلق آگاہی دینے کی خاطر ''طب و صحت نمبر'' شائع کیا جائے۔

''طب و صحت نمبر'' میں ان تمام بیماریوں کا آسان فہم تعارف اور علاج بیان ہو گا جو پاکستان میں پھیل چکیں۔ نیز طب کی بنیادی معلومات بھی دی جائیں گی۔ غرض یہ نمبر صحت و تندرستی کے حوالے سے مستقل دستاویز بن جائے گا۔ قارئین ۱۵ر جون تک نمبر کے لیے اپنی تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

''طب و صحت نمبر'' وسیع پیمانے پر پڑھا جائے گا۔ مشتہرین کے لیے اپنی مصنوعات کی تشہیر کا یہ سنہرا موقع ہے۔ وہ اپنے اشتہار کی جگہ مخصوص کروالیں۔

ادارہ اُردو ڈائجسٹ

۱۴ اپریل ۲۰۱۴ء بروز سوموار سہ پہر، بارہ سالہ سین ریڈن اپنی اسکول بس سے اترا اور بستہ سنبھالے ڈینٹن، ٹیکساس میں واقع اپنے چھوٹے سے بنگلے میں داخل ہو گیا۔

"ہائے مام......" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر محبت سے ہاتھ ہلایا۔ پھر باورچی خانے میں بچھی میز کے گرد چکر لگا کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔

۳۰ سالہ شیرون ریڈن مسکراتی نظروں سے سین کو ایک نئی ویب سائٹ پر جاتے دیکھنے لگی۔ وہ اور اس کا خاوند کیتھ جو محکمہ ٹیکس میں ملازم تھا، ٹکی بندھی آمدنی پر گزارا کر رہے تھے۔ انھوں نے کمپیوٹر خریدنے کے لیے خاصی جزرسی سے کام لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سین اور اس کی چودہ سالہ بہن، جینی فر کے لیے کمپیوٹر میں مہارت حاصل کرنا تعلیم ہی کی طرح اہم تھا۔

"تم کیا کھیل رہے ہو؟" شیرون نے پوچھا۔

سین نے کندھے جھٹکے اور بولا "میں ٹیورن (Tavern)

جدید ٹیکنالوجی کا ایک کرشمہ

انٹرنیٹ پر مدد کی پکار

ہزار ہا میل دور بیٹھی بوڑھی رفتہ رفتہ موت کے منہ میں جا رہی تھی کہ اچانک......

فرزانہ نکہت



کی طرف جا رہا ہوں۔"

یہ بچوں کی ایک ویب سائٹ ہے جس میں نہ صرف وہ مختلف کھیل کھیلتے بلکہ نت نئے دوست بھی بناتے ہیں۔ بچوں کے لیے بڑی دلچسپ ویب سائٹ ہے۔ سین کچھ دیر کھیل کھیلنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے اپنے ایک سائبر دوست کا بنن دبایا اور اسکول کے بارے میں گفتگو کی۔ جب وہ تھکنے لگا سائن آف کرنے ہی والا تھا کہ اس نے اسکرین پر ایک اجنبی نام ابھرتے دیکھا: "سوزان ہکس۔" ساتھ ہی اس کا پیغام بھی بڑے بڑے حروف میں اسکرین پر نمودار ہو گیا۔ "کیا کوئی میری مدد کر سکتا ہے؟"

"یہ کمپیوٹر پر نئی معلوم ہوتی ہے اس کے قواعد سے ناآشنا..." سین نے سوچا۔ پھر اس نے ٹائپ کیا: "کیا بات ہے؟"

تھوڑی دیر بعد اس نے ایسے ہی بڑے حروف میں جواب دیا۔ "میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میری مدد کرو!"

سین کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ یہ لڑکی شاید اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف تھی۔ اس کا دل چاہا اسے ڈانٹ دے۔ لیکن پھر وہ رکا اور اپنی نظریں اسکرین پر جما دیں۔ اس پر ٹائپ کیے ہوئے الفاظ ابھر رہے تھے: "میری مدد کرو! مجھے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے! میرا بایاں پہلو بے حس ہو چکا! میں اپنی کرسی سے نہیں نکل سکتی!"

"میرے خدا!" سین بڑبڑایا۔ "یہ تو ہرگز مذاق نہیں معلوم ہوتا!" یہ لڑکی سوزان ہرگز اس کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیل رہی تھی!

اسکرین کا معائنہ کرتے ہوئے سین نے دیکھا کہ دوسرے کھلاڑی اسے نظرانداز کر رہے تھے۔ وہ کمپیوٹر بند کرنے کے لیے بٹن دبانے ہی کو تھا کہ ایک خیال آتے رک گیا:

"ممکن ہے، وہ واقعی سنجیدہ ہو اور مذاق نہیں کر رہی۔ اگر اس کی جان خطرے میں ہے تو مجھے ضرور اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

اس نے پھر اپنی ماں کو آواز دی۔ "امی! ذرا یہاں آئیے! اس بچی کو مدد کی ضرورت ہے۔"

شیرون اس کے پاس چلی آئی۔

"یہ کوئی کھیل تو نہیں، واقعی اسے مدد کی ضرورت ہے؟" اس نے وہ پیغام پڑھتے ہوئے بیٹے کو بتایا۔

٭٭

مدد کی یہ پکار واقعی مذاق نہیں تھی۔ سولہ سالہ سوزان ہکس نیکساس سے سات ہزار میل دور واقع فن لینڈ کے شہر ہیلسنکی کے قریبی قصبے سرپیا میں کالج کی طالبہ تھی۔ وہ رات کو جب انٹرنیٹ پر ایک جغرافیائی پراجیکٹ کے لیے ضروری معلومات اکٹھی کر رہی تھی، تو اسے وہی جانی پہچانی اذیت ناک درد کی تیز و تند لہر اپنے ٹخنوں کے اوپر سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

"اف! یہ پھر ہو رہا ہے....." اس نے سوچا۔ وہ بچپن ہی سے ایسے حملوں کا شکار ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیروں میں ایک دم شدید درد کی لہر پیدا ہوتی جو ٹانگوں اور ریڑھ کی ہڈی تک جا پہنچتی۔ ڈاکٹر ابھی مرض کی تشخیص نہ کر پائے تھے، جانے یہ کیا بیماری تھی؟ تکلیف کا ایک شدید حملہ اسے کرسی میں دھنسا دیتا تھا اور وہ چلنے پھرنے ہی نہیں بولنے تک سے معذور ہو جاتی۔ جب یہ حملہ زیادہ شدید ہوتا تو پسلیوں کو کسی شکنجے کی طرح جکڑ لیتا اور اس کے لیے سانس لینا محال ہو جاتا۔

آج شام بھی اس کی رانوں اور کولہے میں چبھتے ہوئے درد کی ٹیسیں بجلی کے کرنٹ کی طرح دوڑنے لگیں۔ لائبریری میں مکمل سکوت طاری تھا۔ سوزان کو احساس ہوا کہ وہ اس وقت لائبریری کی تیسری منزل پر بالکل تنہا ہے۔ قریب ترین فون باہر راہداری میں رکھا تھا۔ اس کے لیے وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ معمولی سی حرکت اس کے جسم کو اذیت ناک حد تک تکلیف دیتی تھی۔ "کیا میں رینگ سکتی ہوں؟" اس نے اپنی آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی کرسی سے دروازے تک کے فاصلے کو ناپا، پھر نفی میں سر ہلایا۔ "بہت دور ہے۔"

پھر اسے خیال آیا ہے کہ اسے انٹرنیٹ پر کسی سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ "لیکن کیسے؟" وہ اکثر ژبیورن میں امریکا یا برطانیہ کے سائبر دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے انگریزی کی مشق کیا کرتی تھی۔ درد کی تیز و تند لہر پسلیوں تک پہنچتے پہنچتے وہ کمپیوٹر پر اپنی التجا کی پکار ٹائپ کرنے لگی۔

☆☆☆

"امی! میرے خیال میں یہ کوئی مذاق نہیں۔" سین نے کہا۔ وہ سوزان کے آخری پیغام پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ "وہ بھی شاید میری طرح دمے کی مریضہ ہے۔ اور کسی اپارٹمنٹ یا کمرے میں تنہا پڑی ہے۔" اسے وہ بھیانک راتیں یاد آنے لگیں جب وہ چھوٹا سا تھا۔ اس پر جب بھی دمے کا حملہ ہوتا، تو اسے اتنا زیادہ پسینا آتا کہ اس کی چادر بھیگ جاتی تھی اور چھاتی اور گلا بری طرح جلنے لگتے۔

"کیا تم 911 یا ای ایم ٹی کو کال کرسکتی ہو؟" اس نے ٹائپ کیا۔

کچھ دیر بعد اسکرین پر الفاظ ابھرے: "یہ ای ایم ٹی کیا چیز ہے؟"

سین حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ تو عجیب لڑکی ہے جسے ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن کے ابتدائی حروف بھی معلوم نہیں! حالانکہ ایک دس سالہ لڑکا بھی یہ بخوبی جانتا تھا۔ اس نے سوچا، شاید یہ کوئی ذرا پانچ یا چھے سال کی بچی ہے۔ اس نے پوچھا:

"تمھاری عمر کتنی ہے؟"

"میں سولہ سال کی ہوں۔" جواب ملا۔

شیرون نے مضطربانہ اپنا پاؤں زمین پر مارا اور بولی "یہ ہمیں بے وقوف نہیں بنا رہی..... یہ واقعی مصیبت میں مبتلا ہے!"

"تم کہاں ہو؟" سین نے ٹائپ کیا۔

وقفے کے بعد جواب آیا..... "فن لینڈ"

"فن لینڈ!" سین اور شیرون ایک ساتھ چلائے۔

سین نے پھر ٹائپ کیا۔ "کیا تم ہمارے ساتھ کوئی گیم کھیل رہی ہو؟"

سوزان بائیں پہلو سے اٹھنے والی اذیت ناک درد کی ٹیسوں کی شدت کم کرنے کے لیے دائیں سمت جھکی ہوئی تھی۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ لوگ اس کے "ایس او ایس" پیغام کو کسی کھیل کا حصہ سمجھیں گے۔ اس نے انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ الفاظ ٹائپ کیے:

"میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ ہرگز کوئی کھیل یا فریب نہیں، میری مدد کرو!"

سین اسکرین کو گھورنے لگا۔ ایک لڑکی دور دراز ملک میں اس کی فوری مدد کی طالب گار تھی۔ اور وہ صرف سین اور اس کی ماں ہی سے رابطہ کرسکی تھی۔

"امی، آپ چاہتی ہیں کہ میں شیرف کو کال کروں؟" شیرون نے پوچھا۔

"ہاں، کرو۔"

☆☆☆

ڈینٹن کاؤنٹی کے شیرف کی رابطہ افسر، ایمی شٹ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ایک ماہ تربیت پانے کے بعد وہ اپنی پہلی پوری سپروائزر کے ساتھ شام کی شفٹ میں کام کرتے بڑی خوش نظر آرہی تھی۔ چھے بج کر چودہ منٹ پر اس کے ہیڈسیٹ پر سگنل آیا۔ اس نے فون اٹھا کر کہا "911..... کیا ایمرجنسی ہے؟"

"میرا بیٹا کمپیوٹر پر تھا کہ اسے ایک لڑکی کا پیغام آیا ہے کہ وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کر رہی ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے....." شیرون بولی۔

ایمی ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شاید یہ حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) کا کیس تھا۔ "ٹھیک ہے..... وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"فن لینڈ میں۔"

"کیا کہا!" ایمی چلائی۔ یہ کہیں کوئی مذاق تو نہیں تھا! لیکن انھیں ہر کال کو حقیقی ایمرجنسی کی طرح نمٹنا ہوتا تھا۔ اس نے شیرون سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکی کا فون نمبر اسے بتائے۔

"آپ شاید یقین نہ کریں۔" ایمی نے اپنی سپروائزر، ڈیبورا سے کہا۔ "لیکن فن لینڈ میں ایک لڑکی کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

اب ڈیبورا بھی کمپیوٹر پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھر واقعے کی تفصیلات معلوم کیں۔ "یہ واقعی عجیب سا معاملہ ہے۔" اس نے سوچا۔ "تم فون پر رہو، میں پتہ کرتی ہوں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے ایمی سے کہا۔

سین نے کئی منٹ پہلے اس لڑکی کا فون نمبر ایمی کو بھیج دیا تھا۔ لیکن اس کی اسکرین پر میسج بکس خالی تھا۔ دن بھر اس وقت انٹرنیٹ اکثر جام ہوجایا کرتا تھا۔

"وہ آخر مدد کے لیے کسی کو فون کیوں نہیں کرتی؟" ایمی نے شیرون سے پوچھا۔

"وہ کہتی ہے، اس کی ٹانگیں حرکت نہیں کر سکتیں۔" شیرون نے جواب دیا۔

اسی وقت ایمی نے دیکھا، ڈیبورا تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دے رہی ہے۔ یہ واقعی حقیقی ایمرجنسی کا کیس تھا، وہ لڑکی ہرگز دل لگی نہیں کر رہی۔

سین نے ایمی کی درخواست پر سوزان کو پیغام بھیجا کہ وہ اسے مقامی ایمرجنسی نمبر سے آگاہ کرے۔ اس کے جواب میں اسے جواب ملا: "مجھے شدید چکر آرہے ہیں۔"

سین نے ٹائپ کیا "حوصلہ رکھو، ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

طویل وقفے کے بعد لڑکی کی طرف سے پیغام آیا:

"تکلیف...... بڑھتی جا رہی ہے۔"

اصل روزہ

حقیقی روزہ یہ ہے کہ آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور دیگر اعضا کو گناہ کرنے سے روکے۔ روزے کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ دل کو گناہ کے ارادوں اور دنیا کی فکروں سے دور رکھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے اس کو خالی کر دے۔ اللہ اور آخرت کے سوا کسی اور چیز کی، اور دنیا کی فکر میں مشغول ہونے سے اس درجہ کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے (یعنی روزہ کا کمال جاتا رہتا ہے)۔ ہاں، اگر دنیا کی فکر دین کی خاطر ہو، تو ایسی فکر دنیا سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ایسی دنیا آخرت کے لیے زادِ راہ کا حکم رکھتی ہے۔

(امام ابو حامد محمد الغزالی)

دو گھنٹے تک مسلسل اسکرین کو گھورتے رہنے کے سبب سین کا سر دکھنے لگا تھا۔ اس نے سوزان کو پیغام بھیجا کہ وہ اسے اپنا موجودہ اتا پتا بتائے۔ تھوڑی دیر بعد اسکرین پر چند الفاظ روشن ہوگئے۔

"وہ ایک اسکول میں ہے!" سین چلایا۔ اس وقت فن لینڈ میں رات کے دو بج رہے تھے۔

"صورتِ حال بڑی عجیب و غریب ہوتی جا رہی ہے۔" ڈیبورا نے مقامی آپریٹر کا نمبر ملاتے ہوئے سوچا۔

"کیا فن لینڈ میں کسی ذمے دار ایجنسی اور میڈیکل اسکواڈ سے رابطہ کروایا جا سکتا ہے؟ وہاں ایک لڑکی نے کمپیوٹر پر ہم سے مدد مانگی ہے۔"

آپریٹر نے قہقہہ لگایا اور بولا: "مذاق!"

"ہاں میں ہرگز مذاق نہیں کر رہی۔" ڈیبورا نے سنجیدگی سے کہا۔

اگلے دس منٹ میں اس نے مختلف آپریٹروں کو پیغام دیا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ فن لینڈ میں کسی فون آپریٹر سے رابطہ قائم کرانے کی کوشش کرنے لگے ہیں، اس لیے فون پر ہی رہے۔

اسے انتظار کرتے کرتے پینتالیس منٹ گزر گئے۔ وہ اس لڑکی کی طرف سے مسلسل پریشان رہی۔ دعائیں کرتی رہی کہ وہ زندہ اور خیریت سے ہو۔ بالآخر ایک آپریٹر نے اس کا کریوا ریسکیو اسٹیشن سے رابطہ کرا دیا۔ ڈیبورا نے انھیں تمام تفصیلات بتائیں اور کہا:

"میری درخواست ہے، آپ فوراً جا کر دیکھیں کہ اس کا کیا حال ہے۔"

فن لینڈ کے آپریٹر نے اسے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

جب سین نے یہ خوش خبری سنی، تو اطمینان کا سانس لیا اور سوزان کو پیغام ٹائپ کیا:

"ایمرجنسی والے تمھاری مدد کو پہنچ رہے ہیں۔"

کی بورڈ کے سامنے کرسی پر کٹی سکڑی بیٹھی سوزان کے کان باہر راہداری کی طرف لگ گئے۔ اس نے تھوڑی دیر بعد بھاری قدموں اور باتوں کی آوازیں سنیں جو راہداری کے موڑ کی طرف جا کر غائب ہو گئیں۔ اس نے سین کو میسج ٹائپ کیا:

"مجھے آوازیں سنائی دے رہی ہیں لیکن وہ اس طرف نہیں آ رہیں۔"

"پریشان مت ہو، وہ ضرور تمھیں تلاش کر لیں گے۔" جواب ملا۔

اسی وقت سوزان نے باہر راہداری میں تیز روشنی دیکھی۔ پھر کمرے کا دروازہ ایک دم کھل گیا اور ایمبولینس کا عملہ اور تین پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ وہ کی بورڈ کی طرف جھکی اور لکھا:

"وہ آن پہنچے ہیں۔ خدا حافظ....."

سین اپنے والدین اور بہن بھائیوں میں گھرا کرسی پر بیٹھا تھا۔ سب خاموشی سے کمپیوٹر اسکرین کو گھور رہے تھے۔ پھر سین بولا۔

"وہ اب محفوظ ہے....."

☆☆

بوعلی سینا کے اقوال

☆ اللہ کا خوف انسانی خوف کو دور کر دیتا ہے۔

☆ ہر شام سوچو کہ دن کے وقت تم سے کوئی بات منشائے ایزدی کے خلاف تو نہیں ہوئی اور پھر سجدے میں گر کر اگلے دن کو بہتر طور پر گزارنے کی دعا کرو۔

☆ جب آئے دن تمھاری رائے بدلتی رہتی ہے، تو پھر اس پر بھروسہ کیوں کرتے ہو۔

☆ زیادہ خوشحالی اور زیادہ بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتی ہے۔

☆ اتنا کھاؤ جتنا ہضم کر سکو اور اتنا پڑھو جتنا جذب کر سکو۔

☆ جو دنیا کا طالب ہے وہ علم سیکھے اور جو آخرت کا طالب وہ اپنے علم پر عمل کرے۔

(انتخاب: تنویر کاشف، بورے والا)

چار دن بعد ڈینٹن کے شیرف کو ہیلسنکی انٹرپول آفس کی طرف سے پیغام موصول ہوا "سوزان کے انٹرنیٹ دوست کا شکریہ۔"

انھوں نے سوزان کو ضروری طبی امداد بہم پہنچا دی تھی۔ وہ رو بصحت تھی۔ جب اس واقعہ کا عالمی سطح پر چرچا ہوا، تو امریکی اٹارنی جنرل، جینٹ رینو نے پیشہ ورانہ مہارت، مستعدی اور فرض شناسی دکھانے پر ڈیبورا سٹریکن اور ایمی شٹ کے لیے سرکاری اعزازات کی سفارش کی۔

بعدازاں ایک امریکی صحافی نے، فن لینڈ میں سوزان بکس سے ملاقات کی اور اس کا انٹرویو لیا۔ تب اس کی بیماری خاصی حد تک دور ہو چکی تھی۔ وہ سین ریڈن اور اس کے خاندان کی انتہائی شکرگزار تھی۔ اس نے ڈیبورا سٹریکن اور ایمی شٹ کے لیے بھی ممنونیت اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کیا۔

نیشا پور کے ولیِ کامل

حضرت فرید الدین عطارؒ

آپؒ کی تصانیف علم و آگہی کا گراں مایہ خزانہ ہیں

زید گل خٹک

وہ تیرھویں صدی عیسوی کا اداس دن تھا۔ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی آتش و آہن کی آندھی وسطی ایشیا میں خوارزم شاہی سلطنت میں قیامت برپا کر چکی تھی۔ اس کا آخری حکمران علاؤالدین خوارزم شاہ شکستہ دل ہو کر خیمہ بردوش تھا۔ لیکن اس کا دلیر فرزند جلال الدین پامردی اور شجاعت کی وہ تاریخ رقم کر رہا تھا جس پر گرگ صحرائے گوبی تو کجا چشم فلک بھی حیران تھی۔ خلافت بنی عباس کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور ترکمان عثمانی اپنے قدم جمانے کی فکر میں تھے۔ سلاطین ہند "ہندوستان بچاؤ" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

دوسری طرف شعر کی دنیا میں بہار کا سماں تھا۔ فلسفہ و ادب کے دبستانوں میں رونق تھی۔ فقہ و حدیث کے مکتب آباد تھے۔ جرح، تعدیل اور مناظروں کا بازار گرم تھا۔ لیکن حرب و ضرب کے فنون نصاب متروک کا منظر پیش کر رہے تھے۔ اسی لیے ناموس کی حفاظت کے لالے پڑ گئے۔ کوئی بھی ایسا امام برحق نہیں تھا جو وحدت کے آئینے میں رخ دوست دکھاتا۔

تنہا جلال الدین کس کس محاذ کو سنبھالتا؟ منگولوں کا سیل بے اماں روکتا، قرامطیوں کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرتا یا قلعہ الموت کے فتنہ پرور کی سرکوبی کرتا؟ پرخطر داستان کا یہ مسافر جلال الدین بالآخر ۱۲۳۱ء میں شہید ہوا۔ ان کی تیغ آبدار تاتاری کے ہاتھ لگی اور مزار کا کچھ پتا نہیں چلا۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ حد سے زیادہ خود اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔ خطروں سے غفلت بہت بڑی تباہی ہے۔ اسی از حد خود اعتمادی نے ایک دفعہ مسلمانوں کے ہر خانہ آباد کو ویران کیا تھا۔ جلتے گھر، کٹے ہوئے سر، دریدہ لباس، مرد و زن، روتے کرلاتے بچے، دجلہ و فرات میں بہتے ہوئے علم کے تابدار گوہر اور بلا کا شر.... عبرت کا یہ وہ سامان ہے جس کی لرزہ خیز نمائش تاریخ کے ہر ورق پر نظر آتی ہے۔

روایت ہے کہ تاریخی شہر نیشا پور کی ایک گزرگاہ پر اپنے عصر کا عظیم و جلیل انسان، ولیِ کامل اور بحرالعلوم



فکر میں غلطاں چلا جا رہا تھا۔ یہ دل آویز شخص کوئی اور نہیں محمد بن ابوبکر بن ابراہیم المعروف خواجہ فریدالدین عطار تھے۔

بقول عارف رومؒ

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

یکایک ایک منگول سپاہی نے آپ کی استخوانی کلائی کو پنجۂ استبداد میں لے لیا۔ قریب ہی سے ایک کرم فرما گزر رہے تھے جو حضرت عطار کے شناسا تھے۔ کتمانِ ایمان پر مجبور تھے پھر بھی اتنا کہہ دیا جو اس دورِ ظلمت میں روشنی کی کرن اور گلستانِ خزاں منظر میں پھول کی پتی پر شبنم کے مصداق تھا:

"اے تاتاری! ان بزرگ کو چھوڑ دے۔ اس کے عوض مجھ سے دس ہزار دینار لے لے۔"

حملہ آور کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی، بزرگ نہایت عجلت سے بولے "تاتاری! یہ شخص مول کم دے رہا ہے۔ میرا عوض اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

سپاہی خوش ہوا کہ اسامی بڑی ہے اور مال زیادہ ملنے کا امکان ہے۔ تاتاری آپ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے آگے چلتا بنا، تو ایک اور صاحب آڑے آئے۔ وہ بھی عطار کے غمخوار تھے۔ اس نے تاتاری سے کہا "یہ بھوسی لے اور ان بزرگ کو رہا کر دے۔"

تاتاری جواب دینے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ عطار گویا ہوئے: "پیشکش قبول کر لے۔ بھوسی بادشاہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ بادشاہ تو زر، بھوسی جوڑتی ہے۔"

یہ عجیب بات سن کر سپاہی کو دس ہزار دینار کھو دینے کا شدت سے قلق ہوا۔ اس نے آتشِ غضب میں جل کر حضرت عطار کو شہید کر دیا۔

بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ اس نے زمین کا نمک خاک میں ملا دیا تو وہ مسلمان ہو کر اس خاک پر مجاور بن بیٹھا جہاں شیخ عطار آسودۂ خاک تھے۔ یاد رہے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

٭٭٭

حضرت فریدالدین عطارؒ نیشاپور، ایران کی ایک نواحی بستی کدکان میں ۱۱۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ نیشاپور، حجاز و عراق کے بعد سب سے بڑا مرکزِ تصوف و عرفان رہا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ کمال یہاں تشریف لائے۔ حضرت ابوحامد غزالیؒ کا تعلق بھی خراسان (نیشاپور) کے ایک قصبہ طوس سے ہے۔

حضرت عطارؒ کے والد بزرگوار عطر اور ادویہ کا کاروبار کرتے تھے۔ بدقسمتی سے والد آپ کے دورِ کم سنی میں ارتحال فرما گئے۔ ورثے میں آپ کے لیے وسیع کاروبار چھوڑا۔ تعلیم و تربیت آپ کی والدہ محترمہ نے فرمائی۔ وہ صوفی منش خاتون تھیں۔ صاحبِ احسان ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ ظاہری میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ انھوں نے بیٹے کے دل میں علومِ ظاہری و باطنی کا عمدہ ذوق پیدا۔ سو آپ ان کی تربیت سے انجم کے ہم قسمت ہوئے۔

آپ حصولِ علم کے لیے مشہد بھی گئے۔ وطنِ مالوف واپس لوٹ کر موروثی کاروبار شروع کیا اور اس کو خوب وسعت دی۔ بہترین نبض شناس تھے۔ خود نسخہ لکھ کر دیتے اور مریض آپ کے دواخانہ سے دوا لیتے۔ کاروبار میں مصروفیت کے باوجود شعر موزوں فرماتے۔

ایک دن کاروبارِ معاش میں مگن تھے کہ ایک درویش دروازے پر آ گئے۔ ان کی مصروفیت دیکھ کر درویش نے حسرت سے آہ بھری اور ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ عطارؒ ان کا انداز بھانپ گئے اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے بولے "بابا جی! اپنا راستہ لو۔"

درویش نے کہا "میرے لیے جانا دشوار نہیں، لیکن تیرے لیے بہت کٹھن ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر جان کس طرح دو گے؟"

عطار نے جھنجھلا کر کہا ''جیسے تم جان دو گے۔''

درویش بولے ''بھلا میری طرح کیسے دو گے۔'' یہ کہتے ہوئے سر کے نیچے کشکول رکھا اور حق ہو کا نعرہ مستانہ لگا کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

حق رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

منظر دیکھ کر حضرت عطار کے دل میں دُنیا سرد پڑ گئی۔ دل کی تشنگی تڑپانے کا بوجھ لیے تلاشِ یار کے جاں گداز سفر پر روانہ ہوئے۔ اور اس وادی نور افشاں کے موتی چننے لگے جسے عقبہ تصوف کہتے ہیں۔

یہ قدم قدم قیامت، یہ سوادِ کوئے جاناں

جسے زندگی ہو پیاری وہ یہاں سے لوٹ جائے

سب کچھ راہِ حق میں لٹا کر آپ شیخ رکن الدین عکافؒ کی خانقاہ پہنچے۔ وہاں سے گوہر ابدار چنتے ہوئے شیخ مجد الدین بغدادیؒ کے آستانہ عالیہ میں گئے اور ان کے حلقہ بگوش ہوئے۔ بقول اقبال لاہوریؒ

کیمیا پیدا کن از مشتِ گِلے

بوسہ زن بر آستانِ کاملے

دل بینا کے فلک پر سارے ستارے چمکنے لگے، تو بلادِ اسلام کے سفر پر نکلے۔ حجاز شریف، کوفہ، مصر، دمشق، ہندوستان اور ترکستان سے ہوتے اپنے وطن واپس لوٹے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تب بقول شاعر مشرق آپ کی حالت یہ تھی:

نظر بخویش چنا بستہ ام کہ جلوہ دوست

جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

مَن زصید نہنگاں حکایتے آورم!!!

گماں مبر کہ ورقِ ما روشناب دریا نیست

آپ نے دبستانِ تصوف میں گرانقدر اضافہ کیا۔ تنہا حیثیت میں ایک ادارے سے بھی زیادہ کام کر گئے۔ آپ کے تمام فن ادب اور تصانیف علم و آگہی خصوصاً عرفان و تصوف کا گراں مایہ خزانہ ہے۔

آپ کے تصانیف میں اسرار نامہ (یہ کتاب آپؒ نے عارف رومؒ کو ان کے بچپن میں ہدیہ کی تھی) پند نامہ، تذکرۃ الاولیاء، جواہر نامہ، حقائق الجواہر، خالج نامہ، لسان الغیب، شرح القلب، کنز الحقائق، مفتاح الفتوح، مظہر العجائب، منطق الطیر اور وصیت نامہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

ورق تمام ہوا، مدح باقی ہے

سفینہ چاہیے، اس بحرِ بیکراں کے لیے

●●●

سنہری باتیں

☆ اگر آپ کہے بغیر دوسرے کو معاف کر دیں، تو اُس کا اجر بڑھ جاتا ہے۔

☆ جھوٹ کو یاد رکھنا پڑتا ہے لیکن سچ کو نہیں۔

☆ اچھی بات ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے۔

☆ اگر آپ نے اپنے راز کی بات کسی سے کہہ دی، تو پھر شکوہ کیسا کہ وہ پھیلی کیسے؟

☆ بات کہہ دینے سے نہیں بنتی، اس کا سمجھ آنا ضروری ہے۔

☆ وہ شخص کبھی نہیں مرتا جو زندگی میں دوسروں کے لیے جیتا رہے۔

☆ سچ کہتے ہیں، جو اپنا نہیں رہا وہ کسی کا کیسے بنے گا؟

☆ اگر زندگی میں جلد کچھ سیکھنا چاہتے ہو، تو اپنے بزرگوں کے پاس بیٹھو۔

☆ بخش دینے والا رب ہے۔ لیکن بخشش کا حساب اعمال سے ہوگا۔

(ساجدہ سرفراز، کینٹ، لاہور)

جدید دور کے تراے تقاضے اور

نئے پیمانے

ایک ایمان دار سرکاری افسر کا تیکھا افسانہ، وہ لالچی بھیڑیوں کے جنگل میں پھنس گیا تھا.....

طرح دار ادیب کی یادگار قلمی سوغات

مسعود مفتی

افسر تبدیل ہوا... دوسرا آگیا۔

ایک ملاقاتی کمرے میں علاقے کے معتبرین بیٹھے تھے۔۔ وہ باری باری نئے افسر سے ملاقات کرنے جا رہے تھے۔ کمرے سے چپراسی نے پرانے صاحب کے نام کی تختی اتار دی اور اب نئی لگا رہا تھا۔

لوگ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ موضوع نئے افسر کی ذات تھی۔ کس قسم کا ہے؟ پہلے کہاں کہاں رہا؟ وہاں کیسے وقت گزارا؟ وغیرہ وغیرہ۔ کسی کا چچا، ماموں کسی کی لڑکی کا سسرال، دور دراز کا رشتہ دار یا ملنے والا ضرور کسی ایسے علاقے میں رہتا ہوتا، جہاں اس افسر نے پہلے ملازمت کی تھی۔ تبادلے کی خبر کے ساتھ خطوط چل پڑے تھے۔ اب اس کے ماضی کی واضح تصویر ملاقاتیوں کے سینوں میں موجود تھی اور وہ دبی آواز میں اپنی اطلاعات کا تبادلہ کر رہے تھے۔

اتنے میں دو آدمی ملاقاتی کمرے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ صاحب کا چپراسی لپک کر بنچ سے اٹھا۔ جھک کر فرشی سلام کیا۔ مصافحہ کر کے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور بھاگ کر ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

جب وہ اندر داخل ہوئے، تو سب ملاقاتی کھڑے ہو



گئے۔ دو ایک نے اپنی کرسیاں ان کے لیے چھوڑ دیں۔ باقی سمٹ سمٹ کر بیٹھنے لگے۔

انھوں نے سرسری انداز میں دو چار لوگوں کا حال پوچھا۔ چند ایک انکسار سے آگے بڑھے، تو ان کے ساتھ احساس برتری سے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''جناب کی اطلاع اندر دوں؟'' چپراسی بولا جو خوشامد سے دانت نکال رہا تھا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سوچا۔ پھر ایک بولا ''کتنی دیر ملاقاتی لے رہا ہے؟''

''بس پانچ منٹ۔''

''تو بس ٹھیک ہے۔ جب سب فارغ ہو جائیں۔ تو ہم اطمینان سے ملیں گے۔''

''بہتر حضور۔''

ان میں سے ایک بھاری بھرکم تھا کوئی پچاس برس کا۔ سر پر سنہرا کلاہ اور سفید کلف دار پگڑی، گھنی مونچھیں، توند کے اوپر اچکن پھنسی ہوئی جیبی گھڑی کی زنجیر، اچکن کے بٹن اور جیب کے درمیان لٹکتی ہوئی۔ ہاتھ میں مرصع چھڑی۔

دوسرا آدمی لمبا اور دبلا تھا۔ عمر سے پہلے ڈھلا ہوا، سوٹ میں ملبوس، سر کے کھچڑی بال سلیقے سے جمے ہوئے۔ ہونٹوں میں سگریٹ اور چہرے پر بے نیازی۔ آنکھیں سنہرے فریم والے کالے شیشوں سے ڈھکی ہوئیں۔

ملاقاتی باری باری اندر جا رہے تھے۔ جب آخری آدمی گیا، تو صرف یہ دونوں کمرے میں رہ گئے۔

اچکن والے نے سوٹ والے کی طرف دیکھا اور بولا ''کیا خیال ہے جی آپ کا؟''

دوسرا خاموشی سے سگریٹ کا کش لگاتا رہا۔

''کچھ سنا آپ نے صاحب کے متعلق؟'' اس نے پھر پوچھا۔

سوٹ والے نے کش ختم کر کے راکھ جھاڑی، اطمینان

صاحب تحریر



ممتاز افسانہ نگار اور سرکاری افسر، مسعود مفتی ۱۰ جون ۱۹۳۴ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم اے کیا اور پھر سرکاری ملازمت کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں پر متاثر کن افسانے، رپورتاژ اور مضامین لکھے۔ عموماً معاشرتی و سیاسی موضوعات کو اپنی تخلیقات میں برتتے ہیں۔ نئے پیمانے آپ کے فن کو بخوبی اجاگر کرتا خوبصورت افسانہ ہے۔

سے دھوئیں کے دو تین چھلے منہ سے اگلے اور طنزیہ بولا ''سنتے ہیں سخت افسر ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہیں کی پچھلی جگہ دو تین کلرکوں نے رشوت لی، تو انھیں ... کر دیا تھا۔'' اس نے دوسرے کی نظروں میں نظریں ڈال کر ... آمیز انداز میں کہا۔ دو تین لمحے ایسے ہی دیکھتا رہا، پھر خود ہی بولا

اچکن والے نے ... سے سر ہلایا اور بولا ''ہاں چھوٹے دل کا آدمی ہے۔ کسی کو پیچھے ... نہیں دیکھ سکتا، بالکل تنگ نظر ہے۔''

دونوں کی آنکھوں میں حقارت ...

''آپ شیخ انتظام الدین کو جانتے ہیں؟''

''کون وہ جو اسمبلی میں ہیں؟''

''ہاں ہاں وہی۔ اب آپ ہی سوچیں کتنے بڑے زمیندار ہیں۔ لاکھوں کی جائداد۔ علاقے میں دور دور تک نام۔ مگر ...

ہے کہ انھوں نے ایک دو کام کرنے کے لیے صاحب سے کہا، تو اس نے انکار کر دیا۔"

"نہ صرف یہ جی" سوٹ والا بولا "بلکہ میں نے سنا ہے کہ سرکاری قرضہ جات کی وصولی کے لیے اسے جیل میں ڈالنے کی دھمکی دی۔"

"بالکل ٹھیک سنا آپ نے" اچکن والا سر ہلا کر بولا "توبہ توبہ..."

چند منٹ خاموشی رہی اور پھر اچکن والا بولا "دراصل قصہ یہ ہے کہ صرف خاندانی آدمی ہی خاندانی آدمی کی قدر کر سکتا ہے۔ نئے ڈپٹی صاحب کوئی خاندانی نہیں لگتا۔ اب بھلا اس میں بات ہی کیا تھی اگر شیخ نظام الدین کی عزت کے لیے چند کنجڑوں اور چماروں کو دبا دیتا اور ان کے خلاف فیصلے کرتا۔"

"بالکل بالکل۔" سوٹ والے نے فوراً سر ہلایا اور سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ پھر نتھنوں سے دھوئیں کا ابر چھوڑتے ہوئے بولا "پھر جی ایسوں کا حشر بھی، تو دیکھ لیں نا، جلد ہی کے ذریعے تبادلہ ہوا۔"

دونوں خاموشی سے سوچنے لگے۔

اتنے میں چپراسی آیا۔ "آئیے جناب۔"

اچکن والا اٹھ کر دفتر کی طرف بڑھا۔

صاحب نوجوان اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اس نے اٹھ کر اخلاق سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھنے لگے۔ نئی جگہ کی باتیں ہوئیں۔ پچھلی جگہ کا ذکر ہوا۔ ملاقاتی نے اپنے خاندان کے دو چار ایسے لوگوں کا بار بار ذکر کیا جو صاحب کے خاندان کے دور دراز کے لوگوں کو جانتے تھے۔ باتوں باتوں میں اپنا تعارف بھی کراتا گیا۔ "میرے دادا سارے پنجاب میں پہلے خان بہادر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد انھیں سرکار کی طرف سے خدمات کے عوض خلعت بھی ملی تھی۔"

صاحب نے مروت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اور جی میرے والدین پر بھی سرکار بڑی مہربان تھی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں جو دربار ہوا تھا، اس میں ان کو خاص طور پر قطار کے سرے والی کرسی ملی... اور پھر شاہ ایڈورڈ انگلستان کے تخت پر بیٹھا، تو وہ تاجپوشی میں شرکت کے لیے ولایت بھیجے گئے۔"

صاحب نے متاثر ہونے کے انداز میں ابرو اوپر اٹھائے۔

ملاقاتی فخر سے ہنسا "بہت خدمات ہیں جناب ہماری۔ میرے والد پر انگریز خاص طور پر مہربان تھے، سب افسر شکار کھیلنے ہماری زمینوں پر آتے تھے۔"

صاحب ہنستا اور ملاقاتی اپنا تعارف کراتا رہا۔ دو ایک دفعہ صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف بھی نگاہ کی مگر وہ نظر انداز کر گیا اور اپنے بزرگوں اور انگریزوں کے تعلقات کے قصے سناتا رہا۔

"کیا زمانے تھے جناب وہ بھی۔ انگریز کا راج اب بھی یاد آئے، تو دل کھل جاتا ہے۔"

صاحب کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "اچھا ملک صاحب پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے۔"

ملاقاتی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور قریب ہو کر قدرے دھیمی آواز میں بولا "ہم لوگ سرکار کے پرانے خدمت گار ہیں۔ کل دو بھینسیں بنگلے پر بھجوا دوں گا۔ جب سوکھ جائیں گی، تو ان کی جگہ دوسری آ جائیں گی۔"

"نہیں نہیں ملک صاحب۔" صاحب نے ہنس کر کہا "آپ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی جناب، میرے تو درجن بھر گائے بھینسیں رکھی ہی افسروں کے لیے ہیں، میرا تو بس اپنا کام رک رہا ہے۔ وہی بھجوا دوں گا جوں شیخ صاحب والی بھینسیں انھوں نے بھی تین سال استعمال کی ہیں، مجھے کیا فرق پڑے گا۔"

"نہیں نہیں، آپ بالکل تردد نہ کریں" صاحب نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"اچھا تو، وہ اور قریب ہوگیا۔ آج کل نئی فصل آئی ہے۔ دانے اور گھی بھجوادوں گا۔"

صاحب نے بے صبری سے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا کیا جاتا ہے جناب۔ گھر کے دانے ہیں۔ گھر کا گھی ہے۔ جہاں ہمارا اتنا بڑا کنبہ کھاتا ہے، ایک آپ کے کھانے سے کون سا فرق پڑے گا۔"

صاحب انکار کرتا گیا، مگر ملاقاتی نے اصرار جاری رکھا، تو اس نے ذرا سختی سے کہا "ملک صاحب یہ میرا اصول نہیں۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔"

ملاقاتی نے مایوسی سے اسے دیکھا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"تمھاری گندم تیار ہے۔" وہ چپراسی سے سرگوشی میں بولا "آ کر لے جانا۔"

چپراسی نے جھک کر سلام کیا۔

سوٹ والا اندر چلا، تو اس نے اچکن والے سے کہا "آپ ذرا انتظار کریں، میں فارغ ہوتا ہوں، تو اکٹھے چلیں گے۔"

وہ اندر گیا، تو صاحب خوش خلقی سے ملا۔ دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر صاحب نے خود ہی پوچھ لیا "آپ کی مل کیسی چل رہی ہے؟"

"کون سی؟"

"وہ جو یہاں ہے۔"

"اچھا اس کا کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھا آپ نئی مل کا ذکر کر رہے ہیں۔" پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہاں والی بھی اچھی ہے، مگر میں اسے بیچ رہا ہوں۔ کوئی اچھی پارٹی مل جائے، تو سودا کرلوں۔"

"کیوں بیچ رہے ہیں آپ؟"

"دراصل جی یہ میری سب سے پہلی مل تھی۔ اس کے منافع سے اب میں سات فیکٹریاں اور لگا چکا۔ مجھے اس کی

بیٹا (باپ سے): ابو، جب امی گانا گائیں، تو آنکھیں کیوں بند کرلیتی ہیں؟

باپ: بیٹا، تمھاری امی بہت رحم دل ہیں۔

بیٹا: وہ کیسے؟

باپ: ان کا گانا سنتے ہوئے دوسروں کی جو بُری حالت ہوتی ہے، وہ اسے نہیں دیکھ سکتیں۔

(وحید احمد، لاہور)

مشینری بھی پرانی ہوچکی، میں نے کہا، (آنکھ مار کر) دفع کرو!" اپنی عقل کی داد لینے کے لیے اس نے فخریہ قہقہہ لگایا اور نکٹائی کی گرہ درست کی۔

صاحب بھی ضابطے سے مسکرایا اور بولا "آپ کو تو شروع میں انکم ٹیکس بھی تو معاف ہوتا ہے نا۔"

"جی جی لیکن وہ وقت اب ختم ہوگیا۔ اس لیے اسے بیچ کر اب نئی لگاؤں گا تاکہ اس پر ٹیکس نہ لگے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کاروباری چیزیں ہیں، تو آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

"جی نہیں کاروبار، تو ہر ایک کو کرنا چاہیے۔ اسلام نے بھی تجارت پر زور دیا ہے، آپ کو بھی کاروبار کرنا چاہیے۔"

افسر خفیف سی ہنسی ہنسا۔

"نہیں نہیں میں مذاق نہیں کر رہا۔ اگر آپ کی خواہش ہو، تو میری نئی فیکٹری میں شیئرز خرید لیجیے۔"

اب کے صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولا "توبہ کریں جی۔ ہمارے پاس اتنا پیسا کہاں۔ تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی سے گزارہ ہوتا ہے۔"

"نو نو نو۔ آپ فکر نہ کریں، ڈونٹ یو وری اباؤٹ منی، ہمارے پاس ایک فنڈ ہے، جس میں سے اپنے مہربانوں کو قرضے دے سکتے ہیں۔"

"قرضہ ادا کرنے کو پیسے کہاں سے لائیں گے؟"

"ارے آپ اس کی فکر نہ کریں، حصص کے منافع سے ادا کرا دیجیے گا۔"

افسر نے نفی میں سر ہلایا اور کہا "کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے۔ آپ کاروبار کریں، ہم تو نوکریوں کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی سے گزارہ کریں گے۔"

ملاقاتی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جیب سے سونے کا کیس نکالا اور کھول کر صاحب کو سگریٹ پیش کیا۔

"معاف کیجیے میں تو پیتا نہیں۔"

اس نے خود ایک سگریٹ نکالا۔ ڈبا بند کر کے سرے کو اس پر مارا اور ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا "بہرحال..... اس پیش کش پر سوچیے گا۔"

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"یہاں کام، تو کافی ہوگا آپ کے لیے" ملاقاتی نے کہا۔

"جی ہاں کام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ملازمت جو ہوئی۔"

"اگر کبھی بور ہو جائیں، تو آرام کرنے کے لیے لاہور، مری وغیرہ کا چکر لگا لیا کریں۔"

صاحب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"لاہور، مری، کراچی اور راولپنڈی میں، میں نے بنگلے بنوائے ہیں۔ آپ وہاں جتنے دن چاہے رہیں۔"

افسر نے مسکراتے ہوئے کہا "دن جانے جی اتنی دور، یہاں سے فرصت ملنا مشکل ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ ہم یہاں آپ کی پارٹی کر دیں گے۔"

افسر کھڑا ہو گیا "اچھا جی، پھر ملیں گے۔"

ملاقاتی بھی کھڑا ہوا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "ہاں کبھی فرصت میں آؤں گا۔"

"خدا حافظ۔" صاحب نے کہا۔

ملاقاتی چلا اور دروازے پر رک کر مڑا "میرے پاس کچھ انگلش وسکی آئی تھی۔ میں ایک کریٹ چپراسی کے پاس چھوڑ جاؤں؟"

افسر مسکرایا "نہیں بھائی میں تو ڈرنک نہیں کرتا۔"

"اچھا تو پھر گڈ بائی۔"

باہر نکلے، تو اچکن والا ملاقاتی بھی تیار کھڑا تھا۔ دونوں کار کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور نے گاڑی چلائی، تو اچکن والے نے پوچھا "کیسی رہی ملاقات؟"

"بوگس آدمی ہے۔" دوسرا بولا۔

پھر دونوں اپنی اپنی ملاقات کا حال ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

کار چل رہی تھی اور وہ باتیں ختم کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ اچکن والا سوچ سے نکل کر بولا "خدا بھی ایسے لوگوں کو افسر بنا دیتا ہے جنھیں افسری کرنا ہی نہیں آتی۔"

سوٹ والے نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "اب آپ شیخ صاحب ہی کو لیں۔ کیا ریل پیل تھی۔ کیا رونق تھی۔ گندم آ رہی ہے۔ گھی کے ٹین اتر رہے ہیں۔ دربار لگا ہے۔ عوتیں اڑ رہی ہیں۔ خاندانی لوگوں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔ جس کام کے لیے کہیے جھٹ ہوا کر دیا....."

"وہ دولت مندوں کا یار تھا۔" اچکن والا بات کاٹ کر بولا "کیا بات تھی! افسری تو وہ کر گیا ہے۔"

پھر دونوں اپنی پچھلی یادوں میں کھو گئے۔

کار چل رہی تھی۔

معاً اچکن والا بولا "مگر یقین، جلد ہی پیچھا چھوٹ جائے گا اس سے۔"

"ہاں جی۔" سوٹ والے نے زور سے سر ہلایا۔ "کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

کار چلتی رہی۔ انجن غرا رہا تھا۔



مریم جمیلہ کے شوہر اور میرے

اباجان

ایک نومسلم خاتون کو دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے والے منفرد مسلمان کی سہانی یادیں..... بیٹی کے شستہ قلم سے

ماریہ خانم

ماریہ "ماریہ!" جیسے ہی دوپہر کے بارہ بجتے، اباجان مجھے آوازیں دینے لگتے۔ میں گھر کا کام جلد از جلد ختم کر کے ٹھیک اسی وقت ابو کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتی۔ اپنے نکلنے کی دعا پڑھ کر میرے قدم تیزی سے اباجان کے دکان کی طرف اٹھتے جو بمشکل پانچ منٹ کی مسافت پر تھی۔ روزانہ بلا ناغہ چادر اتارے بغیر میں ابو کے پلنگ کی طرف بڑھتی۔ میں ان کے انتظار کی گھڑیاں لمبی نہ ہو جائیں اور کہتی "ابو جی! السلام علیکم!" جواب میں وعلیکم السلام کہتے ہوئے ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا۔ میں ان کے ماتھے پہ پیار کرتی اور ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی۔ انھیں کہتی کہ ابو! آپ صرف ایک آواز دیا کریں، اگر جواب نہ ملے تو سمجھ لیں کہ میں نہیں آئی۔

یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ اپنے گھر کا سارا کام وقت پہ ختم کر کے میں روزانہ ابو کے پاس تقریباً دو گھنٹے گزارتی۔ ان دو گھنٹوں میں وہ بہت سی پرانی یادیں تازہ کرتے۔ میں انھیں اخبارات اور رسائل پڑھ کر سناتی تاکہ وہ حالاتِ حاضرہ سے

باخبر رہتیں۔ ہر خبر کے ساتھ ساتھ ان کے تبصرے سے محظوظ ہوتی۔ امی (مریم جمیلہ) جنھیں سب "آپا" کہتے تھے کی وفات کے بعد ابا جان خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک دن غسل خانے جانے کے لیے اٹھے، لیکن کچھ دور جا کر گر پڑے۔ اس کے بعد وہ چلنے پھرنے سے کترانے لگے۔ وہ ۱۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کی رات تھی جب انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یوں ساری زندگی راہِ حق پر چلنے والا شخص اپنے رب کے حضور پہنچ گیا۔ وہ ان شاء اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جنھیں رب بہت محبوب رکھتا ہے۔

یہ تو ہمارے رب کائنات کی ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے، اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قربان جاؤں اپنے اللہ میاں پر جس نے مجھے پیاری دو مائیں اور ابا جان عطا کیے۔ انھوں نے ہمارے گھر کو امن و سکون کا گہوارہ بنا دیا۔ زندگی کے اکیس سال والدین کے گھر گزارنے کے باوجود مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ ہم دو ماؤں کی اولاد ہیں۔

ہم تیرہ بہن بھائی ہیں۔ مجھ سے پہلے ایک اور بہن ہے۔ ہم دونوں سب بہن بھائیوں کی محبت کا مرکز رہیں۔ ابا جان جماعت اسلامی کے سرگرم رہنما تھے۔ جماعتی کاموں میں صبح و شام مصروف ہونے کے باوجود وہ بطور شوہر، بیٹا، بھائی اور باپ اپنی ذمے داریوں سے پوری طرح نہ صرف آگاہ تھے بلکہ ان میں ہر رشتے کو نبھانے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی تھی۔

میری یادوں کے دریچے میں سب سے پہلے بچپن کا وہ باب کھلتا ہے جب میں سات آٹھ سال کی تھی اور میری دادی اماں حیات تھیں۔ انھوں نے ماشاء اللہ سو سال عمر پائی۔ میں نے ابا جان کو نہایت خدمت گزار بیٹا پایا۔ وہ خود والدہ کو اپنے ہاتھوں سے نہلاتے، پاؤڈر لگاتے اور کپڑے پہناتے۔ ان کی شخصیت میں رعب اور دبدبہ تھا۔ لیکن مخاطب کے ساتھ مزاح کرنا بھی وہ بہت خوبصورتی کے ساتھ جانتے تھے۔ مولانا مودودیؒ اور میاں طفیل محمدؒ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ ان کی یادیں تازہ کرتے ہوئے آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ میں ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوری طرح ان واقعات کے حصار میں آ جاتی اور وہ ایک کے بعد اگلا قصہ سناتے چلے جاتے۔

انھیں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت خالدؓ بن ولید، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی جیسی اسلامی شخصیات بہت محبوب تھیں۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں بھی جانباز مسلمان کی جھلک واضح نظر آتی۔ آخری دنوں میں بستر پر لیٹے لیٹے اللہ پاک کی یاد کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے شعروں سے نہ صرف اپنے آپ کو گرماتا بلکہ ارد گرد بیٹھنے والوں کے ایمان تازہ رکھنا ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ وہ گنگنا کر پڑھتے۔ وہ شعر کیا تھے، ان کے دل کی آواز تھی جسے سن کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے۔ کبھی کبھی میں علامہ اقبالؒ

مرحوم کا تعارف

جماعت اسلامی، لاہور کے ممتاز راہنما، محمد یوسف خان ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو وفات پائی۔ آپ نے زندگی کا بیشتر عرصہ لاہور کے مشہور محلے، سنت نگر میں گزارا۔ آپ علاقے کے تین بار کونسلر منتخب ہوئے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۶۳ء میں مشہور نو مسلم خاتون، مریم جمیلہ سے آپ کی دوسری شادی ہوئی۔ اس بندھن سے تین بیٹیاں اور دو بیٹے تولد ہوئے۔ (پہلی بیٹی نے بچپن ہی میں وفات پائی)۔ مریم جمیلہ اکتوبر ۲۰۱۲ء میں فوت ہوئیں۔ مرحوم کی پہلی بیگم نے پانچ بیٹیوں اور تین بیٹوں کو جنم دیا۔

کے شعر کا پہلا مصرع پڑھتی، تو ابا جان اسے مکمل کر دیتے۔ درج ذیل شعر انھیں بہت پسند تھے:

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو!
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

☆☆

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

☆☆

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ابا جان نے بارہا اپنے علاقے سے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ وہ ایک کامیاب کونسلر تھے۔ میں نے انھیں نماز فجر کے بعد کبھی گھر پر نہیں دیکھا۔ وہ روزانہ منہ اندھیرے اپنے حلقے کی خبرگیری کے لیے گھر سے نکلتے اور تقریباً آٹھ بجے واپس آتے۔ تب تک اہل محلہ کے بہت سے کاغذات جمع ہو چکے ہوتے جن پر انھوں نے اپنے دستخط کرنے ہوتے۔

بطور کونسلر انھوں نے حلقے کی ترقی کے لیے جتنا کام کیا، اس پر لکھا جائے، تو کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان کی سیاست ایسے ارکان اسمبلی کے لیے مشعل راہ ہے جو لوگوں کے ووٹوں سے پارلیمان میں پہنچتے لیکن پھر پیچھے سب بھول جاتے ہیں۔ انھوں نے بطور کونسلر جو کچھ بھی بنوایا، وہیں اپنے نام کا پتھر نہیں لگوایا۔

ابا جان مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ چاہے ایوب خان کا دور ہو، ذوالفقار علی بھٹو یا میاں نواز شریف کا، انھوں نے مولانا مودودی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جماعت اسلامی کے ہر پلیٹ فارم پر صف اول کے مجاہد کا کردار ادا کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ میاں نواز شریف کے دور میں

مشہور خواتین نے دنیا کو کیسے پایا؟

☆ میں نے زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ آپ نے جو بھی کہا، جو بھی کیا، لوگ وہ سب بھول جائیں گے۔ یاد رکھیں تو صرف اتنا کہ آپ نے انھیں کیسے احساسات سے نوازا تھا۔ (مایا اینجلو)

☆ میں احساس جرم کے ساتھ جینے پر یقین نہیں رکھتی بلکہ زندگی کا چلن ایسا ہو کہ کسی کو میری ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔ (انجلینا جولی)

☆ ہو سکتا ہے کہ آپ کی زندگی آسائشوں سے عاری ہو، ہو سکتا ہے آپ دنیا بھر کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہوں لیکن کبھی اپنی خودی کو فراموش نہ کریں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ حوصلے کی پختگی اور امید نے ہمیشہ اپنا راستہ خود ہموار کیا ہے۔ (مشال اوباما)

(انتخاب: مدثرہ خلیل، دینہ، ضلع جہلم)

بھارتی وزیراعظم کی پاکستان آمد پر احتجاج کے دوران جماعت اسلامی کے کارکنوں پر جو زبردست آنسو گیس کی شیلنگ کی گئی، اس میں قاضی حسین احمد مرحوم کو بچاتے اور اپنی عمر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے بہت سے شیل اپنے جسم پر کھائے۔

اسی شیلنگ سے ان کے سینے اور پھیپھڑوں کو بہت نقصان پہنچا۔ موت ہر وقت ان کے سر پر منڈلاتی رہتی تھی لیکن وہ اس سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ وہ جمعیت کے کارکنوں کے لیے ایک ہمدرد اور نڈر سچے انسان تھے۔ اپنے دشمن کو زیر کرنا انھیں خوب آتا تھا۔ حکومت مخالف جلسوں میں پکڑے جانے والے جمعیت کے کارکنوں کو جیلوں سے رہا کروانے کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی کا اجتماع عام بھاٹی گیٹ میں منعقد ہوا۔ اچانک وہاں غنڈوں نے حملہ کر دیا۔

ایک گولی لگنے سے جماعت اسلامی کے کارکن اللہ بخش شہید ہو گئے۔ ابا جان نے اسی وقت قاتل کو اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیا۔ اسے اس وقت چھوڑا جب انھیں تسلی ہو گئی کہ وہ اب قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔

جماعت اسلامی کا فعال رکن ہونے کے باوجود انھوں نے گھر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ صبح بڑی امی (شفیقہ خانم مرحومہ، میرے والد کی پہلی بیگم) کے ساتھ ناشتا کرتے ہوئے میں دونوں کے مزاح سے خوب لطف اندوز ہوتی۔ امی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میری اپنی والدہ زیادہ تر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتیں اور امی گھریلو کام کاج کرتیں۔ دونوں کی طبیعتوں میں بہت یکسانیت تھی۔ دونوں نہایت سادہ اور صابر و شاکر خواتین تھیں۔ ان میں دنیاوی لالچ بالکل نہ تھا۔

ابا جان خود سب بچوں کو اپنے ہاتھ سے دودھ کے پیالے پکڑاتے۔ بازار سے سب بچوں کے لیے کپڑوں کے تھان لاتے اور سلنے دیتے۔ بڑی بہنیں جوں جوں زندگی کے مراحل طے کرتی گئیں، انھوں نے امی کے ساتھ گھر کا پورا انتظام سنبھال لیا۔ ابا جان دونوں بیگمات اور ہم سب بہن بھائیوں کی ضروریات سے واقف تھے۔ اس لیے جب بھی رقم آتی، وہ گھریلو اشیا کے ساتھ ساتھ بہنوں کے جہیز کا سامان بھی آہستہ آہستہ لا کر رکھتے جاتے۔

وہ ہمیشہ دو دو چیزیں لاتے۔ جیسے ہی بہنیں آخری نویں جماعتوں میں پہنچتیں، وہ برقع کے لیے سیاہ کپڑا لے آتے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان کو سلا کر پہنو۔ وہ میری آپا کے نہ صرف شوہر تھے بلکہ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ یہ عورت اپنے ماں باپ، گھر بار اور وطن چھوڑ کر یہاں آئی ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے آپ کا حق ادا کرنے کی حد درجہ کوشش کی۔

میں گواہی دیتی ہوں کہ وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ ان دو برسوں میں جبکہ وہ بستر علالت پر تھے، مایوسی نامی کوئی چیز ان کے نزدیک نہ پھٹکتی۔ انھیں میں نے یہ کہتے سنا "مریم! شاید اللہ تعالیٰ مجھے تیری ماں کے مرتبے تک پہنچانا چاہتا ہے۔" اللہ پاک کی رحمت کے بہت قریب تھے اور ہم سب کے لیے صبر و ہمت کا نمونہ۔

ہمارا گھر ہمیشہ محبت اور امن و سکون کا گہوارہ رہا۔ وہ گھر جہاں صرف برکت ملتی تھی۔ برکت کے مفہوم پر یہ گھر اترتا پورا اترتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ گھر میں خوشی، دلوں میں محبت، رشتوں میں اتفاق اور اللہ تعالیٰ کی رضا زندگیوں میں شامل ہو۔ اور جہاں خواہ مخواہ کسی کا خوف و ڈر طاری نہ رہے۔ دونوں ماؤں اور ابا جان نے مل کر اس کی تکمیل کی۔ یہ یقیناً اس گھر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص تھی۔ جب یہی کہ دوسری شادی کرتے وقت والد صاحب کی نیت صاف تھی۔ جتنا میں اپنی بڑی امی سے پیار کرتی تھی، اس سے دو قدم بڑھ کر میری ساری دوسری بہنیں اور بھائی میری والدہ کی خدمت کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے۔



ابا جان اپنی بہنوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی کوئی بہن آتی، ان کی خوشی دیدنی ہوتی۔ میں یہ خوشی دیکھتے ہوئے اپنی پھوپھیوں کی خوب خاطر تواضع کرتی اور وہ دیر تک باتیں کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنے گھر روانہ ہوتیں۔

والدین نے نماز و قرآن پڑھنے کے علاوہ ہمیں بہت کم نصیحت کی۔ ان کی زندگیاں ہم بچوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ وہ صبر و شکر کا اعلیٰ نمونہ تھیں کہ جنھیں تا زندگی دیکھتے رہنے کی سے ہم سب بہن بھائی اپنے گھروں کو بھی محبت کا گہوارہ بنا سکتے

ہیں۔ میں نے اپنے والدین کے قریب رہتے ہوئے بہت کچھ سیکھا۔ یہ وہ قیمتی جواہرات ہیں جو ان شا اللہ نہ صرف میرے کام آئیں گے بلکہ میری نسل بھی مجھ سے بہت کچھ سیکھے گی۔ (ان شا اللہ)

نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق باپ اپنی اولاد کو جو بہترین تحفہ دے وہ حسن اخلاق ہے۔ ابا جان نے ہر لحاظ سے ہماری تربیت کرنے کی سعی کی۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ انھیں نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں سے بہت محبت تھی اور وہ سب بھی ابا جان کی قربت کو بہت پسند کرتے۔ اللہ پاک نے انھیں پڑپوتا پڑدادا بننا نصیب فرمایا۔ ابا جان چاہتے تھے کہ یہ رشتے ایک دوسرے سے مضبوط ہوں، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ بچے آپس میں رشتے کریں۔ یہ خوشیاں بھی انھوں نے اپنی زندگی میں دیکھیں۔

میری بڑی امی کی بیٹی ام ماہم نے اپنے بیٹے کا حلیمہ سعدیہ کی بڑی بیٹی سے نکاح کیا۔ ان شا اللہ دو بچے ہیں۔ اس خانم نے اپنی پوتی کا نام بھی مریم رکھا۔ ابا جان اسے پیار سے چھوٹی مریم جمیلہ کہتے تھے۔ بڑی امی کی دوسری بیٹی میمونہ خانم نے حمیرہ سعدیہ کی دوسری بیٹی کا اپنے بیٹے سے نکاح کیا۔ ان شا اللہ مستقبل میں یہ رشتے اور مضبوط ہوں گے۔

ابا جان کہتے تھے "موت برحق ہے، تم میرے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہنا" یقین یادوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ والدین کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے کہ جس کی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے ہی میں پل صراط کا راستہ طے کر پاؤں گی۔ (ان شا اللہ)

نبی کریم ﷺ کا قول ہے: "ماں باپ کی خدمت دنیا میں باعث دولت اور آخرت میں باعث نجات ہے۔"

ابا جان بھی اپنے والدین سے حسن سلوک کی بدولت خود بھی اس سلوک کے مستحق ٹھہرے۔ نہ صرف ساری اولاد بلکہ ہمارے بچے بھی ابا جان کی خدمت کے لیے تیار رہتے اور

> رویت ہلال کے ثبوت کے لیے ایک مسلمان کی شہادت کافی سمجھی گئی، وہ عادل ہو یا مستور الحال۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں صورتوں میں عمل فرمایا۔ ایک اعرابی نے آ کر کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے (صرف یہ) پوچھا، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں؟ اس نے کہا، ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا، ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے بلال! لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ نے گواہی دی کہ انھوں نے چاند دیکھا ہے، تو آپ ﷺ نے روزہ رکھ لیا۔ ملت کے سارے معاملات کے بارے میں یہی حکم ہے کہ غیر ضروری تحقیق تفتیش سے اجتناب کیا جائے۔
>
> (حجۃ اللہ البالغہ۔ از شاہ ولی اللہؒ)

انھیں وقت دیتے۔ نبی کریم ﷺ کا قول ان پر بالکل سچ ثابت ہوا۔ انھیں اللہ پاک نے تندرستی والی طویل زندگی کی دولت نصیب فرمائی جس میں انھیں بھرپور نیکیاں سمیٹنے کا موقع ملا۔ انھیں ایمان، خوشحالی، فرمانبردار اور نیک اولاد اور اطمینان و سکون کی دولت نصیب ہوئی اور ان شا اللہ آخرت میں اللہ کے ہاں بلند درجے سے ہمکنار ہوں گے۔

والد پر یہ تحریر ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ان کی زندگی کے ۹۰ سال چند کاغذوں میں سمیٹے نہیں جا سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ میری یہ کاوش کسی کو پسند آئے اور وہ بھی دنیا ہی کی کوشش کرے۔ آخر میں قرآن کی زبان میں اپنے رب کے حضور نہایت عاجزی کے ساتھ دعا گو ہوں:

"اے میرے رب! ان پر رحم فرما جنھوں نے میری بچپن میں تکالیف اٹھا کر مجھے پالا۔" (آمین)



بھارتی حکومت و میڈیا کو بے عزتی کا سامنا

نیپال میں پاکستان کی دھوم

پاکستانیوں نے مثالی جذبہ خدمت انسانیت دکھا کر نیپالی عوام کے دل جیت لیے

یہ ۲۵ اپریل ۲۰۱۵ء کی خوشگوار صبح تھی۔ نیپال کے دارالحکومت، کھٹمنڈو میں سورج نکلتے ہی چہل پہل شروع ہو گئی۔ بچوں نے اسکولوں کا رخ کیا، تو والدین دفاتر کی سمت رواں دواں ہوئے۔ دوپہر تک زندگی معمول کے مطابق اپنی ڈگر پہ چل رہی تھی کہ اچانک نیپال لرز گیا۔

ہوا یہ کہ وسطی نیپال میں زمین کے ۱۰ کلومیٹر نیچے ہندوستانی اور یوریشیائی پلیٹیں آپس میں رگڑ کھا گئیں۔ اس ٹکراؤ سے ۷.۸ ریکٹر سکیل شدت کا زلزلہ پیدا ہوا۔ اس زلزلے نے نیپال میں دور دور تک تباہی پھیلا دی۔ جس علاقے میں زلزلے نے قدم رکھا، وہاں قدرتاً جانی و مالی تباہی زیادہ ہوئی۔

۱۹۳۴ء کے بعد نیپال میں آنے والا سب سے زوردار زلزلہ ۸۲۵۹ انسانوں کی جانیں لے گیا۔ انیس ہزار زخمی جبکہ ہزاروں بے گھر ہوئے۔ کئی ہزار گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اربوں روپے کا نقصان ہوا۔

نیپال ایک ترقی پذیر اور غریب ملک ہے۔ اسی لیے وہاں

کی حکومت تنہا اس اچانک قدرتی آفت سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی۔ چناں چہ پڑوسی ممالک بھارت، چین اور پاکستان فوراً مدد کو پہنچے۔

نیپال اور بھارت کے قریبی تعلقات ہیں۔ پھر نیپال کی ۸۳ فیصد آبادی ہندو ہے۔ اسی لیے بھارت حکومت نے وسیع پیمانے پر امدادی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہوائی جہاز ڈاکٹر، سامان خورونوش، ادویہ اور مشینری لیے نیپال پہنچنے لگے۔ چین اور پاکستان نے بھی بڑھ چڑھ کر امدادی کارروائیوں میں حصہ لیا۔

پاکستان نے سب سے پہلے ریسکیو ٹیمیں اور ڈاکٹر متاثرہ نیپالی علاقے میں بھجوائے۔ پاکستانی امدادی ٹیموں نے ملبے میں پھنسے کئی نیپالیوں کی جانیں بچائیں اور ان سے دعائیں لیں۔ جبکہ پاکستانی ڈاکٹروں نے فیلڈ اسپتال قائم کیے اور زخمیوں کا علاج کرنے لگے۔

حکومت پاکستان تا دم تحریر کئی پروازوں کے ذریعے تیار شدہ کھانے کے ہزار ہا پیکٹ، چار ہزار سے زائد خیمے، ایک ہزار کمبل، ۱۲۰ ٹن ادویہ اور ۲۰ ٹن چاول و آٹا بھجوا چکی۔ نیپالی حکومت کا کہنا ہے کہ زلزلے نے ایک لاکھ افراد کو بے گھر کر ڈالا۔ تب پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ ۲۵ فیصد بے گھر نیپالیوں کو خیمے و متعلقہ سامان فراہم کرے گا۔

بھارتی میڈیا کی بے حسی

اس میں کوئی شک نہیں کہ امدادی کارروائیاں شروع کرنے میں بھارت بازی لے گیا۔ صرف چھے گھنٹے بعد بھارتی ہوائی جہاز ریسکیو ٹیمیں، ڈاکٹر اور سامان لیے پہنچنے لگے۔ اگلے دن وزیراعظم نریندر مودی نے کابینہ کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی تاکہ امدادی کارروائیاں تیز کی جا سکیں۔ اس زبردست امداد کو نیپالی عوام نے ستائشی نظروں سے دیکھا اور بھارت کو اپنا سب سے قریبی دوست قرار دیا۔

لیکن رفتہ رفتہ بھارتی میڈیا کے طرز عمل سے نیپالیوں پر حقیقت واضح ہونے لگی..... وہ یہ کہ بھارتی حکومت نے صرف اس لیے وسیع پیمانے پر نیپال میں امدادی کارروائیاں شروع کیں تاکہ چین اور پاکستان کو نیچا دکھایا جا سکے۔ مدعا یہ تھا کہ نیپالی حکومت و عوام بھارت ہی کی مدح وستائش کریں۔ وہ یہی سوچیں کہ صرف بھارتی ہی ان کے سچے ساتھی ہیں۔

دوست بنانے کے لیے کوشش کرنا کوئی بری بات نہیں، لیکن نیپال کے سلسلے میں بھارتی برہمن، حکمران طبقہ بدنیتی رکھتا ہے۔ وہ نیپالیوں کو دوست نہیں بلکہ کمتر سمجھتا ہے۔ وجہ یہی کہ بھارت کہیں زیادہ طاقتور ملک ہے۔ لیکن طاقت نے بھارتیوں کو منکسر المزاج نہیں مغرور اور انا پسند بنا ڈالا۔ چناں چہ بھارتی حکومت نیپالیوں کی مدد کرتے ہوئے ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتی ہے جیسے وہ بھکاری و تنگ دست ہوں۔ یہ تجربہ حالیہ امدادی کارروائیوں کے دوران بھی سامنے آیا۔

جیسے ہی نیپال میں امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں، بیسیوں بھارتی چینلوں کے سیکڑوں رپورٹروں نے آفت زدہ علاقوں پر بھی دھاوا بول دیا۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں بھارتی کارروائیوں کی رپورٹنگ کرنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے نیپالی بہت قابل رحم اور مسکین ہیں اور بھارتی ان غریبوں کی مدد کر کے عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ حقیقتاً بھارتی رپورٹروں نے کمال بے حسی کا ثبوت دیا۔

ایک رپورٹر نے زخمی نیپالی کو پکڑا اور کیمرے کے سامنے اس کی پریڈ کرانے لگا۔ اس زخمی کے بدن سے خون بہہ رہا تھا مگر بھارتی میڈیا ٹیم کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ پٹی باندھ کر اسے روک دیتے۔ اس قسم کا خوفناک اور غیر انسانی رویہ تبھی وقت سامنے آتا ہے جب رپورٹروں پر اپنے ٹی وی چینل کی ریٹنگ بڑھانے کا بھوت سوار ہو جائے۔

ایک رپورٹر نے تو بے حسی کی حد کر دی۔ ایک خاتون کا بیٹا

ملبے تلے دب گیا تھا اور وہ دہائی دیتے ہوئے ریسکیو ٹیم کو بلا رہی تھی۔ بے حس رپورٹر اس کے پاس جا کر کہنے لگا: "اماں! تم کیا محسوس کر رہی ہو؟"

تیسرے بھارتی ٹی وی چینل کا رپورٹر امدادی کارروائیوں میں مصروف ٹیموں کے پیچھے پڑا رہا۔ وہ ان سے پوچھتا رہتا کہ امدادی سرگرمیوں میں کس قسم کی مشینری اور ٹیکنالوجی استعمال ہو رہی ہے؟ وہ بار بار ان کے کام میں رکاوٹ بنتا۔

چوتھا بھارتی رپورٹر زلزلے سے تباہ حال گاؤں میں جا پہنچا۔ یہاں ہسٹریائی انداز میں متاثرین سے پوچھتا پھرا "آپ کی حکومت آپ لوگوں کے لیے کیا کر رہی ہے؟"

بھارتی میڈیا کی سرتوڑ کوشش یہی رہی کہ وہ اپنی امدادی ٹیموں کی کارروائیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھائے۔ حالانکہ نیپالی فوج، پولیس اور سرکاری افسر بھی ہم وطنوں کی جانیں بچانے اور مدد دینے کے لیے بھرپور کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن بھارتی چینلوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

بھارتی میڈیا کے جارحانہ پن اور یک رخی پالیسی نے قدرتاً نیپالی عوام کو ناراض اور بھارتیوں سے برگشتہ کر دیا۔ حتیٰ کہ صرف دو دن بعد ٹویٹر میں ہیش ٹیگ #Go Home Indian Media مقبول ہونے لگا۔ اس ہیش ٹیگ کے ذریعے ہزارہا نیپالی بھارتی رپورٹروں سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ ان کا ملک چھوڑ دیں۔

راجیش جوشی نیپالی شہر بھکت پور میں کونسلر ہے۔ اس نے نیپالی اخبارات میں ایک خط شائع کرایا جس میں لکھا: اگر بھارتی ہماری مدد کر رہے ہیں، تو انہیں اتنا زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

شاردا کھتری بھکت پور کے اکلوتے ایف ایم ریڈیو کا سربراہ ہے۔ اس نے بھی راجیش جوشی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے نیپالی ٹی وی کے ایک پروگرام میں کہا "ہم غریب لوگ ہیں، مگر عزت و آن کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ بھارتی سب سے پہلے ہماری مدد کو پہنچے۔ لیکن انھوں نے اپنی امدادی سرگرمیوں کو خوب نمایاں کر کے پیش کیا، حالانکہ وہ نہایت وسیع پیمانے پر انجام نہیں پائیں۔"



فیلڈ ہسپتال میں ایک نیپالی بچے کی پیدائش جس کا نام "پاکستان" رکھا گیا

نیپال کی مشہور بلاگر، سنیتا شاکایا (Sunita Shakya) نے اپنے بلاگ میں لکھا: "بھارتی میڈیا اور اس کے رپورٹر نیپال آ کر ایسا رویہ دکھانے لگے جیسے وہ کسی ڈرامے یا فلم کی عکس بندی کرنے آئے ہیں۔ یہ رپورٹر ایسی جگہوں پر بھی جا پہنچے جہاں ریسکیو ٹیمیں نہیں پہنچی تھیں۔ لیکن وہ مصیبت و تکلیف میں مبتلا نیپالیوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے ان سے انٹرویو کرنے لگے۔ یہ کس قسم کا مذاق ہے؟"

غرض بھارت نے امدادی سرگرمیوں کا آغاز کیا، تو نیپالیوں نے خیر مقدم کیا۔ مگر اپنے میڈیا کی بے حسی اور جارحانہ مزاجی نے بھارتی حکومت کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ حتیٰ کہ کانگریسی راہنما اور سابق وفاقی وزیر، ششی تھرور نے ٹویٹ کیا: "ہمارا میڈیا مسلسل بھارت کو پریشان اور بدنام کر رہا ہے۔"

بھارتی آقا بن بیٹھے

بھارتی حکومت نے بھی نیپال میں اپنی شہرت داغدار کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بھارتی میڈیا یہ پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہا کہ بھارتی امدادی ٹیمیں وسیع پیمانے پر مصیبت زدہ نیپالیوں کو سہارا دے رہی ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ بھارتی ریسکیو ٹیمیں عموماً اپنے ہم وطنوں ہی کی مدد کرتی رہیں۔

کھٹمنڈو ہوائی اڈے پر وطن واپس جانے کے لیے بھارتیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ چناں چہ بھارتی ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر ہوائی اڈے پر اترنے اور پرواز کرنے لگے۔ جلد ہی ایک طرح سے انھوں نے ہوائی اڈے پر قبضہ کرلیا۔

نیپالی اخبارات نے یہ خبر نمایاں انداز میں شائع کی کہ تین بھارتی ہیلی کاپٹروں نے زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں ۱۱۱۸ افراد کو بچایا۔ جبکہ اسی عرصے میں چار نیپالی ہیلی کاپٹر ۲۵۶ متاثرین کو بچانے میں کامیاب رہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بھارتی ہیلی کاپٹر صرف اپنے ہم وطنوں ہی کو تلاش کرتے رہے۔ یہ ایک قسم کی مجرمانہ سیاست ہی ہے۔

پاکستان کو بدنام کرنے کی سعی

مزید برآں روز اول سے مودی حکومت کی کوشش رہی کہ چین خصوصاً پاکستان کی ریسکیو ٹیمیں نیپال میں زیادہ سرگرم نہ ہونے پائیں۔ حتیٰ کہ بھارتی حکومت نے نیپالی حکومت کو تجویز دی: ”آپ پاکستان سے امداد نہ لیں، ہم آپ کو ہر قسم کی مدد دیں گے۔“ تاہم نیپالی حکومت نے یہ بھارتی تجویز نہ مانی اور پاکستانیوں کو نیپال آنے کی اجازت دے ڈالی۔

بھارتی میڈیا پھر شکاری کتوں کی طرح ایسا کوئی ثبوت ڈھونڈتا رہا جس کے ذریعے پاکستان کو بدنام کرسکے۔ آخر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ غلطی سے تیار شدہ کھانوں میں ایسے پیکٹ بھی پاکستان سے نیپال چلے گئے جن میں ”بیف مسالا“ بھی شامل تھا۔

نیپال ایک نظر میں

جنوبی ایشیا میں شائع نیپال پر طویل عرصہ بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ چناں چہ جب حکمرانوں نے ہندومت قبول کیا، تو رعایا نے بھی ان کی پیروی کی۔ آج ۸۳ فیصد نیپالی ہندو، ۹ فیصد بدھ مت کے پیروکار، ۴ء۴ فیصد مسلمان اور ۴ء۱ فیصد عیسائی ہیں۔

بیسویں صدی کے آخر میں نیپالی کمیونسٹ حکومت سے نبرد آزما ہوگئے۔ وہ بادشاہت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ۲۰۰۸ء میں ان کی جدوجہد رنگ لائی اور نیپال وفاقی جمہوری ملک بن گیا۔ اب وہاں وزیراعظم حکومت جبکہ صدر مملکت کے حاکم ہیں۔ طاقت کا توازن وزیراعظم کی طرف جھکا ہوا ہے۔

نیپال کا شمار غریب ممالک میں ہوتا ہے۔ بیشتر ترقی پذیر ممالک کی طرح وہاں بیشتر وسائل پر حکمران طبقے کا قبضہ ہے۔ امرا اور بااثر نیپالیوں کو ہر طرح کی آسائشیں میسر ہیں، دوسری طرف عام نیپالی کی فی کس سالانہ آمدن قریباً ڈھائی ہزار ڈالر ہے۔ بہرحال نئے حکمران معاشی حالات سدھارنے میں کوشاں ہیں۔ ان کا اصل مقابلہ بیروزگاری اور بے روزگاری سے ہے۔ مملکت کا رقبہ ایک لاکھ سینتالیس ہزار ایک سو اکیاسی مربع کلومیٹر ہے۔ ملک میں تین کروڑ سے زائد لوگ بستے ہیں۔ ان میں سے ۸۲ فیصد دیہات میں آباد ہیں۔ نیپال کا زیادہ تر رقبہ پہاڑی ہے۔

بس پھر کیا تھا، بھارتی میڈیا نے شور مچایا کہ پاکستانیوں نے بیف مسالا بھجوا کر نیپالی ہندوؤں کا دھرم ”بھرشٹ“ (تباہ) کر دیا۔ پاکستان دشمن بھارتی میڈیا نے یہ پہلو مدنظر نہیں رکھا کہ آفت و مصیبت کے وقت تیزی سے کام کیے جاتے ہیں تاکہ متاثرین کی جلد از جلد مدد کی جائے اور انھیں بچایا جا سکے۔ اسی جلد بازی میں بعض اوقات غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر زلزلہ ۲۰۰۵ء میں پاکستان کو بین الاقوامی برادری کی جانب سے کھانے کے لیے ایسے پیکٹ ملے جس میں بعض حرام اشیا کے اجزا شامل تھے۔ مگر پاکستان نے اس پر پیکٹ بھجوانے والے ممالک کے خلاف واویلا نہیں مچایا کیونکہ حکومت جانتی تھی، جلد بازی میں انسان غلطی کر بیٹھتا ہے۔

مزید برآں نیپال میں صرف ہندو نہیں بستے، وہاں تیرہ چودہ لاکھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ اور زلزلے نے سیکڑوں مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ بیف مسالے کے پیکٹ انھیں دیے جا سکتے تھے۔ مگر بھارتی میڈیا نے اس معاملے کو وہ رنگ دیا جیسے پاکستان نے دانستہ بیف مسالے والا کھانا نیپال بھجوایا۔

کہاوت ہے کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود اسی میں گرتا ہے۔ نیپال میں بھارتی حکومت نے پاکستانیوں کے لیے جو گڑھا کھودا، وہ خود اسی میں جا گری۔ حتیٰ کہ بھارتیوں نے فوری طور پر امدادی ٹیمیں بھجوا کر نیپال میں جو نیک شہرت کمائی تھی، وہ بھی ان کے جارحانہ پروپیگنڈے کی وجہ سے ملیامیٹ ہو گئی۔

نیپالی عوام کو ایک اور وجہ سے بھی ہر جگہ دندناتے بھارتی میڈیا والے پسند نہیں آئے۔ وجہ یہی کہ وہ چوبیس گھنٹے بھارتی ریسکیو ٹیموں ہی کا چرچا کرتے رہے۔ جبکہ نیپالی فوج و انتظامیہ کی سرگرمیوں کو بالکل نمایاں نہیں کیا گیا۔

جنرل رانا کا خراج تحسین

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ چناں چہ ۳ مئی کو نیپالی فوج کے سربراہ، جنرل شمشیر رانا نے پاکستانی فیلڈ اسپتال کا دورہ کیا۔ انھیں بتایا گیا، پاکستانی فوجی افسر، جوان اور ریسکیو ٹیموں کے ارکان شبانہ روز بے یارو مددگار نیپالیوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ جنرل رانا نے پاکستانیوں کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ نیپالی عوام ان کی قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

فیلڈ اسپتال میں دو نیپالی خواتین کے بچے بھی تولد ہوئے۔ مسرور ماؤں نے ان کے نام "پاکستان" رکھے اور یوں اپنے مددگار پاکستانیوں سے محبت و الفت کا ثبوت دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیپال میں سرگرم عمل پاکستانیوں نے زبردست ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اور اپنی محنت سے بھی نیپالیوں کو متاثر کیا۔ نیپال میں پاکستانی حقیقتاً اس قول پر پورے اترے:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو ہاتھ دیے ہیں..... ایک ہاتھ سے اپنی مدد کیجیے اور دوسرے سے دوسروں کی۔"

نیپال میں آر ایس ایس اور دیگر ہندو انتہا پسند تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں۔ ان کی سعی ہے کہ نیپال میں انتہا پسندی کو رواج دیا جائے۔ لیکن پاکستانیوں کے جذبہ خدمت نے نیپال میں رواداری، خیر اور نیکی کے جذبات فروغ دے کر انتہا پسند ہندوؤں کے عزائم خاک میں ملا دیے۔

◆◆◆

ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی کم ہوگئی

نیپال میں آنے والے زلزلے کی وجہ سے دنیا کا بلند ترین پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ قریباً ایک انچ چھوٹا ہوگیا۔ وجہ یہ کہ یہ پہاڑ جس جگہ واقع ہے وہ زلزلے کی وجہ سے نیچے دھنس گئی۔ جبکہ اس کے بالمقابل واقع علاقے کئی فٹ بلند ہوگئے۔

۲۵ اپریل کی سہ پہر ماؤنٹ ایورسٹ پر کوہ پیماؤں کا ہجوم تھا۔ موسم بہتر ہونے کے بعد وہ سب بڑے جوش و جذبے سے کوہ پیمائی کرنے پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن جیسے ہی زوردار زلزلہ آیا، ماؤنٹ ایورسٹ کی برف تڑخ گئی۔ چناں چہ پہاڑ پر زبردست برفانی طوفان یا برفشار (Avalanche) نے جنم لیا۔ اس برفشار کی زد میں آ کر ۱۹ کوہ پیما اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گویا یہ ماؤنٹ ایورسٹ پر جنم لینے والا سب سے زیادہ تباہ کن برفشار ثابت ہوا۔


Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
خوشبو کی دنیا کے شگفتہ احساس
Medora
Perfumed Talc
Pleasure
Cherish
Joy
Season
Passion
8 مختلف دلفریب خوشبوؤں میں دستیاب ہے
MEDORA OF LONDON

پاکستانی ہیلی کاپٹروں کا تاریخی کارنامہ

پاک فوج کے جوانوں نے جب ایک دلیرانہ قدم اٹھا کر دشمن کو عبرت ناک شکست دی

بریگیڈیئر (ر) سید لیاقت بخاری ستارۂ جرأت



یہ ۱۸ر جون ۱۹۷۱ء کی صبح تھی جب تقریباً دس بجے ہم جنرل رحیم خان، جنرل آفیسر کمانڈنگ (G.O.C) ۱۴ انفنٹری ڈویژن کے ساتھ فینی (FENI) ہیلی پیڈ پر اترے۔ فینی مشرقی پاکستان کے جنوب مشرق میں واقع تزویراتی لحاظ سے ایک اہم علاقہ ہے۔ اس کی سرحدیں بھارتی ضلع تری پورہ سے لگتی ہیں۔

علاقہ فینی میں بھارتی فوج نے پیش قدمی کر کے بیونیا تائی جنن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس جگہ تعینات اور دشمن سے نبرد آزما بریگیڈ کمانڈر نے ہمیں جنگی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ صبح جب ان کی دو انفنٹری بٹالین، ایف ایف ۲۴ اور ۲۰ بلوچ نے بیلونیا کو جو تقریباً ۴ میل چوڑا اور ۱۰ میل لمبا پہاڑیوں میں گھرا ہوا علاقہ ہے، آزاد کرانے کے لیے پیش قدمی کی، تو وہ دشمن کی بارودی سرنگوں اور توپ خانے کی زد میں آ گئیں۔

اس علاقے میں تمام پہاڑیوں اور بلند مقامات پر بھارتی فوج نے مضبوط مورچے بنا رکھے تھے۔ ان کی دفاعی منصوبہ بندی کے مطابق پاک فوج کو چاروں طرف سے گھیرنے کے لیے وہ نہایت موزوں جگہ تھی۔

جونہی دونوں پاکستانی بٹالینیں کھلے میدان میں پہنچیں، تو آس پاس کی پہاڑیوں میں چھپے بھارتی فوجیوں نے انھیں گھیرے میں لیا اور اندھادھند فائرنگ شروع کر دی۔ یوں بٹالینیں دشمن کے جال میں بری طرح پھنس گئیں۔ صرف دو گھنٹے میں ہمارے تقریباً ۲۸ جوان شہید اور شدید زخمی ہو گئے۔

ان حالات میں پیش قدمی جاری رکھنا بہت مشکل ہو گیا۔

بریگیڈ کمانڈر کے پاس ان کی مدد کے لیے کوئی اضافی

کمک تھی اور نہ ہی بھارتی توپ خانے کو خاموش کرانے کا کوئی ذریعہ۔ بیونیا کیونکہ پاک بھارت سرحد پر واقع تھا، وہاں پاک فضائیہ بھی مدد کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

کٹھن حالات مدنظر رکھتے ہوئے جنرل رحیم خان نے فیصلہ کیا کہ پاک فوج کی پیش قدمی جاری رکھنے کا واحد طریقہ کمانڈو ایکشن ہے۔ مگر اس کارروائی کے لیے باقاعدہ کمانڈو فورس اور زیادہ تعداد میں ہیلی کاپٹر درکار تھے۔ نیز پاک فضائیہ کی مدد بھی اشد ضروری تھی۔

لیکن بیونیا ہیلی پیڈ پر صرف ایک ہی ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ جبکہ کمانڈو یونٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ علاوہ ازیں ۳۰ کے قریب شدید زخمی فوجی بھی فوری طبی امداد کے منتظر تھے۔ اس نازک صورت حال میں دوسرے ہیلی کاپٹر کو میجر علی قلی خان اور میجر پیٹرک کی قیادت میں ڈھاکہ سے بیونیا (FFN) طلب کر لیا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ زخمیوں کو ڈھاکہ کے فوجی اسپتال پہنچایا جائے۔

دریں اثنا بریگیڈ کمانڈر نے مجھے چھاگا نگ کی پہاڑیوں، محل چری اور رنگامتی کے علاقوں میں تعینات زیادہ سے زیادہ کمانڈو لانے کا حکم دیا۔ وہ سب نہایت حساس مورچوں پر متعین تھے جنھیں کسی حالت خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اسی لیے ان کی جگہ مورچوں پر متعلقہ قبیلے کے با اعتماد افراد ٹھہرانے کا حکم ملا۔

چھاگا نگ کی پہاڑیاں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں ہیلی کاپٹر اتر سکے۔ مگر ہم نے کمک لینے کا کام ہر صورت شام سے پہلے مکمل کرنا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی میجر علی جواہری مدد سے صبح تا شام مختلف چوکیوں پر جا کر تقریباً ۲۰ کمانڈوز اکٹھے کر لیے۔

جب ہم آخری مشن مکمل کر کے ہیلی پیڈ فینی پہنچے، تو مجھے جی او سی کا پیغام ملا کہ فوراً بریفنگ لینے آپریشن روم آ جاؤ۔ کمرے میں جنرل رحیم، بریگیڈ کمانڈر کرنل لطیف اعوان، ۴۰ ایف ایف بٹالین سوار کے کمانڈر کرنل شبیر جان، کمانڈو

نئے زمانے میں پرانی باتیں

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تیری قوم کو بچائے!
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو، یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں!

(علامہ محمد اقبالؒ)

بٹالین کمانڈر پہلے ہی موجود تھے۔ جونہی میں آپریشن روم میں داخل ہوا، جنرل رحیم خان نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "ہم نے آپ کے لیے ایک خاص ہیلی بورن آپریشن کا منصوبہ بنایا ہے۔ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟"

میں نے تربیت کے مطابق بغیر کسی جھجک یا سوال کے اثبات میں "جی سر" کہتے ہوئے سر ہلا دیا۔

جنرل رحیم نے نقشہ دکھاتے ہوئے حکم دیا کہ مجھے رات کی تاریکی میں اپنے صرف دو ہی کاپٹروں کی مدد سے بھارتی مورچوں کے درمیان اور پیچھے کمانڈو ایسی اتارنے ہیں۔ انہی مورچوں میں بیٹھے دشمن نے ہماری پیش قدمی روک رکھی تھی۔ یہ کمانڈو پھر ۲۲ ایف ایف بٹالین کو دشمن کی زد سے نکالتے ہوئے اسے پیش قدمی جاری رکھنے میں مدد دیتے۔

دشمن کے دستے چونکہ بلند جگہوں پر بیٹھے تھے، لہٰذا ان

میں چھپے توپچیوں کو نشانہ بنانا بہت کٹھن تھا۔ اسی لیے انھوں نے ہمارے پورے بریگیڈ کی پیش قدمی روک دی۔ اب ایک بڑے آپریشن سے ان مورچوں کو تباہ کرنا ہی مسئلے کا حل تھا۔ اس فوجی مہم کے لیے مناسب و مضبوط کمانڈو فورس اور زیادہ ہیلی کاپٹر درکار تھے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس صرف دو ہیلی کاپٹر، ۲۴ کمانڈوز اور مختلف جگہوں سے اکٹھے کیے گئے ۲۴ ناتجربہ کار سپاہی موجود تھے۔

ان سپاہیوں کی قیادت بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کا رابطہ افسر کر رہا تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہم مجوزہ آپریشن کے علاقے سے ناواقف رہے تھے اور نہ ہی ہمیں دشمن کی صحیح طاقت، پوزیشن اور ہتھیاروں کی معلومات دستیاب تھیں۔

یہ تاریخی اور عالمی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا آپریشن ہو رہا تھا جس میں ہیلی کاپٹروں سے رات کی سیاہی میں دشمن کی مضبوط پوزیشن کے عین وسط اترنا تھا۔ منصوبہ یہ تیار ہوا کہ پہلے میں اور میجر جواہر اندھیرا چھاتے ہی ۲۴ کمانڈوز کو لیے پرواز کر جائیں۔ ۱۵ منٹ بعد میجر علی قلی اور میجر پیٹرک نے ۲۴ ناتجربہ کار سپاہیوں کو لیے ہمارے پیچھے پیچھے آنا تھا۔

مشن کی نازک نوعیت اور نہایت قلیل وسائل دیکھتے ہوئے میجر پیٹرک میرے پاس آئے اور کہنے لگے "سر! یہ آپریشن کیسے ہو گا؟ ان محدود وسائل کے ساتھ تو اسے انجام دینا ناممکن ہے۔ ہماری جان بھی جا سکتی ہے۔"

میں نے پیار و تحمل سے تسلی دیتے ہوئے کہا "پیٹ، میں اللہ کا نام لیتا ہوں اور تم خدا اور حضرت عیسیٰ کو یاد کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ ایک ایسا عسکری آپریشن تھا جو شاید ہی دنیا کی کسی فوج نے انجام دیا ہو۔ ویت نام، ایران، عراق، جاپان کی کسی بھی بڑی لڑائی میں اس قسم کی خطرناک مہم کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ آپریشن کی اہمیت سمجھتے ہوئے جنرل ابراہیم خان خود ہیلی پیڈ پر موجود تھے۔

طبقاتی جنگ اور روزہ

روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے، جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کی تلاش کر کے مدد پہنچائی جائے، وہاں سے نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوموں میں ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے۔ جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے ہیں "یہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں؟ انھیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟"

(اخذ و ترتیب: صلاح الدین کاشمیری)

اندھیرا چھاتے ہی میں نے میجر علی جواہر کی مدد سے کیپٹن نادر کے زیر کمان ۲۴ کمانڈوز اپنے ہیلی کاپٹر میں بٹھائے اور فضا میں بلند ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد میجر علی قلی خان اور میجر پیٹرک دوسرے ہیلی کاپٹر میں ۲۴ جوانوں کے ساتھ پرواز کرنے لگے۔ ہمیں صرف ۱۵ منٹ کی پرواز کے بعد ایک انجانی منزل پر مکمل تاریکی میں دشمن کے بیچ اترنا تھا۔

جونہی ہمارے ہیلی کاپٹر دشمن کی پوزیشن پر پہنچے، تو ہر

طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ ہیلی کاپٹر کے آگے پیچھے دائیں بائیں جلتے بجھتے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ دشمن کی طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں کی اندھا دھند فائرنگ نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنا ہیلی کاپٹر اتارنے لگا۔

مشرقی پاکستان کا بیشتر علاقہ اونچے اونچے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ زمین کے زیادہ تر حصے میں پانی اور دلدل ہے۔ وہاں اندھیری رات تو کیا اکثر مقامات پر دن کو بھی لینڈ کرنا ممکن نہیں۔ چناں چہ ہمیں یہی لگا جیسے ہیلی کاپٹر اندھے کنوئیں میں اتر رہے ہیں۔ جونہی ہیلی کاپٹر کے پہیوں نے زمین کو چھوا، کیپٹن نادر اپنی کمانڈو فورس کے ساتھ باہر کود گئے۔

میں نے فوراً پرواز کرکے میجر علی قلی خان کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ مجھے خوف تھا، دوسرے ہیلی کاپٹر کی لینڈنگ کے دوران دونوں گھپ اندھیرے کی وجہ سے آپس میں ٹکرا سکتے ہیں۔

میرے پرواز کرتے ہی میجر علی قلی کا ہیلی کاپٹر بھی اتر گیا۔ مگر اس جہاز میں ناتجربے کار سپاہی نوجوان لیفٹیننٹ کی قیادت میں سوار تھے۔ ان کا آپس میں اس سے پہلے رابطہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ پہلے کبھی ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ کودنے سے ڈر رہے تھے۔ جونہی باہر جھانکتے، نیچے پانی اور دلدل دیکھ کر اترنے سے گریز کرتے۔ میجر علی قلی اور میجر پیٹرک نے تقریباً پندرہ منٹ تک انھیں مختلف جگہ اتارنے کی کوشش کی۔ مگر ہر دفعہ انھوں نے یہ کہہ کر باہر نکلنے سے انکار کر دیا "وہاں پانی ہے۔" انھیں سمجھایا گیا کہ یہ سارا علاقہ ہی پانی سے بھرا ہوا ہے۔ تبھی وہ اترنے پر آمادہ ہوئے۔

خوش قسمتی سے ہمیں اس جھجک نے ایک فائدہ پہنچا دیا۔ وہ یہ کہ دشمن کو غلط فہمی ہوگئی، بہت سارے پاکستانی ہیلی کاپٹر مختلف جگہوں پر کمانڈو اتار رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ خوفزدہ ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اور ہماری خوش نصیبی سے یہ لینڈنگ بھارتی مورچوں کے عین وسط میں ہوئی۔ چناں چہ اگلے مورچوں میں بیٹھے بھارتی فوجی اس خیال میں رہے کہ پچھلی پوزیشنوں پر پاکستانی کمانڈوز نے قبضہ کر لیا ہے۔ پیچھے مورچے والے سمجھتے رہے کہ ان کی اگلی صفوں پر پاکستانی فوج نے حملہ کر دیا۔ چناں چہ وہ رات بھر ایک دوسرے کو دشمن سمجھ کر آپس ہی میں فائرنگ کا تبادلہ کرتے رہے۔

اس طرح انھوں نے اپنی بے وقوفی کے باعث خود کو بہت جانی و مالی نقصان پہنچا دیا جبکہ ہمارے کمانڈوز خاموشی سے بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے۔ اس ہیلی بورن آپریشن کے باعث بھارتی فوج میں اتنی دہشت پھیل گئی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے مورچے اور بھاری ہتھیار چھوڑ کر پسپا ہوگئے۔

اگلی صبح ہماری بٹالین ۲۴ ایف ایف اور ۳۰ بلوچ نے بغیر کسی مقابلے اور رکاوٹ کے پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے پورے بیلونیا علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۴ آرمی ایوی ایشن سکواڈرن کے صرف دو ہیلی کاپٹروں کا یہ ایسا زبردست مشن تھا جس کی مثال بین الاقوامی عسکری تاریخ میں نہیں ملتی۔ سکواڈرن کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والے جوانوں نے پہلی دفعہ ایسا بے مثال اور دلیرانہ آپریشن کیا اور دشمن کے وسط میں اپنے جوان اتار کر اسے شکست دی۔ ◆◆◆

۴ آرمی ایوی ایشن سکواڈرن پاک فوج کا واحد یونٹ ہے جس نے مشرقی پاکستان میں دشمن کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ جب سقوط مشرقی پاکستان کا المناک سانحہ ظہور پذیر ہوا، تو یہ سکواڈرن اپنے سارے ہیلی کاپٹر براستہ برما بحفاظت پاکستان لے آیا تھا۔ اس سکواڈرن نے مشرقی پاکستان میں کرنل لیاقت بخاری (ستارہ جرأت) کی قیادت میں دن رات لاتعداد جنگی معرکوں میں حصہ لیا اور ہر ایک میں بغیر کسی نقصان کے کامیاب اور سرخرو ہوئے۔

ایک شاگرد ناسف سے پکار اٹھا

اب ایسے اساتذہ کہاں...!

بااصول وقت کے پابند اور محنتی استادوں کا جاں فزا قصہ جو دورِ جدید میں نایاب ہو چکے

پروفیسر (ر) عطاالحق سبحانی

آج سے چالیس پچاس سال پہلے اساتذہ کرام اپنے پیشے سے مخلص، مدبر، فکاور رکھتے تھے۔ ہر لمحہ انھیں اپنے شاگردوں کی بہبود مقصود ہوتی۔ جدید دور میں اکثر والدین شاکی ہیں کہ بااصول، وقت کے پابند اور محنتی اساتذہ اب بہت کم نظر آتے ہیں۔

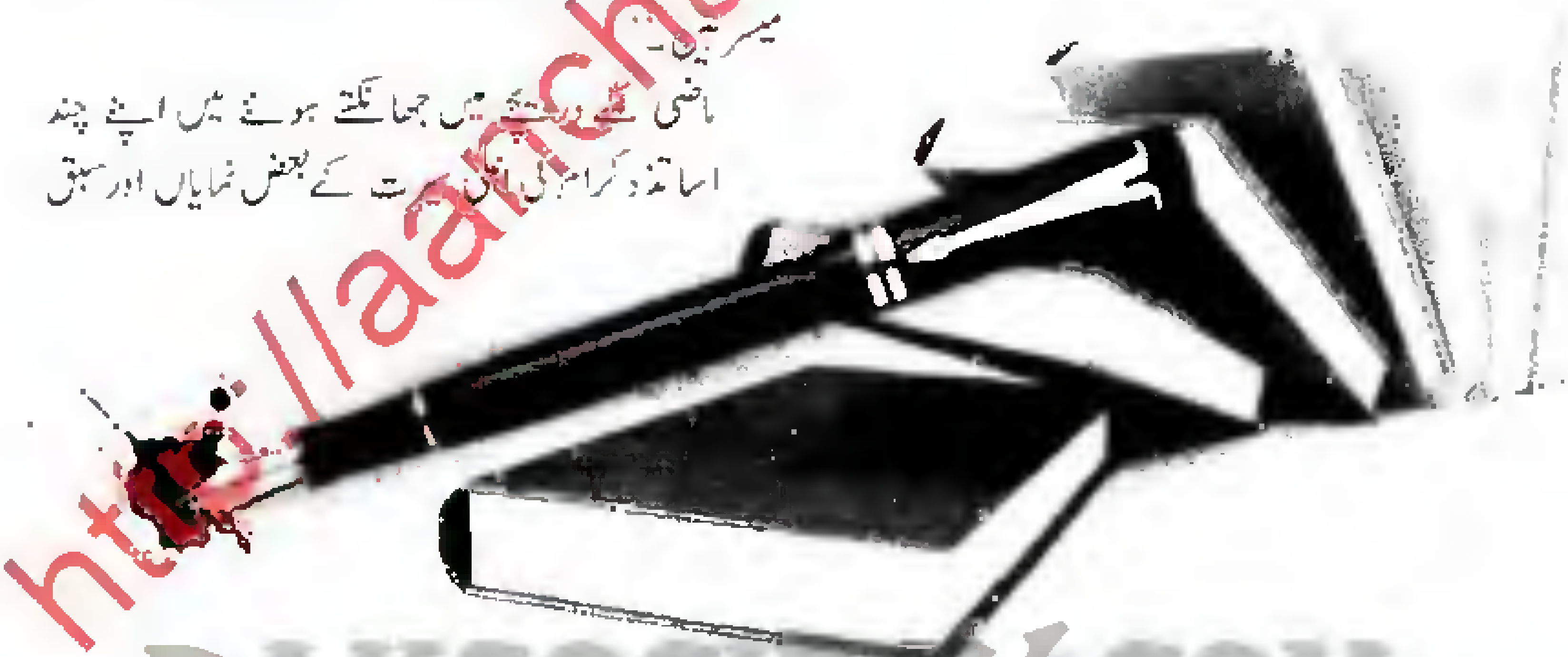
راقم کو اپنے زمانہ طالب علمی میں (پرائمری سے ایم اے تک) یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اساتذہ کرام میں سے کبھی کوئی جماعت میں دیر سے نہیں آیا اور نہ ہی کوئی ایسا لمحہ یاد ہے کہ کبھی کسی استاد محترم نے تندہی سے پڑھانے کے بجائے خوش گپیوں میں وقت گزارا۔

مجھے وہ سنہرا دور رہ رہ کر یاد آتا ہے جب ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی نے مڈل کا ہمارا سالانہ امتحان لینا تھا۔ امتحان سے تقریباً تین ماہ قبل ہماری تمام جماعت کو رات تک اسکول میں رکھا جانے لگا۔ لیمپ کی روشنی میں اساتذہ کرام رات کو بھی تین چار گھنٹے مکمل دلجمعی سے ہمیں پڑھاتے۔ اس ساری کاوش کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھ کر ادا کرتے۔ کسی طالب علم سے کوئی معاوضہ یا تحفہ قبول نہ کیا جاتا۔ آج کے مادی دور میں جب ان خوشگوار لمحات کی یاد آئے، تو دل چاہتا ہے، کاش وقت کا پہیہ پیچھے کی طرف حرکت کرنے لگے اور میں پھر خود کو اس سنہرے ماضی کی آغوش میں پا کر سکونِ قلب حاصل کروں۔

اساتذہ کرام کا بلند کردار دیکھ کر راقم اپنے طویل زمانہ درس و تدریس میں (۱۹۶۲ء تا ۲۰۰۰ء) اکثر اپنے شاگردوں کو بڑے فخر سے کہا کرتا تھا:

"ہم میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ میرے اساتذہ فرشتہ سیرت انسان تھے، جبکہ آپ کو اکثر میرے جیسے نا پختہ اور دنیاوی آلائشوں میں گھرے لوگ بطور استاد میسر ہیں۔"

ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے میں اپنے چند اساتذہ کرام کی سیرت کے بعض نمایاں اور سبق



آموز پہلو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

غلام نبی

آپ بھی میری طرح پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے نقل مکانی کر کے ہمارے گاؤں آباد ہوئے جو ساہیوال کے نزدیک واقع تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل سبکدوش ہو چکے تھے۔ آپ کو ریاضی خاص کر الجبرے پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ راقم کو زمانہ طالب علمی میں جب بھی ریاضی کا کوئی سوال سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔

اس وقت ماسٹر غلام نبی ضعیف ہو چکے تھے۔ عموماً شام کے وقت اپنے گھر کے قریب سادہ سی چارپائی پر بیٹھے ہوتے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی شفقت سے سوال سمجھاتے۔ محسوس ہوتا، انھیں پڑھانے سے روحانی سکون ملتا ہے۔ بار بار سوال کرنے پر بھی اکتاہٹ کا اظہار نہ کرتے۔ نہ ہی کہتے کہ پھر کسی وقت آ کر سوال سمجھ لینا۔

راقم جب اپنے آبائی گاؤں جانے کا ارادہ کرتا ہے، تو دل میں خیال آتا ہے کہ وہاں ماسٹر غلام نبی کی خدمت میں قدم بوسی کے لیے ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ وہ بہت عرصہ پہلے میرے زمانہ طالب علمی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔

پروفیسر حسنین جعفری

آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ریاضی میں ایم اے کیا تھا اور طلائی تمغہ پایا۔ انتہائی ذہین اور اپنے پیشے سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے۔ مزاج میں سادگی اور بھولپن تھا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال (سابقہ منٹگمری) میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ریاضی پڑھاتے رہے۔

ایک روز آپ ہماری ایف ایس سی کی جماعت کو بڑے انہماک سے الجبرا پڑھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کتاب کا باب ختم ہو گیا۔ آپ نے فوراً ورق الٹا اور اگلا باب شروع کر دیا۔

ایک لڑکے نے کہا "جناب پریڈ ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ اگلا باب کل شروع کر لیں گے۔"

یہ سن کر جعفری صاحب نے فوراً تختہ سیاہ سے طلبہ کی طرف اپنا رخ موڑا اور بڑی سنجیدگی سے فرمایا "بھئی آپ لوگوں کو تو حرام کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ مجھے تو نہ ڈالو۔"

یہ کہہ کر پھر تختہ سیاہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کتاب کا اگلا باب پڑھانے لگے۔ تمام طلبہ ان کی ذات پر سہم گئے۔ لیکن اس ذاتی رائے میں بلا کا خلوص تھا۔ اسی بنا پر کسی طالب علم کو جرأت نہیں ہو سکی کہ مزید کچھ بول سکے۔

چند سال قبل جب اخبار میں ان کی وفات کی خبر پڑھی تو مجھ پر بہت گراں گزری۔ دیر تک جناب حسنین جعفری کی شخصیت میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی ان سے وابستہ واقعات فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

پروفیسر آصف علی شاہ

کم گو، سنجیدہ اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ جن دنوں راقم گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بی ایس سی کا طالب علم تھا، آپ ہمیں انگریزی پڑھاتے۔ انگریزی نثر کا نصاب خاصا وسیع تھا۔ لیکن آپ کی فرض شناسی اور اپنے پیشے سے دلی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ درسی کتاب کا ایک ایک فقرہ خود پڑھتے اور اس کی تشریح کرتے۔ موسم سرما میں ہمارا کالج صبح ساڑھے آٹھ بجے لگتا۔ کورس کی طوالت اور وقت کی کمی کے باعث آپ موسم سرما میں صبح آٹھ بجے کی اضافی جماعت (زیرو پیریڈ) لیتے۔

یہ زیرو پیریڈ ٹھیک آٹھ بجے شروع کر دیتے۔ وقت کی پابندی ان کی گھٹی میں رچی بسی تھی۔ اسی دوران آپ نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لیا اور اس مقدس پیشے

ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ گئے۔ ایسے مخلص، دیانت دار اور مثالی کردار کے مالک استاد کا دنیا سے رخصت ہونا ملک و قوم کے لیے یقیناً گھاٹے کا سودا ہے۔

خواجہ صلاح الدین

ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ کسی قیمت پہ اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرتے۔ کسی قسم کا لالچ یا خوف ان کی بااصول زندگی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ جماعت میں داخل ہوتے تو طلبہ کو نہایت خندہ پیشانی سے "السلام علیکم" کہتے۔ طلبہ کو یہ بھی ہدایت تھی کہ جب خواجہ صاحب جماعت میں داخل ہوں تو سب طالب علم اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں، کھڑے ہو کر ان کا استقبال نہ کریں۔ بعد میں آپ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ماضی میں جب ہمارے کالجوں میں در آئی اور نت نئی اسٹوڈنٹ یونینوں نے جنم لیا تو تعلیمی ادارے غنڈہ گردی کا مرکز بن گئے۔ ایک روز اخبار میں پڑھا کہ بعض شرپسند لڑکوں نے دفتر میں داخل ہو کر آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جہلا اور طلبہ طاقت گراوٹ کی اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ ایک بااصول اور حق پرست کے وجود کو برداشت نہیں کر سکے۔ خواجہ صاحب کی شخصیت پر علامہ اقبال کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

افسوس ہم نے سیاست کو دین سے تو علیحدہ کر دیا مگر مفادات کی خاطر سیاست کو تعلیمی اداروں میں داخل کر کے تعلیم ہی کا بیڑا غرق کر ڈالا۔ ع

ہوا جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پروفیسر روڈر

۱۹۵۹ء میں راقم پنجاب یونیورسٹی، اولڈ کیمپس میں ایم ایس سی طبیعات کا طالب علم تھا۔ پروفیسر روڈر ایف سی کالج لاہور میں طبیعات کے استاد تھے۔ آپ ہمیں بھی ہفتے میں ایک دن پڑھانے آتے۔ وہ امریکا سے آئے تھے۔ ابھی نوجوان ہی تھے اور خاصے ہنس مکھ بھی! پروفیسر صاحب کا پڑھانے کا انداز بڑا دلچسپ اور منفرد تھا۔

پابندیِ وقت اور فرض شناسی آپ کی فطرت میں شامل تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، جنوری کا مہینا اور خاصی سردی تھی۔ اس روز پروفیسر صاحب کا پہلا پیریڈ تھا جو صبح ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتا۔ ہم چند طلبہ وقت سے کچھ پہلے ہی جماعت میں پہنچ گئے۔ بالائی منزل پر جماعت کی بالکونی میں دھوپ سینکنے لگے۔

ایف سی کالج کا ایک لڑکا بھی ہمارا ہم جماعت تھا۔ اس نے بتایا کہ پروفیسر صاحب کی بیگم اسپتال میں زیرعلاج ہے۔ گزشتہ رات ان کے ہاں بچہ تولد ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب ایک دو روز سے اسپتال ہی میں ہیں۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ آج وہ نہیں آئیں۔

ہم جماعت کی یہ بات سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ گھریلو حالات کے پیش نظر وہ پڑھانے نہیں آئیں گے۔ اتنے میں یونیورسٹی کے گھڑیال نے صبح ساڑھے آٹھ کا گھنٹا بجایا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ عین اسی لمحے پروفیسر صاحب کی کار ڈیپارٹمنٹ کے سامنے رکی۔ پروفیسر موصوف فوراً کار سے نکلے بغل میں کتابیں دبائیں اور پلک جھپکنے میں ہماری جماعت میں آ گئے۔ آتے ہی آپ نے انگریزی میں فرمایا:

"Gentlemen, Sorry I am coming direct from the Hospital"

(نوجوانو! معاف کرنا، میں سیدھا اسپتال سے آ رہا ہوں)۔ یہ کہہ کر فوراً لیکچر شروع کر دیا۔

پروفیسر صاحب کے مذکورہ بالا الفاظ احساسِ ذمہ داری بہت خوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔

ان کی فرض شناسی، وقت کی پابندی اور احساس ذمے داری کا یہ واقعہ راقم اکثر اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بطور مثال سنایا کرتا ہے۔ افسوس اسی سال پروفیسر صاحب تعطیلات موسم گرما گزارنے اپنے وطن امریکا گئے۔ واپسی پر ان کا طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا اور وہ مع بیوی اور بچے خالق حقیقی سے جا ملے۔

پروفیسر رشید

راقم جب ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج، ساہیوال میں ایف۔ایس سی کا طالب علم تھا، تو پروفیسر رشید ہمیں فارسی (اختیاری) پڑھاتے تھے۔ پُر وقار شخصیت، سادہ لباس، خاموش طبع اور دھیمے لہجے میں بات کرتے۔ ذہانت ان کے چہرے سے ٹپکتی۔ جب لیکچر دیتے تو فارسی جیسے سادہ مضمون کو انتہائی دلچسپ اور مسحور کن پیرائے میں بیان کرتے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (فارسی) باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کیا تھا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔

کچھ عرصہ بعد اچانک پتا چلا کہ پروفیسر صاحب نے سی۔ایس۔ایس کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ چناں چہ وہ درس و تدریس کے مقدس پیشے کو خیر باد کہہ گئے۔ اس پر دل کو دھچکا سا لگا۔ وقت گزرتا گیا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں راقم ایک روز ملتان ریلوے اسٹیشن پر لاہور جانے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اچانک ایک جانی پہچانی شخصیت پر نظر پڑی تو خوشی کی انتہا نہ رہی..... یہ وہی پروفیسر رشید تھے۔ ان کی خدمت میں مؤدبانہ سلام عرض کیا۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ ان دنوں وہ فیصل آباد میں بطور مجسٹریٹ تعینات ہیں۔ میں نے نہایت ادب سے سوال کیا "جناب عالی! درس و تدریس جیسے مقدس پیشے کو خیر باد کہہ کر اپنے نئے پیشے میں آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہے جیسے گہری سوچ میں پڑ گئے

ہوں۔ پھر بتایا: میں نے زندگی میں سب سے بڑی غلطی یہی کی ہے۔

وجہ پوچھی تو فرمایا "میں نہ تو رشوت لیتا اور نہ ہی کسی کی سفارش مانتا ہوں۔ اس وجہ سے میرے ساتھی افسران بالا اور سیاست داں مجھ سے نالاں رہتے ہیں۔ تقریباً ہر سال دو سال بعد میرا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں ہو جاتا ہے۔ جہاں بھی جاؤں مختصر ساز و سامان (چارپائی، کرسی، میز وغیرہ) اپنے ساتھ لے لیتا ہوں۔ مجھے علم ہوتا ہے کہ مسافر کی طرح یہاں سے بھی کسی اور جگہ کوچ کر جانا ہے۔"

◆◆◆

غزل

تری باتیں ترے دن رات تو کچھ اور کہتے ہیں
مرے ہمدم ترے حالات تو کچھ اور کہتے ہیں
ہمارے سنگ رہنے کی تری حسرت بجا لیکن
ترے یہ خوبصورت ہاتھ تو کچھ اور کہتے ہیں
میں کیوں اخبار کی خبروں کو اب سچ مان لوں صاحب
مرے شہروں کے جب حالات تو کچھ کہتے ہیں
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اب بات کر ظالم
ترے گزرے ہوئے لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں
جو دن میں فلسفہ ہوتا ہے یارو شیخ صاحب کا
مگر پھر رات کو وہ بات تو کچھ اور کہتے ہیں
ترے وعدوں کو میں اب کس طرح سچ مان لوں جاناں!
تری باتیں، ترے جذبات تو کچھ اور کہتے ہیں
بظاہر خوش نظر آتے ہیں یہ سب لوگ جو حسنین
کبھی پھر غمزدہ لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں

(حسنین اقبال منہاس، سبی، بلوچستان)

معاشرتی کہانی

میرا تعلق پنجاب کے ایک دیہی علاقے سے ہے۔ باپ محکمہ تعلیم میں درجہ چہارم کا ملازم تھا اور ماں گھر کی دیکھ بھال کرتی۔ میں چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ گھر کے اکثر کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتا اور اپنی بھینس کو چارہ بھی ڈالتا۔ جس دن کھیل کود کے چکر میں گھر کا کوئی کام کرنا بھول جاتا، تو شام کو ابا جی سے چھترول ضرور ہوتی۔ میرا بچپن ابا کی بے وجہ مار اور اماں کے حد سے زیادہ پیار کی تلخ و شیریں یادیں رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ ای کی

ایک ماں کی دردبھری فریاد

”بیٹا! لوٹ کر ضرور آنا“

آسائشوں بھری زندگی میں مست ہو کر اپنے پیاروں کو بھول جانے والے خودغرض کی دلخراش داستان

سجاد قادر



رشتے دار سے ملنے گئی۔ مجھے اسکول سے اس لیے چھٹی کرائی گئی کہ گھر کا خیال رکھوں۔

ماں نے جاتے جاتے مجھے تاکید کی کہ جب دن چڑھے اور دھوپ تیز ہو تو بھینس کو پانی پلا کر درخت کے نیچے باندھ دینا۔ ماں کو گئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے دوست آگئے اور نہر پر جا کر نہانے کی ضد کرنے لگے۔ میں فوراً رضامند ہو گیا۔ نہر میں نہاتے اور مستی کرتے پتا ہی نہ چلا کہ دوپہر کب ڈھل گئی۔ سہ پہر کو اچانک بھینس کا خیال آیا۔ میں بھاگم بھاگ گھر پہنچا تو ابا حضور شعلہ بار آنکھیں لیے میرے ہی منتظر اور غصے سے بپھرے ہوئے بیٹھے تھے۔

ابا کو شاید کسی نے دفتر جا کے بتا دیا تھا کہ آپ کی بھینس خوب ڈکار رہی ہے اور اس کے شور نے محلہ سر پر اٹھایا ہے۔ وہ فوراً گھر پہنچے، بھینس کو چھاؤں میں باندھا اور پانی وغیرہ پلا کر چارہ ڈال ہی رہے تھے کہ ان کی نظر دروازے کے پیچھے چھپے میرے چہرے پر پڑی۔

بس آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور جوتوں اور تھپڑوں سے دھلائی کر ڈالی۔ میں نے بہت معافیاں مانگیں اور ترلے کیے مگر ابا سننے والے کہاں تھے۔ مار مار کر تھک گئے، تو مجھے بھینس کے کلے پر جہاں وہ دھوپ میں کھڑی تھی، باندھا اور خود دفتر چلے گئے۔ میں نے خود کو چھڑانے کی بہتیری کوشش کی مگر ناکام رہا۔ محلے والے چونکہ میرے ابا کے غصے سے واقف تھے لہٰذا کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ مجھے کلے سے آزاد کراتا۔

شام ہونے کو تھی کہ اماں واپس آئی اور جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں دھوپ کی تمازت برداشت نہ کرنے کے باعث بیہوش ہو گیا تھا۔ اماں نے ابا کو خوب جلی کٹی سنائیں اور مجھے ساتھ لیے فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے بخار ہو چکا ہے، دوائی کھلائیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کریں۔ ساری رات اماں مجھے اپنی گود میں لیے پٹیاں کرتی اور ابا کو اول فول کہتی رہیں۔

اماں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا، شاید اس لیے کہ میں سب سے بڑا تھا۔ وہ مجھے ہی اپنے پیار کا زیادہ حق دار ٹھہراتیں۔ جب کبھی ابا کسی بات پر بگڑتا اور مجھے مارنے لگتے، تو اماں سیسہ پلائی دیوار بن جاتی اور میرے حصے کے ڈنڈے خود کھا بیٹھتیں۔ ایک مرتبہ مجھے ابا نے چینی لانے بھیجا۔ میں لے کر واپس آرہا تھا کہ راستے میں شاپر پھٹا اور ساری چینی گر گئی۔ میں نے ریت کے اوپر سے صاف صاف چینی اپنی جھولی میں ڈال لی۔ اگرچہ اس میں بھی ریت کی آمیزش تھی۔

گھر پہنچ کر جب صورت حال ابا کو معلوم ہوئی، تو وہ ڈنڈا لے کر مجھ پر پل پڑے۔ ایک دو ڈنڈے کھانے کے بعد میں بھاگ پڑا اور گھر سے نکل گیا۔ ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد شام ہوتے ہی گھر کے پچھواڑے سے ہو کر اپنے کمرے کی چھت پر جا چڑھا۔ اس وقت اماں کمرے میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ چھت پر قدموں کی چاپ نے ماں کو بتا دیا کہ بیٹا رات کو چھت پر سوئے گا۔ جب رات ہوئی اور سارے کھانا کھا کے سونے چلے گئے، تو اماں نے روٹی سالن رومال میں باندھا اور ایک شاپر میں ڈال چھت پہ عین اس جگہ پھینکا جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔

اس رات امی کی پیار کرنے والی لڑکی کے ساتھ کھائے اس کھانے کا ذائقہ آج تک فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی نہیں مل سکا۔ جب کبھی مجھے پیسوں کی ضرورت پڑتی تو جانتا تھا کہ ابا کوئی دے نہ دے، اماں ضرور دے گی، لہٰذا جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی، فوراً اماں کو کہتا اور وہ جیب سے حاضر کر دیتی۔ اماں مجھے ہمیشہ کہتی:

"بیٹا ایک دن تو بڑا افسر بنے گا۔ نکمے ادھر ادھر دھیان نہ دے خوب دل لگا کے پڑھائی کر۔ جب تو افسر بن گاڑی پر

گاؤں آنے گا، تو مجھے اگلی نشست پر بٹھا کر دربار لے جانا۔ وہاں میں اللہ کے نام کی دیگ چڑھاؤں گی۔ اور سن! اپنی گاڑی کے شیشے کالے نہ لگوانا ورنہ گاؤں والے مجھے کیسے دیکھیں گے کہ میں اپنے راج دلارے انور کی گاڑی میں بیٹھ کے جا رہی ہوں۔ میں نے سائیں کے دربار پہ دو دیگیں چڑھانی ہیں۔ ایک تیری نوکری کی اور دوسری تیری شادی کی۔''

وہ والہانہ کہے جاتی ''اچھا سن! تیری شادی میں وہ ٹی وی والی کے ساتھ کراؤں گی جو صبح صبح پروگرام کرتی ہے' کتنی سوہنی ہے سادہ اور کیسے ٹکر ٹکر باتیں کیے جاتی ہے۔ میرا دل خوب لگے گا اس کے ساتھ، تو بس جلدی جلدی پڑھ اور افسر بن جا۔ باقی اللہ خیر کرے گا۔'' خاص طور پر رات کو جب ابا سے کسی بات پر جھگڑا ہوا کرتی' ماں کی گود میں اسی قسم کی باتیں سنتے نیند آتی۔ ویسے بھی بچپن میں جب اماں میرا سر اپنی گود میں رکھتی اور پیار سے بالوں میں ہاتھ پھیرتی' تو خود بخود آنکھیں بند ہو جاتیں۔

ایک مرتبہ ہمارے اسکول کا تفریحی دورہ شہر سے باہر جا رہا تھا جس کے لیے سو روپے جمع کرانا تھے۔ ابا سے پیسے مانگے' تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اماں سن رہی تھی' انھوں نے بھی میری وکالت کی مگر ابا نہ مانے۔ میں رونے لگا، تو ابا نے مجھے دو تین تھپڑ جڑ دیے اور چلے گئے۔ اماں میرے پاس آئی' میرے آنسو پونچھے اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تو رو مت' میں پیسے دے دیتی ہوں۔ یہ سن کر میری باچھیں کھل اٹھیں۔

اماں نے دوپٹے کے کونے میں بندھے سو روپے نکال کر مجھے دیے اور میں خوشی سے بغلیں بجاتا باہر نکل گیا۔ دو دن بعد ہماری جماعت تفریحی دورے پر چلی گئی۔ ابا کو پتا چلا کہ میں بھی گیا ہوں' تو اماں سے پوچھا کہ اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے؟ مزید کرید اتو پتا چلا کہ ابا نے اماں کو دوائی لانے کے لیے جو سو روپے دیے تھے' وہ انھوں نے مجھے دے

ایک مبارک دعا

روزے دار کی دعا سب سے زیادہ قبول ہوتی ہے جیسا کہ امام ابوداؤد طیالسیؒ نے اپنی مسند میں اپنی اسناد کے ساتھ روایت کیا۔ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، انھوں نے کہا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرمایا، روزہ دار کے افطار کے وقت اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ چناں چہ عبداللہ بن عمرؓ جب روزہ افطار کرتے، تو اپنے اہل وعیال کو بلاتے اور دعا کرتے۔ ابن ماجہؒ نے عبداللہ بن عمرؓ ہی سے روایت کیا کہ نبیؐ نے فرمایا، روزے دار کی دعا، جو وہ افطار کے وقت کرے، رد نہیں ہوتی۔

(فی ظلال القرآن، جلد اول، ترتیب: خرم مراد)

ڈالے۔ ابا کو اس بات پر بڑا غصہ آیا اور اماں پر دھاڑتے رہے' ''اب خود کرانا علاج، مجھ سے دوبارہ پیسے نہ مانگنا۔''

جیسے تیسے میں نے میٹرک کر لیا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اماں نے کہا کہ بیٹا، باپ کے حالات تیرے سامنے ہیں۔ اس بچارے پر پورے گھر کا بوجھ ہے۔ پھر تیرے چھوٹے بہن بھائی ابھی پڑھ رہے ہیں اور ان کا خرچ بھی نکالنا پڑتا ہے۔ تو کہیں نوکری کر لے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھی حاصل کر مگر میں راضی نہ ہوا۔ ادھر ابا نے پیسے دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بالآخر جب کچھ نہ بن پڑا' تو میں نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ یہ سنتے ہی اماں تو زار و قطار رونے لگی مگر ابا نے کہا کہ تم نے منہ پر جواب دیا ہے لہٰذا آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے' جب میں اپنا سامان باندھ کر گھر سے نکلنے لگا۔ اماں میرے پاؤں پڑ گئی۔ دوپٹا اتار کر میرے قدموں میں رکھ دیا اور کہا کہ مت جا۔ میری قسم ہے تجھے رک جا۔ مگر اس وقت جوانی کے نشے اور

ہٹ دھرم ہونے کی بنا پر میں نے اماں کی ایک نہ سنی اور گھر کی دہلیز پھلانگ گیا۔

میں کچی سڑک پر جا رہا تھا کہ اچانک سامنے سے آتی گدھا گاڑی والے نے مجھے پیچھے دیکھنے کو کہا۔ مڑ کر دیکھا اماں بھاگی آ رہی تھی۔ سر پر دوپٹا تھا نہ پاؤں میں جوتی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج اماں کو بھی خوب کھری کھری سناؤں گا۔ مگر جب وہ میرے پاس پہنچی، تو اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ آنکھیں ویران، آواز لڑکھڑاتی اور بھرائی ہوئی۔

وہ روتے ہوئے بولی: "بیٹا انور تو خالی ہاتھ گھر سے جا رہا ہے۔ پتا نہیں آگے تیرے ساتھ کیا بیتے۔ میرے پاس یہ دو طلائی بالیاں ہیں جو میں نے تیری بہن کے کانوں میں ڈالنے کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔ اس کی قسمت میں ہوئیں تو اور بن جائیں گی۔ ابھی تو لے جا یہ تیرا حق ہے۔ مگر بیٹا لوٹ کے ضرور آنا۔ شہر جا کر اوروں جیسا مت بن جانا کہ مجھ سے محلے والوں کے طعنے نہیں سہے جائیں گے۔ خوب دل لگا کر پڑھائی کرنا اور اپنے گھر والوں کو بھی یاد رکھنا۔"

میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا اماں کا منہ تک رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بالیاں پکڑا واپس چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا جب تک اماں میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس دوران اماں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا شاید کمزور دل ماں میں مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

***

یوں میں شہر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے سب سے پہلے سونے کی بالیاں بیچیں۔ جو رقم ملی اس سے اسکریپ کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا۔ محنت اور ماں کی دعاؤں سے کاروبار پھلتا پھولتا چلا گیا اور میں لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ اس دوران میں نے بھول کر بھی گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا۔ میری سوچ یہی تھی کہ بڑی سی گاڑی میں گاؤں پہنچ کر اپنے باپ سے کہوں گا کہ ابا دیکھیے میں اتنا دولت مند بن گیا ہوں۔ پھر اماں کو گاڑی میں بٹھا دربار لے جاؤں گا کہوں گا، اماں آپ دونوں اللہ کے نام کی چار دیگیں چڑھاؤ۔

آج پندرہ سال بعد جب میں اس قابل ہو گیا کہ اپنی شاندار گاڑی میں گاؤں جا سکوں تو تحائف سے خوب لدا پھندا وہاں پہنچا۔ گاؤں پہنچتے ہی میرے ساتھ عین ویسے ہوا جیسے میری سوچ تھی۔ لوگوں کا ہجوم گاڑی کے پیچھے لگ گیا۔ ہر کوئی مجھے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اپنے گھر کے سامنے میں نے گاڑی روکی اور نیچے اترا۔ تب تک پورا محلہ وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میرے چہرے پر فاتحانہ اور متکبرانہ مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا میرا چھوٹا بھائی جاوید مجھے پہچان میرے گلے لگا اور خوب دھاڑیں مار مار رونے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ ہوا کیا ہے۔ آخر وہ سسکتے ہوئے خود ہی بولا: "بھائی جان آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ اب کچھ باقی نہیں رہا، ابا اور نہ اماں!!"

یہ الفاظ مجھ پر پہاڑ کی طرح گرے۔ پیروں سے زمین سرکتی محسوس ہوئی اور آسمان گھومتا نظر آنے لگا۔ محلے والوں اور بہن بھائیوں سے پتا چلا کہ اماں روزانہ کچے راستے تک جاتی اور یہی کہتی کہ میں نے انور سے کہا تھا: "بیٹا لوٹ کے آنا، میں تیرا انتظار کروں گی۔" اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔" ہم سب اسے سمجھاتے مگر وہ ہماری ایک نہ سنتی۔ بھائی نے بتایا کہ ابا دو سال پہلے بیمار ہو کر چل بسے جبکہ اماں ایک ماہ پہلے اس فانی جہاں سے چلی گئی۔ وہ حسب معمول میری راہ دیکھنے کچے راستے پہ گئی اور واپس نہ آئی۔ اندھیرا چھانے لگا تو ہم پریشان ہوئے۔ میں کچھ محلے والوں کے ساتھ انھیں ڈھونڈنے گیا۔ انھیں ایک جگہ وہ زمین پر پڑی نظر آئی۔ پتا چلا ایک زہریلے سانپ نے انھیں ڈس لیا تھا۔

یہ بیتا سن کر میں خاموشی سے اٹھا اور دوبارہ والے قبرستان پہنچا جہاں میرے ابا اور اماں دونوں اپنی قبروں میں لیٹے تھے۔ وہاں میں نے چار دیگیں چڑھائیں اور دوسرے روز ہی واپس شہر آ گیا۔ اب میں بہن بھائیوں کو ملنے کے لیے بلا لیتا ہوں مگر دوبارہ گاؤں جانے کی ہمت نہ کر سکا کہ وہاں اماں کی یادیں جینے نہیں دیتیں۔

سیانے سچ کہتے ہیں کہ انسان دوڑتے دوڑتے اپنوں سے اتنا دور چلا جاتا ہے کہ اسے واپسی کا راستہ تک نہیں یاد رہتا۔ میں خود کو ابا اور اماں کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہوں۔ جن کا لخت جگر عرصہ دراز ان سے دور رہے اور ماں باپ کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ بیٹا زندہ بھی ہے یا نہیں، وہ تو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ جس ماں نے زندگی بھر مجھے خوشیاں دینے اور خیال رکھنے کی خاطر اپنی زندگی اور خواہشات تج دیں یہاں تک کہ کبھی بہن بھائیوں پر مجھے فوقیت دی، میں نے اسے کیا دیا؟ مجھے تو آخری وقت اپنی عظیم ماں کا چہرہ تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ میرے جیسی اولاد کی مثال دھوبی کے اس کتے جیسی ہوتی ہے جو گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔

آخر میں میری یہی دعا ہے کہ اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے جب تک میں اپنی غلطیوں کا ازالہ نہ کرا لوں۔ میں بہن بھائیوں کو اپنے قدموں پہ کھڑا کرنا چاہتا ہوں جن کا حق مار کے میں نے خوشیاں حاصل کیں اور معاشرے میں بلند مقام پایا۔

◆◆●

غلطی کا اقرار

عمرو لیث نامی بادشاہ کا غلام راہ فرار اختیار کر گیا۔ بادشاہ نے اس کی اس حرکت پر ناراض ہو کر اسے پکڑنے کے لیے چند آدمی بھیج دیے۔ وہ چند دن کی کوشش کے بعد اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ غلام کو بادشاہ سلامت کے دربار میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ کے ایک وزیر کو غلام سے ذاتی رنجش تھی۔ اس نے غلام قتل کرنے کا مشورہ دیا تاکہ باقی اس قسم کی حرکت نہ کر سکیں۔ بھاگے ہوئے غلام نے بادشاہ سلامت کو تعظیم دے کر عرض کیا کہ آپ جو چاہتے ہیں، مجھے قبول ہے مگر میں روز قیامت یہ دعویٰ کیسے کروں گا کہ یہ حکم آپ کا تھا؟ میں اس خاندان کے ٹکڑوں پر پلا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کل قیامت کو میرے خون کے عوض آپ گرفتار ہو کر آئیں۔ یہ بات سن کر بادشاہ ہنس پڑا اور وزیر سے کہا، اب بتا تیری کیا رائے ہے؟ وزیر نے فوراً عرض کیا اے بادشاہ سلامت! میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ خدا کے لیے اور اپنے والدین کی قبر کے صدقہ اس کو آزاد کر دیں تاکہ یہ مجھے کسی بلا میں مبتلا نہ کر دے۔ قصور میرا ہی ہے۔ عقل مندوں نے کیا خوب کہا ہے کہ جب تیری لڑائی ایک نشانہ باز سے ہو جائے، تو اس میں تیرا ہی قصور ہے۔ تو نے بے وقوفی سے اپنا سر پھوڑنے کا سوچا۔ جب تم کسی پر دشمنی سے تیر چلاؤ، تو یہ بھی جان رکھو کہ تم اس کے نشانے پر ہو۔ وہ تمہیں کسی حال میں معاف نہیں کرے گا۔

درسِ حیات

۱: عدل، عقل مندی ہے اور انصاف کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا وسیلہ۔ ۲: اپنے سے طاقتور کے ساتھ لڑائی کرنا حماقت کا کام ہے۔ ۳: بلاشبہ دشمن کو معاف کر دینا ہی رحم اور صدقہ ہے۔ ۴: ہر کام بڑی سوچ و فکر کے بعد کرنا چاہیے۔ ۵: انصاف نہ کرنا عقل مندی ہے اور نہ ہی بہادری کا کام۔ ۶: پتھر کا جواب پتھر سے دینا مناسب ردعمل نہیں۔

(حکایات سعدی، شیخ سعدی شیرازیؒ۔ انتخاب: آمنہ رمضان، عارف والا)

ناصر کاظمی سیدزادے تھے، اپنے آباؤاجداد پر فخر کیا کرتے۔ کبھی بہت موڈ میں ہوتے، تو دعا دے کر قبولیت کی سند بھی ساتھ ہی دے دیتے: ''جاؤ سید ہوں، دعا دیتا ہوں۔ اپنے لیے تو کبھی کچھ نہیں مانگا، سید اگر کسی کی سفارش کرے، تو اللہ فوراً مان لیتا ہے۔''

۱۹۵۸ء کا مارشل لا لگا، تو ادیبوں اور شاعروں میں سیاسی شعور کی لہر دوڑ گئی۔ حبیب جالب کی ہنگامہ خیز نظموں نے



بستیوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ

ناصر کاظمی......مانوس اجنبی

منفرد و یگانہ اُردو شاعر کی شخصیت و عادات آشکار کرنے والی دلچسپ اور سبق آموز جگ بیتی

پروفیسر احمد عقیل روبی

سارے ملک میں طوفان برپا کر دیا۔ ہر شاعر اور ادیب اپنے اپنے طور پر یہ فرض نبھا رہا تھا کہ اس گھٹن میں کسی نہ کسی پیرائے سے بے ساختہ اظہار کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھولی جائے۔ ٹی ہاؤس، لاہور کی دیگر محفلوں میں اکثر یہی بحث چلتی کہ کون کیا اور کیسے کہہ رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک دن احمد مشتاق نے ناصر کاظمی سے کہا ''ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اور سچ بولنا ہر باشعور ادیب اور شاعر کا فرض ہے۔ تم نے کیا کیا ہے۔''

ناصر نے فوراً جواب دیا ''میں سچ بول کر کربلا میں ایک بار گردن کٹا چکا، اب تمھاری باری ہے۔''

ملازمت سے استعفیٰ

ناصر کاظمی نے اپنی زندگی میں کئی جگہ ملازمتیں کیں۔ کئی رسالوں کے مدیر رہے۔ ون یونٹ کے مجلے میں ''ہم لوگ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے عرصہ تک کام کیا لیکن اپنی آزادی اور خودداری کو کبھی داؤ پر نہیں لگایا۔ دفتر سے اکثر غائب رہتے۔ جاتے بھی تو بارہ ایک بجے! اپنی مرضی سے کام کرتے، نہ کسی کو کبھی کچھ کہا اور نہ کسی سے کچھ سنا۔ کسی افسر نے روک ٹوک کی، تو جواب اپنے مخصوص انداز میں دیا۔

ایک بارہ بجے کے قریب دفتر پہنچے، تو ان کا افسرِ اعلیٰ دفتر سے رخصت ہو رہا تھا۔ افسر نے کہا ''آپ اس وقت آ رہے ہیں ناصر کاظمی صاحب؟''

ناصر نے جواب دیا ''جی!''

افسر نے کہا ''مگر کیوں؟''

''استعفا دینے کے لیے۔'' یہ کہہ کر ناصر نے بات پوری کی۔ ''یہ ملازمت میرے اہل نہیں۔ مجھے اندر سے خالی کر دیا۔''

افسرِ اعلیٰ ناصر کاظمی کی اہلیت کے قائل تھے۔ یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ یہ چلے گئے، تو کون رسالے کا کام سنبھالے گا۔ ناصر کاظمی کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے اور معذرت کے ساتھ عرض کی،

''اگر آپ کو یہاں کوئی دقت اور تکلیف ہے، تو مجھے بتلایئے۔ یہ اچانک استعفا کا خیال کیوں آ گیا؟ اسے ذہن سے نکالیے۔ آپ چلے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟''

***

ناصر کاظمی کو ایک بات سے بڑی چڑ تھی اور وہ تھی بار بار سب سے ہاتھ ملانا۔ کہتے تھے ''ہماری آدھی زندگی تو لوگوں سے ہاتھ ملانے میں گزر جاتی ہے۔ کہیں جاؤ تو سب سے ہاتھ ملاؤ۔ اٹھ کر چلنے لگو، تو سب سے ہاتھ ملاؤ۔''

ایک بار ناصر کاظمی کو کراچی جانا تھا۔ انھوں نے اپنے افسر کو پندرہ دن کی چھٹی کے لیے درخواست دی اور لکھا کہ مجھے کراچی جانا اور لوگوں سے ہاتھ ملانا ہے۔ اس لیے چھٹی منظور کی جائے۔

''ناصر نے ملازمت کو کبھی اہمیت نہ دی۔ ایک بار کہنے لگے: ''میں ملازمت کی کبھی پروا نہیں کرتا۔''

کسی نے کہا ''آپ تو ملازمت کر رہے ہیں اور باقاعدہ دفتر جاتے ہیں۔ اگر پروا نہ ہو، تو کیوں جائیں؟''

ناصر نے جواب دیا ''یہ ملازمت میں دوسرے لوگوں کی طرح نہیں کرتا۔ خدا بخش بچہ (وزیرِ زراعت) کو جب میں نے ملازمت کے لیے انٹرویو دیا، تو صاف صاف کہہ دیا، جو تنخواہ آپ نے اخبار میں لکھی ہے، میں اس پر کام نہیں کروں گا۔ اگر آپ مجھے تیرہ ترقیاں ایک ساتھ دینے کا وعدہ کریں، تو میں حاضر ہوں۔ انھوں نے میری شاعرانہ حیثیت دیکھتے ہوئے فوراً بات مان لی۔''

ناصر کاظمی کی زندگی میں یہی نفسیات تا مرگ کام کرتی رہی کہ وہ ہر حیثیت میں لوگوں میں منفرد رہیں، چاہے شاعری ہو، گفتگو، ملازمت یا غربت۔

ناصر کاظمی کتوں سے بہت ڈرتے تھے۔ کتے کو دور سے دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ کہا کرتے کہ پیٹ میں چودہ ٹیکے لگوانے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا سفر دو فرلانگ اور لمبا کر لے۔ انھوں نے جانوروں، چڑیوں، راستوں، گلیوں اور سڑکوں سے آشنائی پیدا کر لی، مگر کتوں سے راہ و رسم نہ بڑھا سکے۔ کبھی کبھی وہ ان کے خوف سے کسی نہ کسی کو اپنا ہم سفر بنا لیتے جو انھیں گھر تک پہنچا آتے۔

کتوں سے جنگ

ایک بار شدید سردی کا موسم تھا۔ رات کو ایک بجے مجھے ہاسٹل کے چپراسی نے کہا، آپ کو ناصر کاظمی بلا رہے ہیں۔ میں نیچے اترا، وہ ہوسٹل کے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے ''کیا کر رہے ہو؟''

''پڑھ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم پڑھ رہے ہو اور رات کا قافلہ روانہ ہونے کو ہے۔''

میں ان کی بات سمجھ گیا، کہا ''میں ابھی آیا۔''

میں اپنے کمرے میں گیا۔ میرا ہم کمرہ دانش رضا سو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کا اوورکوٹ اٹھایا جو اس نے پچھلی شام ہی لنڈے بازار سے خریدا تھا اور ناصر کاظمی کے ساتھ ہو

لیے۔ انارکلی، اسٹیشن، میکلوڈ روڈ اور مال سے ہوتے ہوئے ہم کرشن نگر داخل ہوئے۔ تین بج چکے تھے۔ آوارہ کتے بڑھ لانے پھر رہے تھے۔ میں کتوں کے سلسلے میں ناصر سے بھی زیادہ ڈرپوک تھا مگر میں نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم کتوں سے بچتے بچاتے ناصر کاظمی کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر چلے گئے۔ مجھے خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

میں واپس پلٹا تو دس کتوں کا ایک جاندار دستہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھایا، تو وہ بھونکنے لگے۔ میں چلا تو وہ پیچھے دوڑے۔ دوڑا، تو انھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ناصر کاظمی کا گھر چند قدم دور تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں اوورکوٹ اتار کر چاروں طرف لہرایا، تو کتے مزید بپھر گئے۔ میں نے اپنے دفاع میں ذرا تیزی دکھائی، تو اوورکوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک کتے پر جا گرا۔ وہ بھی اس طرح کہ اوورکوٹ کے بازو میں اس کا سر پھنس گیا۔

اس آفت ناگہانی سے کتا گھبرا گیا۔ اوورکوٹ کے بازو سے اپنا سر نکالنے کے لیے وہ چاروں طرف گھومنے لگا۔ کتے کو اپنے سر کی پریشانی تھی، مجھے اس اوورکوٹ کی جو دانش رضا کل خرید کر لایا تھا۔ کتے کے چاروں طرف چکر لگانے سے سب کتے اوورکوٹ کو بلا سمجھ کر بھاگ گئے۔ اب میں کتے سے اوورکوٹ چھیننے کی تگ و دو کرنے لگا۔ کتا ۵۰ گز کے دائرے میں دیر تک بھاگتا اور میں کتے کے پیچھے دوڑتا رہا۔

آخر کتے نے زور لگا کر اپنا سر کوٹ کے بازو سے نکالا، تو کوٹ اچھل کر دور جا گرا۔ کتے کے چہرے پر بلا کا خوف تھا۔ اس نے چند لمحے کوٹ کے بے ترتیب بکھرے بازو دیکھے اور پھر خوفناک چیخ مار کر بھاگ گیا۔ میں نے اوورکوٹ اٹھایا تو ناصر کاظمی نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر کہا:

"یار کتے سے بچنے کا یہ تو بہت آسان طریقہ ہے۔ میں یوں ہی ڈرتا رہا۔ کل میں بھی ایک اوورکوٹ خرید لاؤں گا۔"

اور پھر کھڑکی بند کرلی۔

ناصر کاظمی کو ڈھونڈنے کے لیے دکانوں کا گرم پانی پینا پڑتا تھا۔ ٹی ہاؤس اور لارڈز (Lords) ٹی ہاؤس کی محفل سرد پڑتی، تو انتظار حسین، اعجاز حسین بٹالوی اور ناصر کاظمی لارڈز میں ڈیرا جما لیتے۔ اکثر یوں بھی ہوا کہ میں لارڈز کے باہر کھڑا شیشے میں سے انھیں دیکھتا رہتا۔ جب وہ اٹھ کر باہر آتے، تو ملاقات ہوتی۔ اس ملاقات کا دارومدار ان کے موڈ پر تھا۔ کبھی کبھی وہ باہر آتے، تانگہ لیتے اور گھر چلے جاتے۔ کبھی کبھی چند قدم چل کر کہیں ادھر اُدھر غائب ہو جاتے۔ وہ اہل ایماں کی طرح مثل صورت خورشید زندگی بسر کرتے تھے۔ اس گلی میں ڈوب کر اس گلی کی نکڑ سے طلوع ہونا ان کی عادت تھی۔

ایک رات میں ناصر کاظمی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تو رنگ محل چوک میں مولا بخش سے پان لینے رکا۔ بجلی کی سرعت سے پڑیوں میں پان لپیٹنے والے لڑکے سے کہا "ایک پان الائچی سپاری۔"

پیچھے سے ایک آواز آئی "ایک پان سادہ، چونا ذرا زیادہ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ناصر کاظمی تھے۔

"ناصر بھائی! آپ کو تو دو گھنٹے سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" میں چیخ اٹھا۔

لڑکے سے سادہ پان لے کر بولے "ہم اتنے کم عرصے میں دستیاب ہونے والے لوگ نہیں۔"

جب رنگ محل چوک پار کر کے شیراں والی گلی کے سامنے آئے، تو کہنے لگے "تمھاری ایک شکایت ملی ہے۔"

"کیا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم خالد احمد اور گوہر ہوشیار پوری کے ساتھ ساری رات رنگ محل چوک میں کھڑے گپیں لگاتے رہتے ہو۔ پڑھتے

پڑھاتے کچھ نہیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا "ان کے ساتھ، تو میں آٹھ بجے تک ہوتا ہوں۔ راتیں، تو میں نے آپ کے نام کی ہوئی ہیں۔"

ناصر کاظمی کو تسلی ہوئی، تو مطمئن ہو کر کہنے لگے "good" (بہت اچھے) اور سناؤ، کیا حال ہیں؟"

میں نے حال بتایا۔ ناصر کاظمی کا یہ تکیہ کلام تھا۔ اگر وہ آپ کے ساتھ ایک گھنٹہ رہیں، تو کم از کم بیس بار آپ سے پوچھیں گے: "اور سناؤ کیا حال ہیں؟"

ان کے پاس جب کوئی بیٹھا ہوتا، تو وہ ساتھ چلنے والے کا حال پوچھ لیتے۔ حالانکہ ہم سفر کئی بار انھیں اپنے حال سے آگاہ کر چکا ہوتا۔ یہ اسی رات کا ذکر ہے جب انھوں نے خالد احمد اور گوہر ہوشیارپوری کے ساتھ برفی کھانے کی شکایت کی تھی۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہے۔ ٹی ہاؤس بند تھا۔ ۱۲ بجے کا وقت ہو گیا۔ دیکھا کہ کمرشل بلڈنگ کے سامنے ایک آدمی موٹر سائیکل کے پاس کھڑا اسے گالیاں دے رہا ہے۔ ناصر کاظمی اس کی آواز پہچان کر کہنے لگے:

"یہ تو حسن لطیف للک ہے۔"

حسن لطیف خوبصورت موسیقار (Composer) تھا۔ بقول ایک مشہور موسیقار، وہ جتنی اچھی دھن بناتا تھا، اس کی ترتیب (Arrangement) اتنی ہی بری کرتا۔ ہم اس کے قریب پہنچے، تو ناصر کاظمی نے ٹھیٹ پنجابی میں کہا "توں جناں چنگا میوزک ڈائریکٹر ایں، موٹر سائیکل اونی ای بھیڑی اے (تم جتنے اچھے موسیقار ہو، موٹر سائیکل اتنی ہی بری ہے)"

للک نے جواب دیا۔ "تے فیر میں کی کراں؟" (تو میں کیا کروں؟)

"اسے بیچ دو۔" ناصر کاظمی نے مشورہ دیا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا، اس نے کیا بات شروع کی اور ناصر نے کیا جواب دیا کہ حسن لطیف موٹر سائیکل گھسیٹ کر ہمارے ساتھ چلنے لگا۔ سیکرٹریٹ، چشتیہ ہائی اسکول، کرشن نگر کا بازار سب گزر گئے اور ناصر کاظمی کا گھر آ گیا۔ دستک دی گئی۔ دروازہ کھلا اور ناصر نے اندر جا کر ہمیں کہا: "خدا حافظ"۔ اور دروازہ بند کر لیا۔



۱۹۵۲ء میں ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری، [illegible] اور محمد طفیل کی ایک یادگار تصویر

حسن لطیف نے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "انھیں کہتے ہیں ناصر کاظمی۔"

حسن لطیف نے موٹر سائیکل زمین پر لٹائی اور دروازے پر زور سے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ناصر کاظمی نے گردن باہر نکالی۔ "کیا ہے؟" وہ بولے۔

"تمھیں ایک اطلاع دینی ہے۔" حسن لطیف نے کہا۔

"کیا؟"

"وہ یہ کہ تم جتنے اچھے شاعر ہو اتنے ہی برے آدمی ہو۔" حسن لطیف نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"تو میں کیا کروں؟"

"شاعر کو رہنے دو، اس برے آدمی کو بیچ دو۔"

"اچھا یہ کام صبح کروں گا۔" دروازہ پھر بند ہو گیا۔

اب موٹر سائیکل گھسیٹ اور حسن لطیف کو سہارا دے کر اے جی آفس کے پیچھے اسلم گورداسپوری کے دفتر تک پہنچانا میری ڈیوٹی تھی جو میں نے نبھائی۔

حسن لطیف پڑھا لکھا موسیقار تھا۔ کہتے ہیں، فیروز نظامی کے بعد وہ دوسرا موسیقار تھا جو بی اے تک پہنچا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ عمدہ شعری ذوق رکھتا۔ ٹی ہاؤس میں شاعروں اور ادیبوں کی مجلسوں میں اکثر شریک ہوتا اور بڑھ چڑھ کر ادبی بحثوں میں حصہ لیتا۔ ناصر کاظمی سے بہت بنتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک موٹر سائیکل پر پورا لاہور گھومتا۔ بقول ناصر کاظمی: "دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی ساری ڈاک اسی پر آتی تھی۔"

مجھے بھی اس موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تھا اور روزانہ لاہور آنا پڑتا۔ ایک دن ناصر کاظمی کہنے لگے "یہ جو تم ملازمت کر رہے ہو، اس کا کیا فائدہ؟ جو کماتے ہو ریلوے والوں کو دے دیتے ہو۔ کچھ ہونا چاہیے۔"

"مثلاً کیا؟" میں نے کہا۔

"لاہور آجاؤ۔" ناصر کاظمی بولے۔ "ابھی حسن لطیف آئے گا۔ اس کی جیب میں بڑے بڑے جگادری افسروں کے کارڈ پڑے رہتے ہیں۔ اسے کہتا ہوں، کوئی کارڈ نکالے۔"

حسن لطیف آئے۔ انھوں نے تبادلے کی بات کی۔ حسن لطیف کہنے لگے: "ناصر کاظمی! تبادلہ اس طرح نہیں ہوتا۔ تم بتاؤ، تبادلہ کون کرتا ہے۔ اس کا نام کیا ہے، پھر میں جانوں اور میرا کام۔"

ناصر کاظمی کہنے لگے "یہ تمھارا اسلم گورداسپوری کس دن کام آئے گا۔ ہم تم سے فیکٹری کا قرضہ منظور کرانے کے لیے تو نہیں کہہ رہے۔"

حسن لطیف کچھ سوچ کر بولے "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔"

حسن لطیف پھر مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسلم گورداسپوری کے پاس لے گیا۔ جب میں بیٹھ رہا تھا تو ناصر کاظمی نے چپکے سے میرے کان میں کہا "اس کی موٹر سائیکل کو پٹرول پمپ دیکھ کر پیاس ستانے لگتی ہے۔ اگر حسن لطیف پٹرول ڈلوانے کے لیے کہے تو پیدل ٹی ہاؤس واپس چلے آنا۔" لیکن اس دن موٹر سائیکل کو کوئی پیاس محسوس نہیں ہوئی۔

کبوتر اڑاتے اڑاتے ناصر کاظمی مکمل طور پر کبوتر بازوں کی نفسیات میں ڈھل گئے۔ ایک کبوتر باز کبھی اپنے کبوتر کو کسی دوسرے کی چھتری پر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ناصر کاظمی بھی تعلقات اور دوستی کے ضمن میں پکے کبوتر باز تھے۔ کبھی پسند نہ کرتے کہ ان کا چاہنے والا کسی دوسرے کے قریب پھٹکے۔ کوئی ایسا کرتا تو بگڑ جاتے۔

۶۴۔۱۹۶۵ء میں ناصر کاظمی اور سید عبدالمجید عدم کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ ایک بار ناصر کاظمی نے عدم کے ایک شعر کی پیروڈی کر دی۔ باتوں باتوں میں پیروڈی کی صنف کا ذکر چھڑا تو ناصر کاظمی کہنے لگے "پیروڈی کے لیے کوئی توپ تو نہیں چلانا پڑتی؟ کبھی کبھی ایک دو لفظ بدلنے سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً سید عبدالمجید عدم کے ایک شعر میں ایک دو لفظ بدل دو تو سارا شعر بدل جائے گا۔ مثلاً ان کا شعر ہے:

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہیں آپ

اس شعر میں "پچھتا رہے" کی جگہ "کچھ کھا" کر دو تو ہو گئی پیروڈی:

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہیں آپ

یہ پیروڈی کسی نے عدم صاحب کو سنا دی۔ وہ غصے میں آ گئے، کہنے لگے: "ناصر کاظمی کو آتا ہی کیا ہے۔ اس سے آج تک خود ایک شعر نہیں ہوا۔ جب بھی کچھ میر کا ہے۔"

اور پھر یہ قطعہ کہہ دیا:

کوا کیوں کائیں کائیں کرتا ہے
طوطا کیوں نائیں نائیں کرتا ہے
شعر ہوتے ہیں میر کے ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

ناصر کو یہ قطعہ سنایا گیا، تو وہ کہنے لگے: "لفظ دائیں بائیں کرنا آسان کام نہیں، جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ عدم صاحب سے کہو یہ کام کر کے تو دیکھیں۔"

اس واقعے کے بعد ناصر عدم صاحب سے ذرا پرے پرے ہی رہتے۔ میں نے ایم۔ اے کیا، تو عدم صاحب نے مجھے کہا "قتیل رہبر! چلو تمھیں انکم ٹیکس انسپکٹر لگوا دوں۔"

میں نے کہا "شاہ جی! یہ میرے بس کا روگ نہیں، کہاں لوگوں کی آمدنی کا حساب کتاب پھروں گا۔"

عدم کہنے لگے "پاگل نہ بنو۔ ایک سال کے بعد گھر ہو گا اور کار بھی! فیکٹریوں والے تمھارے پیچھے پیچھے نوٹ لے کر پھریں گے۔"

مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولے "اس کا ذکر ناصر کاظمی سے نہ کرنا۔ چپکے سے کل آ جاؤ، میں تمھیں تجمل حسین کے پاس لے چلتا ہوں۔ انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔ کھڑے کھڑے تمھیں انسپکٹر لگا دیں گے۔"

میں ساری رات خواب میں نوٹ گنتا رہا۔ صبح اٹھا تو خواب کی تعبیر دیکھ کر بڑا اداس ہوا۔ ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی۔ عدم صاحب کی تجویز بتلائی۔ بہت بگڑے۔ کہنے لگے: "رشوت کی دلدل ہی میں چھلانگ لگانا تھی تو اب میں ماسٹرز کیوں کیا؟ ذہن کو زنگ لگانا چاہتے ہو، تو چلے جاؤ عدم صاحب کے ساتھ تجمل حسین کے پاس۔ مگر انسپکٹر ہو جاؤ، تو میرے پاس نہ آنا۔" پھر میرا جواب سنے بغیر چلے گئے۔

☆☆

ایم۔ اے کا امتحان دے کر میں فارغ تھا۔ نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ قتیل شفائی ان دنوں رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری تھے۔ مجھے کہنے لگے "جب تک رزلٹ نہیں آتا گلڈ میں بیٹھا کرو۔" بیٹھنے کا معاوضہ دو سو روپے ماہانہ طے پایا۔ حبیب کیفوی کے علاوہ وہاں مرزا ادیب بھی ہوتے تھے۔ ایک دن ہمدردی میں مرزا ادیب کہنے لگے:

"قتیل رہبر، ایم اے میں فرسٹ کلاس آنا بے حد ضروری ہے۔ تمھارا ایک پرچہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس ہے۔ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ ان سے سفارش کر دیتا ہوں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا "مرزا صاحب! میں ساری زندگی اس احساس میں جلتا رہوں گا کہ سید صاحب سفارش نہ مانتے، تو میں فرسٹ کلاس نہ لے پاتا۔"

میں نے مرزا ادیب کے ہمدردانہ مشورہ کا ذکر کیا، تو ناصر کاظمی کہنے لگے "مجھ سے دور رہو گے، تو ایسے ہی فضول مشورے سنو گے۔ مرزا ادیب بہت اچھے آدمی ہیں لیکن تجویز اچھی نہیں۔ سفارش کی کشتی پہ جاہل دریا پار کرتے ہیں، سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی کے چیلے نہیں۔"

باقر صاحب کے سلسلے میں ان کا رویہ اتنا سخت اور برا نہ تھا۔ حالانکہ ناصر جانتے تھے کہ ہمارا ان سے اتنا ملنا جلنا باقر صاحب کو پسند نہیں۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ یہی تھی کہ ہم ناصر کاظمی کے ساتھ رات گئے تک گھوم پھر کے اپنا وقت ضائع کرتے۔ ناصر کاظمی باقر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ چناں چہ جب کبھی ہم ان کے پاس ہوتے اور باقر صاحب آ جاتے، تو وہ ادھر ادھر ہو کر کہتے:

"تمھارے پروفیسر باقر آ رہے ہیں، ادھر ادھر ہو جاؤ، فضول میں مجھے گالیاں دلواؤ گے۔ آتے ہی برسیں گے کہ ناصر کاظمی تم میرے طالب علموں کو خراب کر رہے ہو۔"

پھر مسکرا کر کہتے:

"حالانکہ تمھارے احترام اور محبت نے میرا ایمان غرق کر دیا ہے۔"



رات کا بے نوا مسافر

ناصر کاظمی کی دل چھو لینے والی شاعری کا خوشبو سے مہکتا انتخاب

رضوان احمد



کچھ یادگار شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کر چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا

دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا

پھر کئی لوگ نظر سے گزرے
پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا

حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

وہ ساحلوں پہ گانے والے، کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے، کیا ہوئے

وہ صبح آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے، کیا ہوئے

میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے، کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں میرے ادھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے، کیا ہوئے

وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے، کیا ہوئے

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے، کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
تیرا دیا جلانے والے، کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے، کیا ہوئے

پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں

پھر کسی غم نے پکارا شاید
کچھ اجالا سا ہوا ہے دل میں

اسے ڈھونڈا وہ کہیں بھی نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں

☆☆

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگ خواب سحر گیا وہ

خوشی کی رات ہو کہ غم کا موسم نظر سے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں، مرے تو دل میں اتر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دور آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہل دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثال گرد سفر گیا وہ

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی، ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اٹھا تھا رات دل سے، نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

☆☆

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی
ان جلتی بلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے
اب شہر میں اس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جان غزل ہی نہیں
ایوان غزل میں لفظوں کے گلدان سجاؤں کس کے لیے
مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
ان خالی کمروں میں ناصر اب شمع جلاؤں کس کے لیے

☆☆

ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے
کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے، شکر کرو تو بہتر ہے
کل یہ تاب و تواں نہ رہے گی ٹھنڈا ہو جائے گا لہو
نام خدا ہو جوان، ابھی کچھ کر گزرو تو بہتر ہے
کیا جانے کیا رت بدلے حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے
کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

☆☆

پھر لہو اُبل رہا ہے دل میں
دم بہ دم کو یہ صدا ہے دل میں
تاب لائیں گے نہ سننے والے
آج وہ نغمہ چھڑا ہے دل میں
ہاتھ ملتے ہی رہیں گے گُل چیں
آج وہ پھول کھلا ہے دل میں
دشت بھی دیکھے چمن بھی دیکھا
کچھ عجب آب و ہوا ہے دل میں
رنج بھی دیکھے خوشی بھی دیکھی
آج کچھ درد نیا ہے دل میں
پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں
پھر کسی غم نے پکارا شاید
کچھ اُجالا سا ہوا ہے دل میں
کہیں چہرے کہیں آنکھیں کہیں ہونٹ
اک صنم خانہ کھلا ہے دل میں
اسے ڈھونڈا وہ کہیں بھی نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں
کیوں بھٹکتے پھریں دل سے باہر
دوستو شہر بسا ہے دل میں
کوئی دیکھے تو دکھاؤں ناصر
وسعت ارض و سما ہے دل میں

☆☆

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو
آفتوں کے دور میں
چین کی گھڑی ہے تو
میری رات کا چراغ
میری نیند بھی ہے تو
میں خزاں کی شام ہوں
رت بہار ہے تو
دوستوں کے درمیاں
وجہ دوستی ہے تو
میری ساری عمر میں
ایک ہی کمی ہے تو
میں تو وہ نہیں رہا
ہاں مگر وہی ہے تو
ناصر اس دیار میں
کتنا اجنبی ہے تو

☆☆

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

☆☆

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

☆☆

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنجِ چمن مجھ سے چھین لے
گر احترامِ رسمِ وفا ہے تو اے خدا
یہ احترامِ رسمِ کہن مجھ سے چھین لے
منظر دل و نگاہ کے جب ہو گئے اداس
یہ بے فضا علاقۂ تن مجھ سے چھین لے
گل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
گل چیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے
سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے!

☆☆

بیگم! میں تمھارا مجرم ہوں

اس شوہر کی داستانِ ندامت جسے پانی سر سے گزرنے کے بعد ہوش آیا

نیئر سلطانہ کاشف

اس نئی کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے دو ماہ ہونے والے تھے۔ لیکن اس دوران میرے اندر بھونچال سا پیدا ہو گیا۔ ایک جنگ سی میرے اندر برپا تھی۔ یوں تو یہ ہر لحاظ سے گزشتہ ملازمت سے بہتر تھی۔ تنخواہ معقول اور دفتر بھی قریب تھا۔ لیکن اس دفتر میں عبدالمتین سے ملاقات بڑی تبدیلی ثابت ہوئی۔ یہی وہ شخص تھا جو روزانہ مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی نعمت کی ناشکری کا احساس دلا جاتا۔ جی ہاں! سب سے بڑی نعمت اور بہترین متاع ”نیک بیوی“۔

جب عبدالمتین اپنی کہانی سناتا، تو دیر تک چپ رہتا۔ مگر اس کی دکھی باتیں ہوتی یا اس کا حلیہ گھر کے ماحول کی گواہی دیتا، تو میں دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگتا کہ میرے گھر میں سکون ہے۔ لیکن یہ شکر چند لمحوں ہی میں ندامت میں تبدیل ہو جاتا۔ عابدہ کے ساتھ میں زندگی کے پندرہ سال گزار چکا تھا۔ میں نے ان پندرہ برسوں میں اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اپنے باپ کو ماں کے ساتھ کرتے دیکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے بیوی کو کسی چیز کی کمی ہونے دی۔ کپڑا لتا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا ہر وہ چیز دی جو مڈل کلاس کی ہر عورت کا خواب ہو سکتا ہے۔ آخر کو وہ میرے بچوں کی ماں تھی۔ مجھے اس سے محبت بھی تھی۔ ہاں ایک چیز جو میں نے اسے کبھی دی ہی نہیں...... وہ تھی عزت!

میں جب بھی عبدالمتین سے اس کی بیوی کی زبان درازی، ناشکری اور جھگڑالو طبیعت کے قصے سنتا، میری نگاہوں میں عابدہ کے خاموش لب اور بولتی آنکھیں آ جاتیں۔ تب میں ندامت کے احساس میں گھرتا چلا جاتا۔

کاش عبدالمتین مجھے پہلے مل جاتا۔ آج بھی بس کی نشست پر بیٹھا سڑک کو بغور دیکھتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم سے وہ سڑک جیسے اسکرین میں تبدیل ہوئی اور ایک گھر کے منظر دکھانے لگی۔ کہیں لب کانپتی اور آنکھیں



جھکا جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کرتی عابدہ کا چہرہ ابھرتا اور کہیں اضطراب سے انگلیاں مروڑتی عابدہ میرے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ''جاہل عورت بے وقوف کہیں کی، چھوڑو.....'' میرے الفاظ گونجنے لگے ''تم کرتی کیا ہو سارا دن؟ کام نہ ہو تو ایک ناؤل تم سنبھال نہیں سکتی۔'' چبا چبا کر میرے ہی بولے گئے الفاظ گویا اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح پڑنے لگے۔ وہ غلطیاں بہت کرتی تھی اور عورت کو غلطی نہیں [illegible] ہے۔ وہ بھول جاتی تھی اور بھولنے والی عورت کو میں [illegible] ''

ایک ہی پل میں مجھے پسینہ آگیا۔ میں نے گھبرا کر ایک لمبی سانس لی اور نشست کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ آج فیصلہ کرنے کی گھڑی تھی، میں نے وعدہ کیا کہ گھر پہنچتے ہی عابدہ سے معافی مانگ لوں گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی آنکھیں موند لیں اور لمبی سانس لیتے ہوئے میں خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسٹاپ پر اترتے ہی میں نے گھر کی جانب [illegible] دیے۔ راستے میں پھولوں کی دکان پر نظر پڑی تو خیال آیا کیوں نہ عابدہ کے لیے پھول لے لوں؟ لیکن نہیں ان پھولوں کی بھلا کیا حیثیت، بس جلد از جلد مجھے گھر جانا اور اس سے معافی مانگنی ہے۔ بے شک میں ایک دن میں تبدیل نہیں ہو سکتا لیکن کوشش تو کر سکتا ہوں نا! اپنے آپ سے وعدے کرتے میں نے خود کو گھر کے دروازے پر کھڑا پایا لیکن اندر سے آنے والی آواز نے میرے کنڈی کی طرف بڑھتے ہاتھوں کو روک دیا ''آخر کرتی کیا ہیں آپ سارا دن! صبح میں نے اپنی قمیص دھونے دی تھی۔ حد کرتی ہیں اماں آپ بھی، میرا تو کوئی کام وقت پر ہوتا ہی نہیں ہے اس گھر میں۔''

اندر سے عبداللہ کی چیختی چنگھاڑتی آواز آرہی تھی، انداز، الفاظ اور لہجہ سبھی تو اس کا اپنا نہ تھا۔ میں نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کو کیا منتقل کر رہا ہوں۔ ''میں تو تم سے معافی مانگ لوں گا اور اپنا رویہ درست کرنے کی کوشش بھی کروں گا، لیکن تمہارا بیٹا جب بھی تلخ انداز میں تم سے بات کرے گی، تم دل ہی دل میں مجھے ہی قصوروار ٹھہراؤ گی نا؟''

دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اٹھے ہاتھ ایک دم بے جان ہو کر میرے پہلو میں آگرے۔

◆◆◆

تازہ غزل

ستم آزاد ہوتا جا رہا ہے
یہ گھر برباد ہوتا جا رہا ہے

گماں کی زد پہ آ پہنچی ہے بستی
یقیں الحاد ہوتا جا رہا ہے

پرندے شاخ پر سہمے ہوئے ہیں
چمن صیاد ہوتا جا رہا ہے

جو مردہ باد ہونا چاہیے تھا
وہ زندہ باد ہوتا جا رہا ہے

اجڑتی جا رہی ہے میری دنیا
عدم آباد ہوتا جا رہا ہے

سبق جو اہل دنیا نے دیا ہے
زبانی یاد ہوتا جا رہا ہے

جو اک حرف دعا تھا میرے لب پر
وہ اب فریاد ہوتا جا رہا ہے

(کرامت بخاری)



لوگوں کو رشد و ہدایت دینے والا

اللہ کا فقیر

ٹھاٹھ باٹ اور افسرانہ طرزِ زندگی کو لات مار کر درویش بن جانے والے ولی وقت کی ایمان افروز داستان

انیس اختر

آپؒ کا نام نامی محمد برکت علی، کنیت ابوانیس اور لقب باواجی سرکار ہے۔ آپ بروز جمعرات ۲۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو ضلع لدھیانہ کے گاؤں برہمی میں دھاریوال جٹ خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام گرامی نگاہی بخش اور والدہ محترمہ جنت بی بی تھیں۔

آپ مادرزاد ولی تھے۔ والدہ نیک خاتون تھیں جو حضور اقدس ﷺ پر کثرت سے درود بھیجا کرتیں۔ والد ماجد بھی نہایت صالح اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ فوج میں ملازم تھے۔ آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ اہل اللہ سے محبت اور خدمت ان کا وتیرہ تھا۔ اکثر ایک مجذوب کی خدمت میں حاضری دیتے جس نے شادی سے بھی قبل آپ کی آمد کی خوشخبری ان الفاظ میں دی تھی:

"نگاہیا، تیری قسمت میں تو کچھ نہیں البتہ تیرے ہاں ایک لڑکا ہوگا، بڑا زبردست۔"

یہ پیشین گوئی آپ کی ولادت باسعادت سے پوری ہوئی۔ آپ کے دادا کے دادا باباجی بندو شاہ بھی صاحب حال بزرگ تھے۔ دریائے ستلج کے کنارے (بندے) رہا کرتے، اسی مناسبت سے بندو شاہ کہلائے۔ ان کا مزار بھارت میں مندر ملیک نامی گاؤں میں واقع ہے۔ والد ماجد برہمی اور والدہ ماجدہ آدھی کوٹ ضلع خوشاب میں محو استراحت ہیں۔

آپ کی طبیعت بچپن ہی سے



نیکی کی طرف راغب تھی۔ سنجیدہ طبیعت اور خلوت پسند تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ پھر مروجہ تعلیم کے حصول کے لیے جلوارہ جانے لگے۔ گاؤں میں پہلی مسجد کی تعمیر کی سعادت بھی آپ کے حصے میں آئی۔ آپؒ کا زیادہ وقت وہیں تلاوتِ قرآن کریم اور ذکر وفکر میں گزرتا۔

سولہ سال کی عمر میں آپؒ کی شادی کردی گئی۔ زوجہ محترمہ کا نام برکت بی بی تھا جو نہایت سادہ طبیعت، نماز روزے کی پابند اور خدمت گزار تھیں۔ ان کے بطن سے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں تولد ہوئیں۔ ایک بیٹا کم سنی ہی میں فوت ہوگیا، دوسرا صاحبزادہ ۴۵ سال کی عمر میں چار بچے چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جاملا۔ دو بیٹیاں بھی وفات پاچکیں۔ تین بیٹیاں مع اہل وعیال حیات ہیں۔

فوج میں شمولیت

آپ کے والد ماجد کی خواہش تھی کہ بیٹا بھی فوج میں شامل ہو اور بڑا افسر بنے۔ جب اس خواہش کے حصول کی خاطر ۹ اپریل ۱۹۳۰ء کو فوج میں بھرتی کرانے لے کر گئے، تو عجیب بات ہوئی۔ کسی بھی میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ کے بغیر کیپٹن ڈاکٹر ایم این کھنہ نے دیکھتے ہی منتخب کرلیا۔ ابتدا میں رائل کمپنی کے لیے موزوں سمجھے گئے۔ بعد میں انڈین آرمی اسپیشل ایجوکیشن کورس پاس کرکے وائی کیڈٹ منتخب ہونے اور ہیڈکوارٹرز میں نہایت اہم اور حساس ذمے داری پر متعین کیے گئے۔ کورکمانڈر جنرل وچ آپؒ کی باوقار شخصیت کے بڑے مداح تھے اور مرحوم کو اپنا دوست گردانتے۔ عام جوانوں میں بھی آپؒ کے ظاہری حسن اور نیک نفسی کے چرچے عام تھے۔ ملازمت کا زیادہ عرصہ رزر کی چھاؤنی میں گزرا۔ کورکمانڈر نظم وضبط کی پابندی اور پیشہ ورانہ فرائض کی بجا آوری کی بدولت آپؒ سے بہت خوش تھا۔ وہ آپؒ کی سیرت و کردار کی مثالیں دیا کرتا۔ نہ صرف عزت واحترام سے پیش آتا بلکہ آپؒ کی تقلید میں رمضان المبارک کا پورا مہینا دن کے وقت کھانے پینے سے باز رہتا۔

سیرت وکردار

آپؒ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ ہمہ وقت ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہتے۔ خود فرماتے ''میں انگریزی راج میں ایک کورکمانڈر کا اہلمد تھا۔ انتہائی مصروفیت اور بے پناہ ذمے داری کے باوجود بلاناغہ ہر روز نیم روز (دوپہر) سے پہلے گیارہ ہزار مرتبہ اسما الحسنیٰ اور بعدازاں بارہ ہزار مرتبہ اسما النبی ﷺ باقاعدگی سے پڑھا کرتا۔''

رزر کی کینٹ میں قیام کے دوران روزانہ پیدل پیران کلیر شریف حاضری دیتے۔ افسرانِ بالا اس امر سے آگاہ تھے مگر وہ کبھی مزاحم نہ ہوتے۔ بلکہ جنرل وچ نے کہا ''کیسی عمدہ بات ہے کہ آپ پیران کلیر شریف جاتے ہو، کنجریوں کے بازار نہیں۔''

آپؒ روزِ ازل سے اللہ کے سپاہی تھے۔ جب حالات نے آپؒ کو دنیاوی سپاہی بنادیا، تو آپ نے فوج کے ڈسپلن کی مکمل پابندی کی۔ شب وروز نہایت انہماک کے ساتھ مصروف رہتے۔ فوجی فرائض میں مصروفیت دراصل مستقبل کے مجاہدے کی تمہید تھی۔ مجاز کا پردہ حقیقت کی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ آپؒ کی باوقار شخصیت کے متعلق کورکمانڈر ہر تین ماہ بعد جنرل ہیڈکوارٹر میں رپورٹ بھیجتا: ''برکت علی ہماری فوج کا سب سے باکمال اور ایماندار فرد ہے۔''

بیعتِ طریقت

آپ نے شاہِ ولایت، حکیم امیر الحسن سہارنپوری کے ہاتھ پر ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ بروز جمعرات پیران کلیر شریف میں بیعت فرمائی۔ حکیم صاحب نے فرمایا ''میں نے پایا'' جب آپ نے کمر دبائی تو کہا: ''پنجابی نے لے لی، پنجابی کو دے دی۔'' (جس کی قسمت میں تھی، وہ لے گیا۔)

(واضح رہے کہ حکیم صاحبؒ کے پیر حضرت قاری شاہ عبدالکریمؒ نصیر پور، ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔)

حکیم صاحبؒ آپ سے بہت شفقت فرماتے۔ اکثر ''میرا چاند'' کہہ کر پکارتے۔ بلانا ہوتا، تو کسی کو کہتے ''ارے، فوج والے کو بلاؤ۔''

فوج سے سبکدوشی

آپ اگر فوج میں رہتے، تو جرنیل کے رینک تک جاسکتے تھے لیکن آپ نے ہر دنیاوی شے پہ لات مار کر اللہ کا فقیر بننا پسند کیا۔ ٹھاٹھ باٹ اور افسرانہ طرزِ زندگی پر فقر و درویشی کو ترجیح دی۔ حضور اقدس ﷺ کی اس سعید و رشید منزل پہ گامزن ہونے کے لیے ۲۲ جون ۱۹۴۵ء کو فوج سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آپ نے سرکاری وردی بدن سے اتار کر کرتا شلوار پہنا اور اعلان کر دیا ''بندہ اب انگریزی حکومت کا ملازم نہیں رہا، اللہ کے در کا فقیر ہے۔ حکومت جو بھی سلوک مجھ سے کرے، تیار ہوں۔ میں نے اپنا کورٹ مارشل خود کر لیا اور کبھی سزا میں قبول کر لیں۔''

اس فیصلے پر سبھی انگشت بدنداں تھے کیونکہ جنگِ عظیم دوم کا زمانہ تھا۔ اتحادیوں کو ایک ایک سپاہی اور افسر کی اشد ضرورت تھی۔ ان حالات میں ایک افسر کا فوج سے مستعفی ہونا اپنی جان سے کھیلنا تھا۔ فوج کے افسران نے دلجوئی، سہولت اور مروت کا ہر حربہ آزمایا، مگر آپ اپنی بات سے نہ ٹلے۔ بالآخر کٹھن مراحل طے کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ انگریز حکومت میں کسی راجے مہاراجے کو بھی انحراف کی جرأت نہ تھی چہ جائیکہ اتنا بڑا اقدم.....

یومِ استقامت

سرکار اس دن کو ہمیشہ یوم استقامت کے نام سے یاد فرمایا کرتے۔ آپ نے اپنی تصنیف ''مقالاتِ حکمت'' میں لکھا:

''دیکھنے والا دن تو وہ دن تھا۔ عزم استقامت سے آراستہ ہوا، بال بال سے خمار ٹپکنے لگا، لہرا لہرا کر چلا، اٹھلا اٹھلا کر بڑھا، غفلت کے پردے چاک کر کے، علائق کی زنجیریں توڑ کر، ہر شے سے منہ موڑ کر، موت و حیات سے بے نیاز اپنی منزل کی جانب دیوانہ وار بڑھتا چلا گیا۔''

تین بنیادی مقاصد

آپ سیدھے کلیر شریف پہنچے اور وہاں تین کام کرنے کا وعدہ کیا۔ ان کا ذکر آپ نے دارالحکمت کی افتتاحی تقریب میں فرمایا:

''چالیس سال گزرے، میں نے حضرت سیدنا مخدوم علاؤالدین علی احمد صابر کلیری قدس سرہ العزیز کے حضور پیش ہو کر قول کیا کہ میں دنیا و مافیہا سے کلیتاً دستبردار ہو کر اپنی باقی ماندہ زندگی اللہ کے کاموں کے لیے وقف کرتا ہوں۔ چناں چہ میں نے تین کام کرنے کا عہد کیا:

☆ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر

☆ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ

☆ اللہ کی مخلوق کی بے لوث خدمت

یہ وعدہ بھی کیا کہ جس دنیا سے آج متنفر اور بیزار ہو کر اللہ کی طرف آیا ہوں، جب تک زندہ رہوں گا، اللہ کی قسم، اس کی کوئی بھی چیز کسی بھی رنگ میں کبھی قبول نہیں کروں گا۔''

قیام پاکستان اور ہجرت

یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کی رشد و ہدایت اور دینی راہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے لیے منتخب کر لیا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ ۲۷ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان تشریف لائے اور متعدد جگہوں سے ہجرت کرتے ہوئے ضلع فیصل آباد میں سالار والا ریلوے اسٹیشن کے قریب ڈیرا لگایا۔ یہ رقبہ آپ کو والد مرحوم کی زرعی اراضی کے عوض ملا تھا۔ یہ علاقہ ایک ویران جنگل تھا۔ وہاں آپ نے مسلسل چالیس سال لگا کر

جد و جہد کی۔ شب و روز ذکر و فکر، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق میں مصروف رہتے حتیٰ کہ یہ جگہ ذکر الٰہی کی صداؤں سے گونجنے لگی اور طالبان حق جوق در جوق یہاں پہنچنے لگے۔ اس جگہ آپ نے خوبصورت وسیع مسجد، مدرسہ، قرآن کریم محل، منار اصحاب بدر، لائبریری اور دار الحکمت تعمیر کرائے اور ادارہ دار الاحسان کے نام سے موسوم فرما کر وقف اسلام کر دیا۔

آپ اپنے آپ کو ''المہاجر الی اللہ، والمتوکل علی اللہ العظیم'' فرمایا کرتے اور آپ نے اپنے ان اقوال کو عملاً ثابت بھی کیا۔ ''مہاجر الی اللہ کسی سامان کا پابند نہیں ہوتا، تسبیح اللہ کی راہ میں سفر کیا کرتا ہے۔ صاحب توکل کے لیے نہ وطن ہے نہ جائداد، نہ نسب نہ روزگار، مال نہ اولاد۔ صبح کرے، تو شام کا اور شام کرے، تو صبح کا نہ ذخیرہ رکھے اور نہ ہی زندگی کی امید۔'' ''خواہشات کی قربانی سب سے بڑی قربانی ہے اور نسیح اللہ ہی خواہشات کو قربان کر سکتا ہے، وہی دار ہیں۔''

ذکر و تبلیغ

ناظم کائنات نے انسانیت کی رشد و ہدایت کا کام بعد از انبیا علیہم السلام اپنی درگاہ کے فقیروں کے سپرد کیا۔ ان کے دم قدم سے ہر چار روشنی پھیلی، دلوں کی دنیا آباد ہوئی اور روح و نفس، قلب و جسد میں نکھار آیا۔ انہی کی وجہ سے خیالات فاسدہ کی بیڑیاں کٹیں اور انسان لامکاں کی بلندیوں تک پہنچا۔

آپ صاحب کمال و صاحب حال بزرگ تھے اور روحانی اقدار کے نقیب بھی۔ شب و روز اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کے علاوہ انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے۔ لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب دیتے۔ آپ کہتے: ''بندے کی سب سے بڑی خدمت بندے کو دین کی طرف بلانا اور اللہ تعالیٰ کی راہ پہ چلانا ہے۔''

آیات قرآنی

☆ تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے، جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔ (سورہ البقرہ)

☆ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدل کر لانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورہ آل عمران)

آپ نے اس ہدایت و راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔ تبلیغ و خدمت کے لیے وہ گوشے بھی تلاش کیے جہاں تک کسی کی سوچ بھی نہیں جا سکتی تھی۔ انہی میں نومسلم جنگل نشین و چنگڑ وغیرہ جو صدیوں سے جنگلوں بیابانوں کی خاک چھانتے رہنے کے باعث آج کی دنیا سے ہزاروں برس پیچھے تھے، حالت کفر سے دامن اسلام میں داخل ہوئے۔ اس طرح آپ نے ان لوگوں کو جینے کا حوصلہ دیا جو دھتکارے جا چکے تھے۔ انھیں سینے سے لگایا جن سے کوئی بات تک کرنا گوارا نہ کرتا تھا۔ آج وہی جنگل نشین دینی و دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر میں مشغول ہیں۔

روحانی نظام تربیت سے فیض یاب ہو کر ہزاروں فرزندان اسلام اطمینان قلب کا سامان مہیا کرنے لگتے۔ طالبان طریقت ہر ماہ اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ کیمپ دار الاحسان میں سہ روزہ حاضری کے لیے آتے اور آپ کی فیض رساں شخصیت سے روحانی و دینی فیض پاتے۔ دینی تبلیغی جماعتوں کے کارکن دار الحکمت (اسپتال) میں مریضوں کی خدمت کی سعادت حاصل کرتے۔

خدمت خلق

حضرت ابوانیس محمد برکت علی سرو نے ذکر الٰہی اور دعوت و تبلیغ الاسلام کے ساتھ ساتھ مخلوق کی خدمت کا بھی حق ادا کر دیا۔ آپ نے فرمایا ہے: ''خدمت وسیع المعنی منزل ہے، نہ اس کی حد ہے اور نہ اس تک رسائی کہ جہاں تک کوئی پہنچے۔ شب و روز جاری و ساری رہتی ہے۔''

آپ نے معذوروں، مفلوک الحال بیوگان و مساکین اور نادار طلبہ کے لیے وظائف مقرر کیے۔ غریب لڑکیوں کی شادیوں کے انتظامات کرتے۔ قیدیوں اور کوڑھیوں کے لیے خاص انتظام ہوتا۔ سردیوں میں بستر، آٹا، کپڑا وغیرہ بیوگان کو گھروں میں پہنچاتے۔ بیمار مخلوق کی بے لوث خدمت کا جو نمونہ دارالحکمت المعروف بہ دارالشفا کی صورت پیش کیا، اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

آپ نے دارالاحسان میں شعبہ دارالاقامت قائم کیا۔ دیسی دواؤں سے روزمرہ علاج کے علاوہ آنکھوں کے علاج کے لیے سال میں دو مرتبہ فری آئی کیمپ کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مریض کو اپنا محسن اور اللہ کا مہمان سمجھ کر اس کی خدمت کو سعادت جانا اور کسی سے ایک پائی تک وصول نہ کی۔

ملی پیغام......اتحاد بین المسلمین

آپ کا مسلک صلح کل تھا۔ آپ پوری زندگی اتحاد امت کے لیے کوشاں رہے۔ آپ کی تحریروں میں محض محبت ملتی ہے، نفرت اور تفرقہ پروری کا ایک کانٹا بھی نظر نہیں آتا۔ آپ کا کہنا تھا: ''ہر شے اپنے محور کے گرد گھوما کرتی ہے، دارالاحسان کا محور عشق محمد ﷺ اور اتحاد بین المسلمین ہے۔ یہی ہر مذہب کی جان اور یہی وقت کی پکار ہے۔''

تصانیف و تالیفات

آپ علم و حکمت کا سمندر تھے۔ بے شمار تصانیف و تالیفات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان میں کتاب ''المسند بالسنۃ المعروف بہ ترتیب شریف'' مسند احادیث کی ایسی خوبصورت فقہی ترتیب ہے جس کی نظیر ذخیرۂ احادیث میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ ضخیم تالیف کتابت و طباعت میں بھی اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شاہان عالم کو یہی کتاب تحفتاً پیش کی گئی تو وہ بھی اس کی علمی اہمیت اور حسن طباعت کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ کتاب اسلامی دنیا کی تقریباً سبھی یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں موجود ہے جہاں سے دنیا بھر کے علما، فضلا اور ریسرچ اسکالرز استفادہ کر رہے ہیں۔

اللہ کا فقیر

آپ اللہ کے در کے فقیر تھے۔ آپ کو فقر کی وہ دولت حاصل تھی جس کے لیے حضرت ابراہیم ادھمؒ کو چالیس شہزادوں کی بادشاہت کو خیرباد کہنا پڑا اور جس کے متعلق حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَالْفَقْرُ مِنِّیْ ''فقر میرا فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔''

اللہ کا یہ فقیر فقر کی آبرو بن کر استغنا کی علامت بنا۔ جس نے فقیری میں شاہی کی اور آنے جانے والوں کو دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و دولت سے بے نیازی کا سبق دے کر یہ ثابت کر گیا کہ فقیر صرف اپنے اللہ کے در کا فقیر ہوتا ہے۔

مسافرانہ زندگی

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے: ''دنیا میں یوں رہو گویا تم ایک پردیسی ہو یا ایک مسافر جو کسی راستے سے گزر رہا ہو۔ اور اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو۔''

آپ نے بھی ساری زندگی مسافروں کی طرح گزاری۔ کل کے لیے کوئی بھی شے بچا کر نہ رکھی۔ آپ کے منتخب اقوال درج ذیل ہیں:

☆ مسلمان کا مسافر کی طرح رہنا چاہیے۔ یہی دین اسلام ہے۔

٭ جہاں سے تو آیا ہے، وہیں جانے کا سفر اختیار کر۔ آتے وقت تیرے پاس کچھ نہ تھا، جاتے وقت بھی کچھ نہ ہو۔

٭ مسافر کی کائنات ایک پوٹلی میں بند ہے۔ اس سے زیادہ نہ رکھ سکتا ہے اور نہ ضرورت ہے۔ رنگا رنگ مرلی آوازوں سے جنگل میں منگل بنائے رکھتا ہے۔ جو رزق دیا جائے کھانے کے بعد عام مخلوق میں تقسیم کر دیتا ہے۔ کل کے لیے نہ ذخیرہ، نہ فکر، نہ ہی زندگی کی امید۔

٭ آج کا کھانا کھا چکنے کے بعد کل کے لیے کوئی بھی شے نہیں رکھنا۔ میری طریقت کا اصول ہے جو کبھی نہیں بدلا اور نہ کبھی بدلے گا۔ زندہ رہا، تو کل کی روزی کل ملے گی۔

جب متلاشیِ حق کو یہ ایمان حاصل ہو جائے، تو وہ ہر شے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھتا اور نہ ہی کوئی منصب اس کی نظروں میں ذرہ بھر وقعت رکھتا ہے۔

خانقاہی نظام

فقر و درویشی اور خانقاہی نظام کا اعلیٰ معیار قائم کرنے میں حضرت ابوانیس محمد برکت کی خدمات تاریخ تصوف کا سنہرا باب ہیں۔ آپ نے کوئی رات اس حالت میں بسر نہیں کی کہ سامان دنیا کا کوئی حقیر سا حصہ بھی محفوظ رکھا گیا ہو۔ اس مجاہد نے فقر کی موجودہ تاریخ کو بدل کر رکھ دیا اور فقر بوذر و فقر حیدری کے مقلد بن کر قرون اولیٰ کی تمکنت کا مظاہرہ کیا۔

آپ فرماتے تھے: ''خانقاہی نظام یہ تھا اور ہے: آج کا رزق آج ہی تقسیم ہو، کھانا کھلا، بچا کر مت رکھ، کل کی روزی کل ملے گی۔ خانقاہی نظام میں اللہ اللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی اور صاحب کی بابت، تو میں کچھ نہیں جانتا، البتہ میں اس نظام کا پابند ہوں۔''

وراثت

آپ نے کوئی گدی نشین نہیں چھوڑا اور نہ ہی کوئی وارث۔ یہ وہ خوبی ہے جو انبیائے کرام کی سنت تازہ کرتی ہے۔ کسی نبی نے دنیاوی جائیداد نہیں چھوڑی۔ نبی کی وراثت علم، عمل، صالحیت اور تقویٰ ہے۔ جو اس کا حامل ہو وہی وارثِ علوم نبوت ہوگا۔

ایک بار آپ نے فرمایا: ''فقیر کی میراث کا وارث فقیر ہوتا ہے اور فقیر کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا، مگر اللہ اور صرف اللہ۔ سلوک کی منزل تقویٰ کی راہ ہے۔ اس وادی میں باتیں اگرچہ کتنی حکمت بھری ہوں، کوئی رنگ نہیں لا سکتیں۔ جو کام روئے زمین کی باتیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں، تقویٰ کی ایک مثال کر سکتی ہے۔ جتنی باتیں کی جاتی ہیں، کرنے والوں کا ان پر اپنا عمل نہیں ہوتا۔ ایسی باتوں کا کیا فائدہ؟ کسی تقویٰ کا نمونہ پیش کر، باتیں سامعین کو مطمئن نہیں کر سکتیں۔

وصیت

آپ کا ارشاد تھا: ''ہمارے تین کام ہیں، ذکرالٰہی، تبلیغ الاسلام، اور مخلوق کی بےلوث خدمت۔

ان تین کاموں کے سوا کسی چوتھے کام میں کبھی مشغول نہیں ہوتا۔ جو ان کاموں میں لگ جائیں، وہ کسی کے تبصرے، تنقید، تنقیص یا الزام کا ہرگز برا نہ منائیں، نہ مشتعل ہوں بلکہ پوری یکسوئی سے اپنے تین بنیادی مقاصد کی طرف متوجہ رہیں۔

ادارے کا انتظام و انصرام

آپ کا ارشاد تھا: ''ادارہ کسی کا ذاتی گھر نہیں فلاح و بہبود کا مرکز ہوتا ہے۔ وفادار جانثار رضاکار مرکز کی آبرو ہوتے ہیں۔ یہ دارالاحسان بھی ایک روحانی اور متحرک ادارہ ہے، قیام و قیود حدود سے بالاتر۔ اس کی ہر شے میری یا کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کی مخلوق کی بےلوث خدمت کے لیے کلی طور پر مخصوص ہے۔

اس بین الاقوامی دینی و رفاہی ادارے کے جملہ شعبہ جات کو طے شدہ دستورالعمل کے مطابق چلانے کی خاطر آپ نے اپنے آپ کو ادارہ کا مہتمم فرمایا۔ نائب مہتمم میں محمد شفیع گوندل کو رکھا پھر نہایت ہی احسن طریقے سے تادم آخر اپنے عملے کے مخلص ارکان و معاونین کے ساتھ اس کا انتظام سنبھالا۔

آپ فرماتے تھے: بہترین عملہ بہترین معاون ہوتا ہے۔ جو تیری منزل میں تیرا معاون نہیں، تیرا کچھ بھی نہیں اور نہ ہی تو اس کا۔

آپ کی رحلت کے بعد قدرتی اصول کے مطابق میاں محمد شفیع گوندل مہتمم بن گئے۔ انھوں نے میاں محمد نجیب اللہ کو اپنا نائب مہتمم مقرر کرلیا۔ یوں سارا انتظام مرحوم کے قائم کردہ دستورالعمل کے مطابق کیمپ دارالاحسان میں جاری و ساری رہا۔

روزمرہ معمولات

آپ کی زندگی انتہائی سادہ اور غیر ضروری تکلفات سے کلیتاً پاک تھی۔ خوراک میں تکلف نہ لباس میں، نشست و برخاست میں رکھ رکھاؤ نہ میل جول میں۔ موٹے کھدر کا لباس پہنتے۔ سردیوں میں سر پر عمامہ اور گرمیوں میں ٹوپی ہوتی۔ ننگے پاؤں پھرتے، صرف طہارت اور وضو کے لیے معمولی چپل پہنتے۔ کھانے میں جو مل جاتا، کھا لیتے۔ لنگر کی خشک روٹی لسی کے ساتھ شوق سے تناول فرماتے۔ عمدہ کھانوں یا میوہ جات سے رغبت نہ رکھتے۔ بعض اوقات کئی کئی روز بغیر آرام کیے معمولات میں محو رہتے۔ خود فرمایا: ''رات کو نہیں، جب تھک جائیں، سو جاتے ہیں۔'' آپ زندگی اور بندگی میں ڈسپلن کے سختی سے قائل تھے۔ اپنے اوقاتِ کار کو منٹوں اور سیکنڈوں تک میں منظم اور منضبط کیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو پسند نہ کرتے جو آتے، تو جانے کا نام نہیں لیتے۔

حالتِ ضعیفی سے پہلے رمضان المبارک کے علاوہ رجب المرجب کا پورا مہینہ بھی روزے رکھا کرتے۔ حسنات و خیرات و صدقات کو مطلق جمع نہ فرماتے۔ ملتے ہی مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ فرماتے ''میری دنیا، دین اور آخرت کی کمائی بیوہ، لاچار و بیمار اور میرے آقا روحی فداہ ﷺ کی امت کے مردوں کی مغفرت کے لیے وقف و مخصوص ہے۔'' شب و روز کی کمائی مخلوق ہی نے کھائی۔ نہ حسنات کا ذخیرہ نہ کمائی کا، ہر دو سے فارغ ہوں۔ فقیر ہر حال میں فقیر ہوتا ہے۔

وصال و تدفین

سرکارؒ کا کہنا تھا: ''حضرت گرامی، میرا اس دنیا میں رہنا ایک مسافر کی طرح ہے۔ مسافر کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا مگر ضرورت کا بالکل ہی مختصر سا سامان میں اپنے تئیں ان مردوں میں شمار کرتا ہوں جو قبروں میں ہیں۔ مردوں کی کوئی طلب و تمنا نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ زندگی بخشے اور وہ دنیا میں جا کر شب و روز اس کے ذکر و فکر و شکر میں محو و منہمک رہیں۔''

بلاشبہ آپؒ شب و روز ذکر الٰہی میں محو و منہمک رہے۔ اسی ذکر و شکر کی حالتِ محویت میں امرِ الٰہی آن پہنچا۔ آپ ۱۷ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ بمطابق ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ء بروز اتوار بوقت ظہر مالک حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون. اللھم الرفیق الاعلی

آپؒ کے وصال کی خبر آناً فاناً پوری دنیا میں پھیل گئی۔ نماز جنازہ کا وقت اگلے روز نمازِ عصر کے بعد رکھا گیا۔ بیرونِ ممالک سے پہنچنے والے عقیدت مندوں کے علاوہ ملک بھر سے آپ کے چاہنے والے لوگوں کا انبوہِ کثیر تھا جو اللہ کے اس فقیر کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے آیا۔

(مصنفہ صوفی برکت علی کی صاحب زادی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد پہ یادگار مضمون قلم بند کیا۔)

اوئے میریا سوہنیا پترا!

وہ بچوں کو پیار سے تھامنا چاہتا تھا مگر حکم حاکم مرگ مفاجات نے اُسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا

فرخندہ لودھی

برگد کے نیچے وہ بہت دیر سے کھڑا تھا۔ مینہ کی بوندیں پتوں پر ٹپ ٹپ، بے تال گر رہی تھیں۔ چلتی ہوا میں کوئی شور نہیں۔ ڈالیوں پہ پرندے پر سمیٹے، سکڑے بیٹھے، مطلع صاف ہونے کے انتظار میں ہیں۔ زندگی کی چہل پہل جیسے کچھ سوچنے کے لیے تھم گئی ہے۔ گیلی، کالی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں اور سائیکل سوار بھیگتے ہوئے گزرتے۔

''اوئے چاچا! کھڑا کھڑا سوں گیاں ایں پوستیا؟''
(اوئے چاچا، کھڑے کھڑے سو گیا ہے افیمی)

منیب نے قریب آکر لٹھ زمین پر مارتے ہوئے کہا اور اپنی داڑھی سے پانی کی ننھی بوندیں جھاڑیں۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

''نہیں... میں سوچ رہا تھا۔'' ابراہیم رک کر بولا۔



"نہیں... میں تو کچھ بھی نہیں سوچتا۔"

اس نے درخت کے چبوترے سے پرے، [illegible] منزلہ عمارت پہ جھکے آسمان کو دیکھا... بادل امنڈ کے آیا تھا اور بارش تھمنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ وقفے وقفے کے بعد ماحول پر خاموشی مسلط ہو جاتی۔

منیب نے بادلوں کی طرف دیکھ کر کہا "کاش یہ بارش ہوتی رہے تاکہ ہمارے سر پہ آئی بلا ٹل جائے ورنہ ہمارے یہاں کھڑے ہونے کا فائدہ؟"

"ہاں کیا فائدہ...؟"

ابراہیم کا دماغ اب بھی غیر حاضر تھا۔ منیب اپنی برساتی ٹھیک کرتا چلا گیا۔ اسے اگلے ناکے پر جانا تھا۔ عمر، عہدے اور مزاج کے تفاوت نے بھی منیب کو رکنے نہ دیا۔ ابراہیم کے پاس کھڑے ہونے میں اسے سبکی محسوس ہوتی۔

منیب کے جاتے ہی ابراہیم اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے ہمیشہ یہ بات کھٹکتی... منیب [illegible] کیا؟ تھا تو اس کے سامنے چھوکرا ہی۔ کمتر عہدہ ہونے سے عمر کا تجربہ چھٹ تو نہیں جاتا۔ اس کے چہرے پر مسکینی بھری بیزاری تھی اور سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے... وردی کے بغیر ابراہیم خاصا معقول اور معزز دکھائی دیتا۔ چہرے میں ایک طرح کا وقار اور آنکھوں میں سادگی کی چمک تھی۔ فقط سپاہی کی وردی پہن کر وہ چھوٹا اور معمولی نظر آنے لگتا۔ اسی لیے اسے وردی سے چڑ تھی۔

وردی شخصیت پر خول چڑھا دیتی، ناآسودہ روح اس کے نیچے دبی ہوئی تلملاتی رہتی۔ اسے ہر طرح کے خول سے نفرت تھی۔ وہ سب سے ادنیٰ درجے کا ملازم... ایک عام سا انسان... سب کچھ سوچتا تھا۔

امید کے خلاف بوندیں بالکل تھم گئیں۔ وہ درخت کے چبوترے سے اتر کر پیادہ راہ پر آ گیا۔ بادلوں میں بجلی کی لہر اب اور تب لپک جاتی۔ فضا میں گیلی مٹی کی باس تھی۔ ابراہیم نے لمبی سانس لی۔

گھاس کی پتیوں پر ٹکے پانی کے موتی ہوا کے ایک نرم جھونکے یا ہلکی آہٹ سے بکھر جاتے۔ قدرت کتنی حسین ہے مگر زندگی کتنی مختصر... پانی کے موتی کا وجود کس قدر عارضی مگر جدا ہے۔

ابراہیم کو خیال آیا اور اس نے اپنا پاؤں کیاری سے ہٹا کر پیادہ راہ کی سخت سطح پر رکھ دیا۔ سکوت میں ڈوبا شہر کبھی کبھی اونچی سانس لینے لگتا۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ "شہر جاگ رہا ہے، ایسے وقت بھی کوئی سوتا ہے!" اسے منیب کی بات یاد آئی۔ وہ بالکل چوکنا کھڑا تھا۔ معاً اس نے دور کھڑے ساتھی کو بآواز بلند پکارا اور کہا:

"سنتے ہو، وہ آ رہے ہیں..."

مصنفہ سے ملیے



اردو اور پنجابی کی معروف افسانہ نگار، فرخندہ لودھی ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو ہوشیار پور، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو لاہور چلی آئیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہوئیں۔ ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھنے لگیں۔ پہلا افسانہ ''پارنی'' کے نام سے ''اوراق'' میں ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ناول بھی تحریر کیے۔ آپ نے مئی ۲۰۱۰ء میں وفات پائی۔

"ہاں ہاں..... ہاں چا چا....." دوسرے سپاہی نے جواب دیا اور ساتھ ہی گالی لڑھکا دی۔ وہ وہاں کھڑے اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔

"مینہ آئے یا آندھی..... وہ رکیں گے تھوڑی۔" ابراہیم نے آہستہ سے کہا اور آسمان کی سمت منہ اٹھا کے دعا مانگنے لگا۔ جیسے خدا بادلوں میں بیٹھ کر نیچے اور قریب آ گیا ہو:

"اللہ اس زور کی برکھا کر کہ راستے پٹ جائیں..... دیکھ تیرے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس زور کا بادل گرجا اور بجلی کڑکی کہ ابراہیم کا رائفل پر رکھا ہاتھ لرز کے کھسک گیا۔ اب اسے پورا یقین تھا کہ بارش ہو گی اور زور دار۔ وہ اطمینان سے راہگیروں، سائیکلوں اور موٹروں کو گزرتے تکتا رہا۔

بارش رکنے سے ٹریفک تیز ہو گئی، لوگ بھاگے جا رہے تھے۔ وہ بھی کیوں رکیں گے؟ ہر چیز رواں تھی، کوئی کسی کے لیے نہ رکتا۔ حتیٰ کہ ابراہیم بھی اپنی سوچ نہ روک سکا..... کسی کو روکنا، کسی کا منہ بند کر دینا آسان نہیں۔

ابراہیم نے سر سے پاؤں تک ٹھنڈی لہر گزرتی محسوس کی اور بڑبڑایا "آوازیں قریب سرکتی آتی ہیں۔"

ایک ایک کر کے کئی سنتری سروں پر فولادی ہیلمٹ لیے جمع ہو گئے۔ وہ وہاں سے پھر کھسک آیا اور برگد کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ "کیا وہ بزدل ہے؟" ابراہیم نے اپنے جذبات کا تجزیہ کیا۔ ہاں وہ بزدل ہی تو ہے۔ عسرت کی زندگی اور سات بچوں کی کفالت نے اسے ناکارہ بنا چھوڑا ہے۔ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ان کے سینے میں دل ہے اور سر میں دماغ بھی لیکن دونوں نے آپس میں سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ وہ ابراہیم کو صرف زندہ رکھنے کے لیے کام کریں گے۔ ابراہیم اس سے سوا چاہے، تو وہ کچھ نہیں سمجھیں گے۔ اچانک کڑکتی ہوئی آواز آئی:

"تیار ہو....."

ابراہیم کے ذہن نے جواباً "یس سر" کہا۔ وجود نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا بھاری پاؤں زمین پر پٹخا۔ سب انسپکٹر نے تیار رہنے کا حکم چھٹی بار دیا تھا اور ہر بار اس کے اعصاب پر ایک کوڑا سا پڑ جاتا۔ اعصاب تن جاتے۔ اعصاب کو تناؤ کی عادت کبھی نہیں پڑتی، ہر جھٹکے پر نیا درد محسوس ہوتا ہے۔

ہوا کے جھونکوں کا بہاؤ بڑھ گیا۔ ٹھنڈک اوورکوٹ میں سے گزر کر بدن میں چبھتی جاتی۔ ابراہیم نے اپنے آپ کو مزید سکیڑا۔ پیادہ راہ کے اوپر چبوترے کے آس پاس لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بت بنا کھڑا رہا۔ رائفل پر اس کی گرفت ڈھیلی تھی۔ لوگ کھنکار کر اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے۔ وہ نفرت اچھال رہے تھے جو اس کے اور محکمے کے خلاف وقتی طور پر ان کے دلوں میں جاگزیں تھی۔ وہ گالیاں بھی بکتے مگر ابراہیم کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عادی تھا، ان کی پروا نہ کرتا..... لوگوں کی پروا کون کرتا ہے!

ایس پی کی جیپ سڑک پر سے دندناتی گزر گئی۔ دور سڑک کے دوسرے سرے پر ہجوم کے الاؤ سے شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ لوگ گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ ابراہیم کا جی چاہا وہ وردی پھاڑ کر کہیں بھاگ جائے۔

"ہائے ہائے..... ہائے ہائے۔"

آواز قریب ہونے لگی۔ ابراہیم نے اپنے رویہ پر ملامت کی..... بھلا جذباتی ہونے سے فائدہ!..... بارش کے بڑے بڑے قطرے پھر گرنے لگے۔ لوگ ہر طرف سے سمٹ کر برگد کے نیچے آ گئے۔ وہ بیچ میں مجمع باز کی طرح کھڑا تھا، مگر خاموش..... لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے.....

چاروں اور سے بولتی، بتاتی، پوچھتی پھاڑتی نظریں اور وہ نظروں کے متلاطم سمندر میں نڈھال اور بے حال کھڑا سوچتا تھا "میں یہ سمندر عبور نہیں کر سکتا۔ اس کو روک بھی نہیں پاؤں گا۔ اس سے تو بہتر ہے، میں مر جاؤں۔"

لیکن ابھی مرنے کے دن نہیں تھے۔ ابھی اس کا کوئی بیٹا

عملی زندگی میں آنے کے قابل نہیں ہوا۔ بڑا بیٹا پڑھ لکھ کر کمانے لگے، تو مرنا کیا جینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ ابھی مرنے کی فرصت نہیں ... بس ذرا اللہ تعالیٰ برکت دے۔ برکت کی بات سے وہ سارے یوٹیلٹی بل یاد آئے جو مجبوراً اسے اپنانے پڑتے اور "برکت" کی پری دور ہی سے پر پھڑپھڑاتی ادھر اُدھر نکل جاتی۔

☆☆

وہ اسٹیشن کے باہر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ سواریاں بوچھاڑ کے مانند پڑتی تھیں۔ دوسرے دن عید تھی!! اور وہ ذمے دار شفیق باپ تھا۔ اس نے باقی ہم پیشہ دوستوں کی طرح قلیوں اور تانگے والوں سے دو آنہ پھیرا پر بات طے کر لی تھی۔ قلی تانگے میں سامان رکھ کر زیادہ اجرت کا مطالبہ کرتا اور تکرار ہوتی۔ تانگہ چل پڑتا۔ قلی پیچھے ساتھ گھسٹنے لگتا۔ مسافر غصے سے الجھتے ہوئے ڈانٹتے:

"چھوڑے گا یا نہیں۔ بلاؤں پولیس والے کو"

قلی اینٹھ جاتا۔ لوگ جمع ہونے لگتے۔ پیلے پیلے قلی کھیسیں نکال کر ہنستے۔

"پولیس پولیس ..." مسافر چلاتا اور ابراہیم اپنی جگہ سے کچھ اس طرح بھاگ پڑتا جیسے وہ چابی والا کھلونا ہو۔

"چل تیرا چالان ہوگا۔ بدمعاش" وہ ڈپٹ کر قلی کو رعب دکھاتا۔

"بادشاہو! معاف کر دو کل عید اے۔" قلی بصد لجاجت کہتا۔

"اوئے چل عید دیا پترا ..." ابراہیم چھڑی ہوا میں گھما کر جھپٹتا گویا قلی کی چمڑی ادھیڑ دے گا۔ مسافروں کے دل پسیج جاتے۔ چند اور سکے مسافر کے ہاتھ سے قلی کے ہاتھ میں آ پہنچتے۔ ابراہیم کی جیب میں بھی چونی پکی ہو جاتی۔ اکثر لوگوں کے دلوں میں نفرت پکی ہوتی رہتی۔

☆☆

ایک بزرگ نے کہا

☆ والدین کے چہروں پر محبت سے نگاہ کرنا بھی عبادت ہے۔

☆ عارف کا کم ترین درجہ یہ ہے کہ اس میں صفات حق پائی جائیں۔

☆ کوئی کیسا ہی برا ہو، نیکوں کی صحبت اس کی برائیوں کو ضائع کر دیتی ہے۔ اور خواہ کوئی کیسا ہی اچھا ہو، بروں کی صحبت اسے برا بنا دیتی ہے۔

☆ چھوٹی ندیوں اور نہروں کا پانی شور مچاتا ہے لیکن جب وہ دریا میں مل جائیں تو ان کا شور ختم ہو جاتا ہے۔

☆ جو شخص جھوٹی قسم کھاتا ہے وہ اپنے گھر کو ویران کر دیتا ہے اور اس کے گھر سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔

☆ جسم کی صحت کم کھانے، روح کی صحت کم سونے میں ہے جبکہ قرب الٰہی بہت رونے سے حاصل ہوتا ہے۔

(خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ)

آج وہ یہاں کھڑا تھا۔ آج اُس کی ڈیوٹی جلوس پر لگی تھی۔ بچوں نے ہنگامہ کر رکھا تھا۔ بچوں کی ذمے داریاں گھر میں چین لینے دیتیں نہ باہر ... بارش موسلا دھار ہونے لگے، تو جلوس رک جائے یا دور رک جائے۔ ہجوم میں کھڑے لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

"لاٹھی چارج ہوگا۔"

"گولی چلے گی۔"

کسی نے کہا "افسروں کی گاڑیاں بھاگ دوڑ رہی ہیں۔ جا بجا پولیس کے دستے کھڑے ہیں۔ دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ اشتعال بڑھتا ..."

ابراہیم مجمع چیرتا ہوا سڑک پہ آ گیا۔ تڑپتا پھڑکتا جلوس آ رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ تشدد سے گریز کرے گا۔ مگر ان چھوکروں کو کیا ہو گیا؟ یا تا وادیلا کیوں مچا رہے ہیں؟

"سنو میرے بچو....."

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسے الفاظ نہ ملے۔ اب لوگ بارش سے بے نیاز ہو کر بکھر گئے اور وہ اٹھا اٹھا کر ادھر دیکھنے لگے۔ جہاں سے جلوس آ رہا تھا۔ ان کی حرکات سے اضطراب ٹپکتا تھا۔ ابراہیم ایک اونچی جگہ پہ چڑھ گیا۔ کالی جھنڈیوں والے جلوس کا ریلا بڑھتا چلا آتا تھا۔

"چاچا ابا وہ آ رہے ہیں..... اوہ آ چکے ہیں۔"

(چاچا وہ آ رہے ہیں) منیب کی آواز کہیں قریب سے آئی۔

"ہاں ہاں۔"

"آگے وہ جن نہیں دینا (آگے نہ بڑھنے دینا)

منیب اسے پاؤں اٹھا کر چل دیا۔

"اچھا بھائی" ابراہیم نے مریل سی آواز میں کہا اور اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگا..... "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم ہمیں آزمانے پر کیوں تلے ہو بیٹا۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔ کبھی خواب میں حکم نہیں ملا کہ تمھیں قربان کر دیں۔ ایسا خواب ہزاروں سال پہلے ایک نبی کو آیا تھا۔ ہم تو عام سے انسان ہیں۔ ہماری عام سی آزمائشیں ہیں..... ہم معمولی آدمیوں کی معمولی ضروریات..... معمولی آرزوئیں..... وہ پیغمبر بھی آدمی تھے فرشتے ہیں۔"

ابراہیم نے پہلو بدلا اور سوچا:

"وہ زمانہ پیچھے رہ گیا۔ اب چھری نہیں گولی چلتی ہے۔ اتنی جلد کہ فرشتوں کی نظر چوک جائے۔ معجزہ دکھانے کی مہلت کہاں؟ اب فرشتے اپنے ملکوتی ہاتھوں سے کوئی نعم البدل حاضر نہیں کرتے۔ یہاں فرشتے تیر مارتے ہیں نہ خدا تجلی دیتا ہے۔ اب وہ اپنے معجزات سے نہیں کرے گا کیونکہ انسان بڑا سستا ہو چکا۔"

"ہائے ہائے..... ہائے ہائے۔"

شہر کی تنی ہوئی رگ زور زور سے پھڑک رہی تھی۔ جلوس سر پر آ پہنچا۔ سنتریوں کے پاؤں میں پہیے لگ گئے۔ سڑک کے آر پار مسلح دیوار کھڑی ہو گئی۔ جوش سے بھرا ہوا جلوس وہ دیوار توڑ رہا تھا۔ کالی جھنڈیاں، ابر آلود اندھیری فضا گھیر گئی مگر چیخیں "ہائے..... ہائے....." شور سے زمین و آسمان ایک ہو گئے۔ گویا آج فیصلے کا دن تھا۔

"بچہ ہو کے رہے گا۔"

"لاٹھی چارج....." گولی کر جا۔ پھر ادھر ادھر گولیاں برسیں۔ لوگ منتشر ہو کر آگے بڑھتے رہے۔ بچوں اور جوانوں کا ہم غفیر ہر لحاظ سے گراں منظر ہے۔

"بیٹے رک جا..... یہ خدا کا حکم نہیں۔ تمھارے خون کا تاوان کون دے گا؟" ابراہیم گڑگڑایا۔

آسمان پر بادلوں نے یلغار کر رکھی تھی اور بجلی کے تار میں سے رہ رہ کر شعلے جھڑتے تھے۔

"میرا دل نہیں مانتا بیٹے، میرا دل نہیں مانتا۔ کیونکہ یہ خدا کا حکم نہیں نہیں مانتا نہیں مانتا....."

منیب نے اسے زور کا جھٹکا دیا اور کہا "چپنی شوانی وہ ابریا....." (ارے چپ ہاتھ والی ہے)

وہ بیٹا کا تو ٹی نہیں ندرت کی لیکی ہو چکی تھیں۔

گولی چل گئی۔ ابراہیم نے منیب کو ایک جگہ سے چھٹتے دیکھا۔ اونچے نعروں میں ابراہیم نے دیکھا۔ اپنا بیٹا دوبارہ بیادہ راہ پر جا چڑھا۔ لوگوں کا ہجوم آگے بڑھنے لگا۔ ان کی بانہوں میں ایک نوخیز بدن جھول رہا تھا۔ ابراہیم نے اچھی طرح اسے دیکھا اور تڑپ کر دھاڑا:

"ارے میرا سوہنا پتر!"

پھر کوئی آواز کوئی فریاد اس کے گرد سے بلند نہ تھا۔ ♦♦♦



انسانی بدن کی صفائی مشین

کیمیائی مادوں کو زہر بننے سے روکنے والے اللہ تعالیٰ کے دو تحفوں کا اچھوتا بیان

ڈاکٹر غزال خورشید

غذا انسانی جسم کا ایندھن ہے۔ اگر چند دن یہ ایندھن نہ ملے، تو انسان لاغر و بیمار ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدن میں غذا ہضم ہو کر مائع یا ٹھوس فضلہ و تیزابی مادے پیدا کرتی ہے۔ سیم پھلی کی شکل کے دو عضو "گردے" یہ مائع فضلہ و تیزاب خون سے صاف کرنے کے ذمے دار ہیں۔ اگر خون مائع فضلے و تیزابوں سے پاک نہ ہوں، تو جسم میں زہر پھیلنے کے باعث انسان کچھ ہی عرصے میں مر جاتا ہے۔

دن میں کئی مرتبہ خون ایک شریان کے ذریعے گردوں میں جاتا ہے۔ ہر گردہ نیفرون (Nephrons) نامی دس لاکھ ننھی منی چھلنیاں رکھتا ہے۔ جب خون ان چھلنیوں سے گزرے، تو سارا مائع فضلہ اور تیزابی مادہ ان میں رہ جاتا ہے۔ یہ کچرا پھر پیشاب کی صورت ہمارے بدن سے خارج ہوتا ہے۔

یہ عیاں ہے کہ گردے جسم انسانی میں نہایت اہم عضو ہیں۔ اسی لیے ان کی خرابی عموماً بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ گردے مختلف وجوہ کی بنا پر خراب ہو سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے مرض کے آغاز میں علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ اسی باعث جب گردے خراب ہونے کا پتا چلے، تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ افسوس کہ طبی سائنس بے پناہ ترقی کے باوجود خراب گردے دوبارہ صحت مند کرنے کا نسخہ دریافت نہیں کر سکی۔

گردے عام طور پر تین وجوہ کی بنا پر اپنا فعل صحیح طرح انجام نہیں دیتے۔ اول یہ کہ جسم میں پانی کی مقدار کم ہو جائے۔ دوم گردوں میں خرابی ہو، تو وہ جسم کی غلاظت خارج نہیں کر پاتے، تیسرے گردوں کے آگے جو رگیں اور نالیاں ہیں، ان میں سنگریزوں یا غدود بڑھنے کی وجہ سے پیشاب کے خارج ہونے میں رکاوٹ آ جائے۔ گردوں کے فعل میں خرابی اپنی جگہ کے لحاظ سے قبل از گردہ، گردوی اور بعد از گردہ کے نام سے موسوم ہیں۔

اگر یہ پتا چلے کہ خون میں یوریا بڑھ گیا ہے، تو بیمار کو طبیب سے یہ پوچھنا چاہیے کہ خرابی کہاں ہے؟ اگر پانی کی کمی کے باعث ہے تو طبیب کے مشورے سے پانی تقریباً تین لیٹر (دس بارہ گلاس) روزانہ پیا جائے۔ اگر گردوں کے آگے رکاوٹ ہے، تو اسے رفع کرنا چاہیے۔ اگر خرابی گردوں میں ہے، تو یہ مسئلہ ضرور ہے، لیکن کچھ نہ کچھ مداوا پھر بھی ہو سکتا ہے۔

امراضِ گردہ میں مبتلا افراد کا غذائی نقشہ

جن مریضوں کے گردے خراب ہو جائیں، وہ غذا میں لحمیات کی مقدار کم کردیں، یعنی ہر قسم کا گوشت، مچھلی، دودھ، انڈا اور دالیں بہت کم کھائیں۔ اس کے علاوہ خشک میوے اور مشروبات بھی کم استعمال کریں۔

غذا	صحیح مقدار	مقدار/اندازا
دودھ	۱۲۰ ملی لیٹر	نصف پیالی یا ۸ چمچے
لسی	۱۲۰ ملی لیٹر	نصف پیالی یا ۸ چمچے
پنیر	۳۰ گرام	ڈبل روٹی پر لگانے کے لیے
آٹا خشک یا چاول خشک	۷۵ گرام / ۷۵ گرام	۹ چمچے / ۹ چمچے
روٹی یا ڈبل روٹی یا دلیا خشک	۵۰ گرام / ۵۰ گرام / ۳۰ گرام	نصف چپاتی / دو ٹکڑے / نصف پیالی
دلیا پکا ہوا	۲۰۰ گرام	ایک پیالی
انڈا یا گوشت یا دالیں خشک	۵۰ گرام / ۵۰ گرام / ۵۰ گرام	ایک عدد / ایک بوٹی (گوشت کا شوربا حسب خواہش) / نصف پیالی
آلو کچے پکا	۵۰ گرام	ایک مرغی کے انڈے برابر
سابودانہ	۵۰-۱۰۰ گرام	نصف پیالی
اراروٹ	۵۰ گرام	ایک پیالی
اراروٹ کے بسکٹ	۵۰ گرام	چھے عدد
مکھن (جو نمکین نہ ہو)	۲۵ گرام	ڈبل روٹی پر لگانے کے لیے
چکنائی	۲۵ گرام	ایک چمچے سے ذرا زیادہ
سبزیاں	۲۵ گرام	دو چھوٹے شلجم یا اس کے برابر زمین دوز جڑ والی سبزی
سبز پتوں والی سبزی		حسب خواہش
پھل		۲۰۰ گرام.....ایک آم یا ڈیڑھ سیب یا ایک سنگترہ، دو نارنگیاں، چھوٹے پچاس انگور یا ایک چھوٹا خربوزہ، دو کیلے حسب خواہش

گردے اور مشین

جب گردوں کا فعل درست نہ رہے، تو خون میں فضلہ، غلاظت اور تیزاب جمع ہونے لگتے ہیں۔ ان کا اندازہ خون میں یوریا کی افراط سے ہوتا ہے۔ ان بیماروں کی غذا میں لحمیات (گوشت، مچھلی، انڈا) کم سے کم دی جاتی ہیں۔ یہ بیمار صرف گوشت کا شوربا لے سکتے ہیں، بوٹی نہیں۔ انڈا بھی

کبھی اور وہ صرف چاسنے ہیں لیکن سبزیوں اور پھلوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ اس غذا سے بیماروں کی حالت ابتداً سنبھل جاتی ہے اور کافی عرصے تک وہ تندرست رہتے ہیں۔

لیکن جب مرض زیادہ بڑھ جائے، تو کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ غشی کے دورے پڑنے لگتے اور زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کا ازالہ ماضی میں تو بالکل نہیں تھا لیکن اب پندرہ سال سے اس کا مداوا دو طریقوں سے ممکن ہو چکا اور مریض کو خطرناک بحران سے عارضی رہائی مل جاتی ہے۔

پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ مریض کو مصنوعی گردوں کے ساتھ منسلک کر دیا جائے جو نلکیوں اور نالیوں کے سلسلے پر مشتمل ایک مشین ہے۔ اس میں ایک باریک جھلی کی چھلنی صافی کا کام دیتی ہے۔ صافی کے ایک طرف خون اور دوسری طرف مخصوص رطوبت ہوتی ہے۔ اس رطوبت میں نمک اور چند نمک خاص تناسب سے شامل ہوتے ہیں۔

بیمار کی کلائی میں لال اور نیلی دونوں رگوں کے سرے اس مشین کی نلکیوں سے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ ایک رگ سے خون نکل کر مشین میں گردش کرتا اور پھر دوسری رگ کے ذریعے واپس جاتا ہے۔ مشین میں گردش کے دوران خون کی غلاظت صافی سے پار ہو کر رطوبت میں آجاتی ہے۔ رطوبت کے مفید اجزا خون میں ملتے ہیں۔ اس طرح مسلسل گردش کے بعد خون چھل کر صاف ہو جاتا ہے۔ رطوبت کی مسلسل بدلی ہوتی ہے۔ اس عمل میں تقریباً پانچ گھنٹے لگتے ہیں اور بیمار فوری طور پر عارضی طور پر تندرست ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنا کام معمول کے مطابق جاری رکھ سکتا ہے۔

کچھ بیماروں کو ہفتے میں تین دفعہ اور کچھ کو ہفتے میں ایک دفعہ گردوں کے اس عمل تطہیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ خرابی گردہ کے سبب غلاظت آمیز خون انسان میں سب سے پہلے اپنے

☆ بدترین ہے وہ عالم جو امیروں اور بادشاہوں کا مصاحب بنے اور بہترین ہے وہ بادشاہ جو اہل علم کی صحبت اختیار کرے۔

☆ میں امراء کے ہاں جانے سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ میری آؤ بھگت کرنے لگیں تو میں ان کی طرف مائل نہ ہو جاؤں اور میرے سارے اعمال خیر ضائع نہ ہو جائیں۔

☆ تواضع کا نتیجہ سلامت اور غرور کا نتیجہ ندامت ہے۔

(حضرت سفیان ثوری)

۱۹۴۳ء میں صاف کیا گیا۔ انگریزی میں یہ طریقہ "ڈائلا سز" کہلاتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خراب گردے نکال کر صحیح گردہ لگا دیا جائے۔ یہ بات اہم ہے کہ گردہ اگر بھائی بہن کا ہو تو بہتر ہے۔ پھر ماں باپ کا ہونا چاہیے کہ یہ رگ جسم آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ غیر شخص کا ہو تو مسترد ہونے کا امکان رہتا ہے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ کسی مردہ شخص کا گردہ استعمال کیا جائے (جو مرنے سے پہلے تندرست ہو اور اچانک کسی حادثے میں جاں بحق ہو)

چونکہ ایسے گردے کے رد ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اس لیے بیمار کو ایسی ادویہ کھلائی جاتی ہیں کہ جسم غیر گردہ مسترد نہ کرے یعنی اس کی دفاعی صلاحیت دب جائے۔ لیکن ان ادویہ کا مریض پر الٹا اثر بھی پڑتا ہے اور وہ مختلف پیچیدگیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ بہرحال عموماً پیوند کیا گیا گردہ خطیر دو سے تقریباً پانچ سال تک کام دے سکتا ہے۔ یوں مریض اپنی ذمے داریوں کو کافی حد تک پورا کر لیتا ہے۔ جب تک گردوں کی پیوند کاری نہیں ہوتی، مریض کو مصنوعی گردہ مشین پر رکھا جاتا ہے۔ اگر کبھی پیوند شدہ گردہ کام کرنا چھوڑ دے، تو بیمار دوبارہ مصنوعی گردہ مشین پر منتقل کر دیا جاتا ہے۔

◆◆◆

پچھتاوا

بدی کی دلدل میں پھنسے ایک راہ گم کردہ کا دل افروز ماجرا، وہ اپنے خوابیدہ ضمیر کو جگانا چاہتا تھا

صبا جاوید

"پکوڑے
لے لو... گرما گرم پکوڑے۔ یہاں کے گرما گرم مشہور پکوڑے۔" میرے کانوں میں معصوم سی آواز گونجی۔

"باجی پیٹ بھرنے والے پکوڑے ہیں نا۔ یہ پورے ملک میں مشہور ہیں۔ باجی چکھ کر تو دیکھیں۔"

وہ اب کسی سے مخاطب تھا۔ مجھے اس آواز میں شناسائی محسوس ہوئی۔ ذرا سا مڑ کر اس آواز کا چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ نظر نہ آ سکا۔ شاید وہ ڈھلوان نما چوٹی کے دوسری طرف تھا۔

"کیا خاص بات ہے ان پکوڑوں میں جن کے لیے تم کب سے میرا دماغ کھا رہے ہو، وہ بھی مفت میں۔" دوسری طرف سے اب بولنے والی آواز یقیناً کسی خاتون کی تھی۔ وہ یہاں تفریح کی غرض سے آئی ہوئی۔ یہ جملہ سنتے ہی میں دوبارہ اس معصوم آواز سننے کے لیے بے قرار ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈھلوان کے اوپر چلا گیا جہاں سے چوٹی کا دوسرا حصہ بھی صاف نظر آتا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بینچ پر دو خواتین بیٹھی تھیں۔ ایک دس بارہ سالہ لڑکا ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ اس وقت وہ اپنے ہاتھوں میں تھمی بڑی سی پرات سے کچھ اتار رہا تھا۔

"یہ چکھیں باجی، پکوڑے تو ہر جگہ بکتے ہیں۔ لیکن ان کی



خاص بات یہ ہے کہ یہ مقامی خالص سرسوں کے تیل میں تلے جاتے ہیں۔"

لڑکے نے انھیں پرات دکھاتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ ساتھ ہی ایک خاتون کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ دوسری خاتون سے کہنے لگی: "دیکھا، چھوٹا سا ہے اور اپنی تنخواہ کی خاطر کیسے پٹر پٹر بول رہا ہے۔"

دوسری عورت مسکرائی اور بولی: "بے وقوف لڑکے، چلے بھی جاؤ اب، ہم نے نہیں کھانے خالص سرسوں کے تیل میں تلے ہوئے پکوڑے۔" اس نے جیسے لڑکے کی بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

لڑکا پرات لیے پلٹ گیا۔ اب میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور پاؤں میں بوجھل پن میں نے واضح محسوس کیا۔ کافی پہلے کھانا کھانے کے باوجود لڑکے کی پرات میں موجود گرم گرم پکوڑوں کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے محسوس ہونے لگی۔ ایک دم سے پکوڑے کھانے کو میرا جی بری طرح للچایا۔ حالانکہ دوپہر کھانے کے بعد از شام کی چائے سے پہلے میں کچھ نہیں کھاتا اور میں اپنے اس عمل پر طویل عرصے سے عمل پیرا ہوں۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکے کو اپنی طرف بلایا۔ اس کے چہرے کی چمک نمایاں ہوئی۔ وہ تیز مگر محتاط قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ میں قریب ہی بنے سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھا۔ وہ میرے قریب چلا آیا اور پرات بنچ پر رکھا وہیں کپڑا ہٹانے لگا۔ میں غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ میری محویت سے ناآشنا تیزی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

لڑکے نے بائیں بازو کے ساتھ لٹکے تھیلے سے ایک پلیٹ نکالی اور پرات میں سے پکوڑے اٹھا اس میں ڈالنے لگا۔ پھر اسی تھیلے سے مسالے والی نکالی اور پلیٹ میں پڑے پکوڑوں پر بڑی مہارت سے مسالے کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔

"صاحب کتنا مسالا ڈالوں؟ صاحب..." لڑکے نے زور سے پوچھا۔

اس نے دوسری دفعہ کہا تو میری محویت ٹوٹی جس پر میں کچھ جھینپا سا ہو گیا۔ البتہ میں نے اس کے چہرے پر کوئی حیرانی یا الجھن نہیں دیکھی۔ معصومیت کے ساتھ ٹھہرا جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ "صاحب اور مسالا ڈالوں؟" اس نے پھر پوچھا۔

میری نظریں چہرے سے ہٹ کر اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ پر گئیں۔ "اوہ! مسالا تو بہت ہو گیا، میں تو اتنا زیادہ نہیں استعمال کرتا۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ہلکی سی الجھن محسوس کی جیسے اسے اپنے وقت کا بے جا نقصان ناگوار گزرا ہو۔ ایک لمحے کے لیے میں نے ضرور ایسا ہی محسوس کیا لیکن اگلے ہی پل وہ معصوم لہجے میں بولا: "پھر!... کیا دوسری پلیٹ بغیر مسالے کے ڈال دوں اب؟"

"اوں... نہیں... ہاں نہیں، بس ٹھیک ہے اب، ہاں کتنے پیسے ہو گئے؟" میں نے اپنے لفظوں کی بے ربطی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"۸۰ روپے کی پلیٹ ہے صاحب۔" وہ پلیٹوں والا تھیلا [illegible] کے ساتھ لٹکاتے ہوئے بولا۔

میں نے جیب سے ۱۰۰ روپے کا نوٹ نکالا، اسے تھمایا اور پکوڑوں والی پلیٹ اٹھائی۔ اس نے نوٹ جیب میں رکھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سکے نکال ان میں سے پانچ، پانچ کے چار سکے میری طرف بڑھا دیے۔

"رکھ لو۔" میں نے پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا اور خود ہی اپنے اس عمل پر حیران رہ گیا۔ کیا میں کسی خیال کے تحت، شاید انجانے میں یا کسی رو میں خود بخود ہی میرے منہ سے یہ الفاظ ادا ہو گئے۔ حالانکہ اپنی لاکھوں کی آمدنی کے باوجود میں نے کبھی کسی فقیر کو مانگنے پر بھی ایک روپیہ نہیں دیا تھا۔ مجھے فقیروں، غریبوں سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔

لیکن یہ کیا..... میں ابھی اپنے جملے پر حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ خود ہی شرمندہ ہو گیا جب اس کا جملہ سنا "نہیں صاحب، میرے تو ۸۰ روپے ہی بنتے ہیں۔ یہ لیں ۲۰ روپے، پلیٹ ادھر ہی رکھ دیجیے گا، میں آ کر لے جاؤں گا۔" اس نے وہ چاروں سکے میرے قریب بنچ کی ہموار سطح پر رکھے اور خود پرات اٹھا کر چل پڑا۔

"ظاہر ہے یہیں رکھ کر جاؤں گا، کوئی جیب میں ڈال کر ساتھ تو نہیں لے جاؤں گا، جاہل کہیں کا۔" میں نے اپنی شرمندگی جھنجلاہٹ میں بدل دی۔

ابھی وہ کافی فاصلے پر چلا گیا جب دوبارہ میں نے اسے آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے پلیٹ بنچ پر رکھی، ایک پکوڑا اٹھایا اور اس کے قریب چلا گیا۔

"کیا بیچنے والوں نے ان پکوڑوں کی قیمت ۸۰ روپے رکھی ہے؟" میں نے پیاز کے پکوڑوں کی اس جگہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں کئی اور لڑکے بھی پکوڑوں کی پراتیں بھروا کر لاتے اور انھیں بیچنے کے بعد پیسے وہاں پہنچا کر جمع کرواتے۔ وہ لڑکا ایک لمحے کے لیے کچھ بول نہ سکا، شاید میرے بے تکے سوال پر اسے حیرانی ہوئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے "جی صاحب" کی شکل میں مختصر جواب دیا۔

"اگر تم پلیٹ ۸۰ کے بجائے ۹۰ روپے میں بیچو تو کیا فرق پڑتا ہے؟" میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں مزید حیرانی اترتے دیکھی۔

"نہیں صاحب!" وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا تو میرے لیے سوچ بچار کے کوئی اور ہی در کھول گیا۔ "نہیں صاحب! ایسے بڑا انسان بنتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر آگے چل پڑا۔

"خوب..... پکوڑے بیچ کر بڑا آدمی بننے کے خواب۔" میں نے نخوت سے سوچا اور دوبارہ بنچ پر بیٹھ گیا۔

"میں کیوں اس پکوڑے والے لڑکے میں دلچسپی لے رہا ہوں؟ یہ کون ہے؟ اسے دیکھ کر مجھے کیوں کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے؟ جیسے میں اس لڑکے کو جانتا ہوں یا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ اس کی آواز اور حلیہ مجھے کون سا منظر یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے؟ لیکن میں تو تیس سال بعد ایبٹ آباد آیا ہوں۔ پھر میں کیوں اس لڑکے میں شناسائی محسوس کر رہا ہوں؟ نہیں، یہ سب میرا وہم ہے، یہ تو عام سا لڑکا ہے بس۔"

میں نے اپنی کنپٹیاں ہاتھوں سے دباتے ہوئے سوچا۔

"لیکن کچھ تو ہے مراد علی! جو تم اس طرح الجھن کا شکار ہو۔" میرے اندر سے آواز آئی اور ساتھ ہی میرے ذہن کے کسی کونے میں جھماکا سا ہو گیا۔

٭٭٭

"میرا بیٹا تو بڑا آدمی بنے گا۔" مجھے اماں کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی پورا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

"بہن میں تو کہتی ہوں اپنے مراد کو کوئی کام سکھانے کے لیے کسی ورکشاپ پہ لگا دے۔ تو اکیلی جان، یہی تو سہارا ہے تیرا۔ کوئی ہنر سیکھ گیا تو کل کو سکھی رہے گا اور تیری بھی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی۔" چچی زرینہ کی برسوں پہلے کی بات میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"نہیں زرینہ بہن، میں تو اپنے بیٹے کو خوب پڑھا لکھا کر بڑا بناؤں گی۔ اللہ بخشے مراد کے ابا مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے۔ میں ان کا سپنا ادھورا نہیں چھوڑ سکتی نا بہن۔" میں نے اماں کو جواب دیتے سنا۔

"سوچ لے بہن میں تو کہتی ہوں اس پڑھائی وڑھائی کے چکر میں کہیں وقت کی ٹھوکر کھا جائے اور تیرے اکلوتے بیٹے کے ہاتھ پلے کچھ نہیں آئے۔ دیکھ نہیں رہی تعلیم کی آج کل کے قدر..... لڑکے بڑی بڑی ڈگریاں ہاتھوں میں پکڑے جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ کچھ ہنر پاس ہوا تو اپنی روزی بنا ہو جائے گی۔ اب میرے بیٹوں کو دیکھ لو وقت پہ دونوں نے کام

سیکھ لیا تھا، تو آج اپنے لیے اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔" زرینہ پھپھی نے اماں کو قائل کرنا چاہا جن کا ایک بیٹا سوزوکی ڈرائیور تھا تو دوسرا استری۔

لیکن میری اماں ان کی کسی دلیل سے قائل نہ ہوسکیں۔ وہ خود ان پڑھ تھیں لیکن مجھے علم کی روشنی دلوا کر روشن ستارہ بنانا چاہتی تھیں۔ آج پہلی دفعہ میں نے اپنے ماضی میں جھانکا تھا۔ میرا ماضی اتنا شان دار نہ تھا کہ مجھے اسے یاد کرنے میں کوئی دل چسپی ہوتی۔ اور نہ ہی بڑا آدمی بننے کی تگ و دو میں مجھے کبھی اتنی فرصت ملی کہ میں ماضی یاد رکھ سکتا۔

آج جب اچانک بلاارادہ میں نے ماضی کے پردے چاک کرنا چاہے تو مناظر آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کچھ مناظر تو مجھے بہت دھندلے دھندلے نظر آنے۔ اور خاص کر بچپن کے بہت سارے مناظر تو ایسے تھے جو شاید اب مجھے یاد ہی نہیں رہے۔ لیکن ...... لیکن اب ایک چیز مکمل طور پر واضح ہوگئی۔

اب مجھے اس میں کوئی ابہام نہیں تھا کہ غبارے بیچنے والا لڑکا کیوں میرے لیے دل چسپی کا باعث بنا۔ اسے دیکھ کر کیوں میرا برسوں سے سویا ضمیر مجھے کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا؟ اب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے اس لڑکے میں آج سے چالیس سال پہلے کے مراد علی کی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ وہ مراد علی جسے غربت و لاچاری کے باوجود اس کی اماں اسکول بھیجتی تھی۔ لیکن اس کا دل اسکول میں نہیں لگتا تھا۔

جب وہ اسکول میں دوسرے بچوں کو مہنگی آئس کریم کھاتا دیکھتا، تو اس کا جی بھی للچاتا۔ وہ اسکول صرف اس لیے جاتا کہ راستے میں بڑے لوگوں کے شان دار بنگلے واقع تھے۔ اسکول آتے جاتے سڑک پر کھڑا ہوکر کچھ دیر کے لیے انھیں وہ ضرور دیکھتا۔ خیالات کے تانے بانے میں اس کی ذات کہیں کھو کر رہ جاتی۔ کوئی بھی دل کش شے دیکھ کر وہ فوراً اس سے مرعوب ہو جاتا۔ وہ سڑک پر چلنے والی ہر اچھی گاڑی کی طرف دیکھتا تو یہ

> ## کھانے میں اعتدال
>
> افطار کے وقت حلال کھانا بھی کم ہی کھایئے۔ اتنا نہ کھا جائیں کہ پیٹ پھول جائے۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک حلق تک بھرے ہوئے پیٹ سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی بھر جانے والی چیز نہیں، اگرچہ کھانا حلال ہو۔ شیطان پر غالب آنے اور شہوت کا زور توڑنے میں روزے سے پھر کیا مدد ملے گی اگر روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی بھوک پیاس کی تلافی کر دے اور ایک وقت میں اتنا کھا لے جتنا دن بھر میں کھاتا تھا۔ افطار کے وقت کھانے کی انواع و اقسام بھی زیادہ ہوتی ہیں اور یہ عادت بھی عام ہے کہ رمضان کے لیے پہلے سے سامان خور و نوش جمع کیا جائے۔ چناں چہ رمضان کے دنوں میں اچھے اور نفیس کھانے اتنے زیادہ کھا جاتے ہیں کہ اور دنوں میں کئی مہینے بھی نہ کھائیں۔
>
> (احیاء العلوم، جلد اول۔ ترجمہ و ترتیب: خرم مراد)

خیال ضرور آتا کہ کاش اس کے پاس بھی ایسی آرام دہ کار ہوتی۔ اس کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بڑا آدمی بن جائے۔

ایک دن اس نے آئس کریم کھانے کے لیے اپنے ایک ہم جماعت کی غیر موجودگی میں اس کے بستے سے پیسے نکال لیے۔ کچھ دیر کے لیے اس کے ہاتھ لرزے اور دل کانپا لیکن آئس کریم کا مزہ بازی لے گیا۔ اس دن کے بعد تو قدرت بھی جیسے لڑکے پر مہربان ہوگئی۔ ایک کے بعد ایک کامیابی نے اس کے حوصلے بلند کر دیے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ساری خواہشیں پوری ہوتی گئیں۔ آخری بار مراد علی نے اپنے گینگ کے ساتھ مل کر بینک لوٹا۔ پھر اس نے کبھی چوری ڈاکا نہیں ڈالا لیکن حرام خوب کمایا۔

اماں اس کی سرگرمیوں سے نا آشنا تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا کیا دھندا کرتا ہے۔ بخت جگر نے صرف یہی بتایا کہ اس نے دوستوں کی مدد سے اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر معمولی کاروبار شروع کیا ہے جسے اس کی محنت کامیابی دلا رہی ہے۔ یہ سن کر اماں پھولے نہ سمائی۔ پھر وہ اماں کو بھی لاہور لے آیا۔ وہیں اس نے شادی کر لی اور بالآخر وہ بڑا آدمی بن ہی گیا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی۔

☆☆

بارش کا ٹھنڈا قطرہ میرے چہرے پر گرا، تو میرے خیالات کا طلسم ٹوٹا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو آسمان بادلوں سے ڈھک چکا اور ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ''کیا میں نے اب تک جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میری اماں کو فوت ہوئے کئی برس بیت چکے۔ وہ جب بھی مجھے بڑی سی گاڑی میں آتا دیکھتیں، تو بے حد خوش ہوتیں، کہتیں ''دیکھا! آخرکار تو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن ہی گیا۔ ورنہ آج تو بھی سوزوکی چلاتا یا کہیں پکوڑے بیچ رہا ہوتا۔''

اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں، بالآخر میں بڑا آدمی بن ہی گیا۔ آج ملک کی بارسوخ کاروباری شخصیات میں مراد علی کا نام سرفہرست ہے۔ ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں لاکھوں روپوں کی ماہانہ آمدنی دینے والی میری جائدادیں ہیں۔ لیکن میری اماں کو کیا پتا تھا کہ مراد علی بڑا آدمی بن جانے کے باوجود بھی بڑا انسان نہ بن سکا۔

میں نے سر اوپر اٹھایا، تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ بادلوں کی دھند کے باوجود چوٹی سے پورا شہر سفید دودھیا بتیوں سے جگمگ کرتا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ پہاڑی پر بھی بلب جلا دیے گئے اور بارش میں بھی اب روانی آ رہی تھی۔ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ وہی لڑکا پلیٹیں اکٹھی کرتا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اب اس کے ہاتھ میں جمع کی ہوئی پلیٹیں تھیں۔ اس نے میرے بنچ پر سے بھی پلیٹ اٹھا دوسری پلیٹوں کے اوپر رکھ دی۔

''بیٹا! کیا تم سارا دن یہی کام کرتے ہو؟''

وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ میری آواز سن کر ٹھہر گیا۔ مجھے دیکھ کر بولا ''نہیں صاحب میں صبح قرآن پاک پڑھنے مسجد جاتا ہوں۔ پھر سکول میں پڑھتا ہوں۔ پھر چار بجے کے بعد یہاں آ کر پکوڑے بیچتا ہوں۔''

''کس جماعت میں پڑھتے ہو؟'' میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے چہرے پر کہیں احساس کمتری کا کوئی تاثر ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اس معصوم چہرے پر تو مکمل ٹھہراؤ تھا۔

اس کے سادہ سے انداز میں مجھے بے پناہ اعتماد نظر آیا۔ اس نے اسی پُرسکون لہجے میں جواب دیا ''میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں صاحب۔'' وہ جواب دے کر مزید نہیں رکا اور پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا، لیکن میں اگلے دو منٹ مزید وہیں کھڑا رہا۔

جس لڑکے نے میرے لیے سوچ کے کئی در وا کیے، اس میں اور مراد علی میں کئی اقدار مشترک ہونے کے باوجود بہت فرق تھا..... راستے کے انتخاب کا فرق۔ میں نے جس راستے کا انتخاب کیا، اس پر چل کر اپنی منزل تک بلاشبہ پہنچ گیا، لیکن پچھتاوے نے پھر بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ سب کچھ پا کر لینے کے باوجود میں آج بھی تہی دامن ہی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن یہ لڑکا ضرور بڑا انسان بنے گا کیونکہ اس کا منتخب کیا ہوا راستہ بڑا انسان ہی بناتا ہے۔

''صرف دولت حاصل کر لینے سے بڑا آدمی تو بنا جا سکتا ہے مگر بڑا انسان تو وہ ہے جو تاریخ رقم کر کے جائے۔'' میں نے سوچا اور تیز قدم اٹھاتا لیماسی کی پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ آج ماضی یاد کرنے سے میرے ذہن میں آدمی اور انسان کا فرق واضح ہو گیا تھا۔

◆◆◆

پُراسرار کہانی



روحانیت کے دیس کی سوغات

کٹا ہوا ہاتھ

مستقبل میں جھانک لینے والے ایک انوکھے بشر کا انسانی عقل سے ماورا ہوش ربا قصہ

ممتاز مفتی

آپریشن کرنے کے بعد ڈاکٹر آسند جا چکا تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا سستا رہا تھا کہ دروازہ بجا۔ میں سمجھا اسپتال کا کوئی آدمی ہے۔ بولا "اندر آجاؤ۔"

لیکن ایک اجنبی کو داخل ہوتے دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔ وقت لیے بغیر ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہونا کس قدر بے ہودگی ہے۔ "کون ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔

"مریض ہوں۔" وہ بولا۔

"ڈاکٹر آسند سے وقت لیا ہے کیا؟"

"نا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میرا کیس بہت خطرناک ہے ڈاکٹر! میں دکھانے آیا ہوں!"

"ڈاکٹر تو جا چکے ہیں۔"

"اور آپ؟"

"میں جونیئر ڈاکٹر ہوں، ان کا اسسٹنٹ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" وہ بولا۔ "آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر آسند کا طریقِ علاج میرے لیے مفید ہو سکے گا یا نہیں۔"

"آپ ذہنی بیماری کے مریض ہیں کیا؟"

"پتا نہیں۔" وہ بولا۔ "شاید یہ ذہنی بیماری ہی ہو۔ ویسے کچھ نہیں۔"

"کیا تکلیف ہے؟" میں نے رُوکھے انداز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر! مجھے مستقبل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔"

"ضرور ذہن کمزور ہے یا کوئی مسخرا ہے۔" میں نے یہ سوچتے ہوئے حیرت سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ میرے سامنے ایک سنجیدہ آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ عمر ۳۵ کے قریب ہو گی۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، دبلا پتلا۔ اس کی صورت بشرے سے ظاہر تھا کہ پڑھا لکھا، مہذب اور ذہین ہے۔

"یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے کہ آپ کو مستقبل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مستقبل کو دیکھنے کے لیے لوگ بڑے مشتاق ہوتے، بڑے بڑے جتن کرتے ہیں۔" میں نے اسے آزمانے کے لیے کہا۔ "یہ تو تحفہ ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر!" وہ بولا "میں مستقبل دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ کرب ہے، ایک لعنت۔" اس نے شدید بے چارگی سے اس کا بند بند کانپ۔ "ڈاکٹر میں جینا، ایک عام آدمی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی خواہش نہیں۔"

یہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سنجیدہ ہے، سچ کہہ رہا ہے اور دکھی ہے۔ "کیا واقعی آپ کو مستقبل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

٭٭٭

ان دنوں میں نیا نیا ڈاکٹر آسمنڈ کا نائب بنا تھا۔ اس کا طریق علاج منفرد تھا۔ زندگی بھر کی تحقیق کے بعد اس نے وہ طریقہ علاج اختراع کیا تھا۔ ایک بہت لمبی سی سوئی وہ آنکھ کے راستے دماغ تک پہنچا دیتا۔ سوئی سے وہ مغز ہلاتا، پھر دوا انجیکٹ کرتا۔ انجیکشن کے لیے اس کے پاس آٹھ دس خود ساختہ مسکن ادویات تھیں۔ یہ طریق علاج بیشتر شیزوفرینیا کے مریضوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

ڈاکٹر آسمنڈ نے ایک ایسی مشین بنائی تھی جس کی اسکرین پر مغز کی تصویر آجاتی۔ جب وہ سوئی اندر داخل کرتا تو مشین چلا دیتا۔ اسکرین پر سوئی اور انسانی مغز کی ویڈیو آنے لگتی۔ اسے دیکھ کر وہ سوئی کو حرکت دیا کرتا۔ ڈاکٹر آسمنڈ کو نئے تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے وہ دوسری نوعیت کے ذہنی مریضوں پر بھی طبع آزمائی کیا کرتا۔ اجنبی کی باتیں سن کر مجھے اس کیس میں دلچسپی ہو گئی۔

"مجھے کوئی وقت دیجیے ڈاکٹر!" وہ بولا۔

میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیے کہ مستقبل کی جھلکیاں کیسے ظاہر ہوتی ہیں؟ کیا محسوسات کے ذریعے؟"

"نہیں ڈاکٹر!" وہ بولا۔ "محسوسات نہیں، آنکھوں سے دیکھتا ہوں جس طرح آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یعنی..... یعنی..... آن جانے میں۔" میں نے حیرت کا اظہار کر دیا۔

"سامنے تصویر آجاتی ہے۔" وہ بولا۔ "متحرک تصویر جیسے فلم چلتی ہے۔"

"فلم چلتی ہے!" میں نے اور حیرت سے پوچھا۔ "کیا پردے پر چلتی ہے؟"

"دیوار پر، چھت، فرش، کتاب کے صفحے پر۔ ایک منظر ابھرتا ہے۔ اس میں حرکت ہوتی ہے اور ہونے والا واقعہ پوری تفصیل سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ٹی وی ڈراما چلتا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر مجھ پر ایسی حیرت طاری ہوئی کہ میں بھول ہی گیا کہ میں ڈاکٹر تھا اور وہ میرے سامنے مریض کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔ ہم ڈاکٹر خود پر حیرت طاری ہونے نہیں دیتے۔ ہو جائے تو اس کا اظہار نہیں کرتے۔ مریض کے روبرو خود پر۔ حیرت کا اظہار دراصل اپنی کم علمی اور جہالت کا اظہار ہے۔ اگر ہم حیران کن باتوں کو تسلیم کرتے نہیں تو اپنے طور پر

ہمارا اعتماد اٹھ جائے۔ یہ ہم ہر روز حیران کن واقعات سنتے اور دیکھتے ہیں لیکن اپنے کان اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ احساسات کو منجمد کر دیتے ہیں۔ ہمارے پیشے کا مطالبہ ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، اسے دیکھنے یا اس پر سوچنے سے انکار کر دو یعنی اسے رد کر دو۔ اگر ہم ایسا نہ کریں، تو ہمارا اپنے پیشے پر سے اعتماد اٹھ جائے۔

لیکن اس روز پتا نہیں کیا ہوا کہ اس کی باتیں میرے اندر یوں چیونٹیوں کی طرح رینگتی جا رہی تھیں جیسے میں گڑ کی ڈلی ہوں۔ میرے اندر کا ڈاکٹر مفلوج ہو گیا۔ اندر کا بچہ ایڑیاں اٹھائے حیرت میں گم تھا۔ اور ڈاکٹر چلا رہا تھا "پوچھو..... اور پوچھو۔ شاید تمہارے شبے کی گنجائش نکل آئے۔"

"کوئی خواب دیکھیے؟" میں نے پوچھا۔ "تاکہ بات واضح ہو جائے۔"

"مثال؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کوئی واقعہ!" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "پچھلے مہینے کی بات ہے۔ یہی پچیس دن گزرے ہوں گے۔ صبح کے وقت میں بستر پر لیٹا تھا۔ بیگم باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ دفعتاً مجھ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ دکھایا جانے والا ہے۔"

"ہر دفعہ ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیا؟"

"ہاں، ہر دفعہ" اس نے کہا۔

"یہ کیفیت کیسی ہوتی ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر سر اٹھا کر بولا۔ "نہیں! بتائی نہیں، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔"

میں نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک تابوت ہوا میں اڑتا ہوا آیا۔ کھڑکی سے کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر کمرے میں تیرتا رہا، ادھر ادھر۔ پھر اترا اور دیوان پر جا کر ٹک گیا۔ ہمارے بیڈ روم میں ایک دیوان رکھا ہوا ہے ڈاکٹر کھڑکیوں سے ملحق دیوار کے ساتھ۔

"میں نے ڈرتے ڈرتے کانی آنکھ سے تابوت کی طرف دیکھا۔ ایک نعش کفن میں لپٹی دکھائی دی۔ چہرہ نظر نہ آیا۔ پھر میری نگاہ قالین پر پڑی..... میرے خدایا! خون کے چھینٹے ہی چھینٹے، درمیان میں خون کی ایک چھپڑی لگی تھی۔ خون دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی..... میں سوچ میں پڑ گیا، کیا قتل ہوگا یہاں ہمارے کمرے میں؟" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"آپ سمجھے آپ کے بیڈ روم میں آج کوئی قتل ہوگا؟" میں نے وضاحت کے لیے پوچھا۔

"ہاں قتل ہوگا۔" وہ بولا۔ "لیکن آج نہیں، وقت کا تعین نہیں ہوتا کہ کب ہونے والا ہے۔ چاہے آج ہو، کل یا ایک سال بعد۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"اور وہ تابوت؟" میں نے پوچھا۔

"چند ساعت کے لیے تابوت قائم رہا، پھر تحلیل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا کرب ہے ڈاکٹر!" اجنبی بولا۔ "بہت بڑا کرب۔" اس نے جھرجھری لی۔ اس کا بند بند لرزا..... "آنے والا واقعہ پہلے سے جان لینا اور پھر انتظار کرنا، انتظار کرتے رہنا۔ کرتے رہنا کہ کب وہ واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کرب ہے ڈاکٹر! کرب ہے۔ گھر میں ہم دو تھے..... صرف دو۔ میں میری بیوی۔ کون مقتول ہوگا؟ وہ یا میں؟ کون قاتل ہوگا؟ میرے خدایا!" وہ خاموش ہو گیا۔

"کیا آپ نے یہ بات اپنی بیوی کو بتائی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاتا؟ کیسے بتاتا ڈاکٹر! اکیلے دکھ سہنا پڑتا ہے۔ اس اکیلے پن کا عذاب سہتے سہتے میں نے پہلی بار جانا کہ تنہائی کا کیا مطلب ہے۔ جب سے مجھے مستقبل کی جھلکی دکھائی گئی ہے، میں اکیلا ہو گیا ہوں، اکیلا..... تنہا جو مستقبل کی بات کا علم رکھتا ہے۔ لیکن تم اسے کیا سمجھو گے؟" میں سمجھتے ذہنی طور پر سمجھنے کو سمجھنا نہیں کہتے۔ سمجھنا اور چیز ہے ڈاکٹر! سمجھنا

ذہن سے نہیں ڈاکٹر! سارے وجود سے ہوتا ہے۔ بند بند سے اٹھ رہی ہے۔ میرے خدایا!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

اس کی سچائی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ واقعی ہم ڈاکٹروں کی سوچ صرف ذہن تک محدود ہے۔ سچائی ہمارے نزدیک ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ہم ذہن کے غلام ہیں۔ جو چیز ذہن میں نہ آئے، وہ رد کر دیتے ہیں۔ ہم تشخیص کی لکیر کے فقیر ہیں، حالانکہ ہمیں ہم ابھی انسانی جسم اور ذہن کے اسرار و رموز سے واقف نہیں۔ پھر بھی ہم "مقصد اور اثر" (کاز اینڈ ایفکٹ) کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔

"کیا تم خدا کو مانتے ہو؟" اجنبی نے دفعتاً سر اٹھا کر پوچھا۔

"مانتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "صرف منہ زبانی۔"

"میں بھی پہلے اسے منہ زبانی مانتا تھا۔ وہ میرے ذہن کی تخلیق تھا۔ وہ اصولوں کا پابند تھا، اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند، مقصد اور اثر کے چکر میں محصور۔" اجنبی تلخ ہنسی ہنسا۔

میں خوفزدہ ہو گیا۔ کہیں وہ میرے خیالات تو نہیں پڑھ رہا۔ "آپ نے بات ختم نہیں کی۔" میں نے اس کی توجہ کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

"کون سی بات؟" وہ چونکا۔

"آپ تابوت اور خون کے چھینٹوں کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں وہ..... اس روز میری بیوی بار بار پوچھتی رہی، ندیم، تم پریشان نظر آتے ہو، کیا بات ہے؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی..... لیکن وہ کرب جو میرے چہرے پر ثبت تھا اسے کیسے چھپاتا؟ آخر وہ ہار کر اس دیوان پر جا لیٹی..... اسے وہاں لیٹے دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ میں دیوانہ وار اٹھا۔ گھسیٹ کر اسے دیوان سے نیچے گرا دیا۔ مت لیٹو یہاں، مت لیٹو۔ میں غرایا۔ بیگم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بیوی سے یوں بات نہ کی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یہ میں نے کیا کیا؟ کہیں میں ہی اس کا قاتل تو نہیں! مجھے خود سے خوف آنے لگا۔ پتا نہیں اس دہشت میں کیا کر بیٹھتا لیکن خوش قسمتی سے عین اس وقت آصفہ کی بڑی بہن عارفہ مع اپنے میاں اور بچوں کے سرگودھے سے آ گئی۔ ہم ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بچوں کے شور شرابے کی وجہ سے میری گھٹن کچھ کم ہوئی۔ پھر میں عارفہ کے میاں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔

"تھوڑی دیر بعد آصفہ دوڑی دوڑی آئی۔ کہنے لگی، ذرا عارفہ کو تو دیکھیے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جی متلا رہا ہے۔ ہم دونوں بھاگے بھاگے بیڈروم میں گئے۔ عارفہ دیوان پر لیٹی ہوئی تھی لیکن سخت بے چین۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی اور پھر جب میں قے کی دوا ڈھونڈ رہا تھا تو باجی کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا، عارفہ خون کی قے کر رہی تھی۔ قالین پر خون کی پھوار سی گری تھی۔ چاروں طرف چھینٹے پڑے تھے۔

"میرے دیکھتے دیکھتے عارفہ کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ مر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر پریشان ہونے کے بجائے مجھ پر سکون کا عالم طاری ہو گیا۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک عجیب سا اطمینان ہوا جیسے نشہ طاری ہو۔ میں پھر پورے چوبیس گھنٹے سویا رہا۔"

اس کی باتیں سن کر میں خاموش ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ پڑ کر سو جاؤں۔ جی کڑا کر کے کہا "جناب میں ڈاکٹر آسمند سے بات کروں گا۔ ممکن ہے وہ آپ کا کیس لے لیں۔ آپ کل اسی وقت تشریف لے آئیں۔"

اسی شام میں نے ڈاکٹر آسمند سے بات کی۔ وہ ایک سکہ بند پیشہ ور معالج ہے۔ اس نے تعجب کا اظہار نہ کیا بلکہ

لگا: "یہ پیچیدہ کیس ہے۔ آپ کی کیس ہسٹری لے کر اب آپریشن کی تاریخ دے دیں۔ معلوم ہوتا ہے دماغ کا کوئی حصہ متضرب ہوا ہے۔ شاید بیماری سے یا شدید تشویش کی وجہ سے۔ ہم کوشش کریں گے، شاید بات بن جائے۔"

اگلے روز ندیم مقررہ وقت پر آ گیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر آسمند نے آپ کا کیس لے لیا ہے۔ وہ آپریشن کریں گے۔"

"کس چیز کا آپریشن؟" اس نے پوچھا۔

"دماغ کا" میں نے جواب دیا۔ "ان کا خیال ہے کہ آپ کے دماغ کا کوئی حصہ متضرب ہو گیا ہے، کسی لمبی بیماری یا ذہنی صدمے کی وجہ سے۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے روک دیا اور کہا "یہ تکلیف آپ کو کب سے ہے؟"

"آپ اسے تکلیف کہتے ہیں؟ کیا یہ بیماری ہے؟ اسے اگر بیماری نہیں سمجھیں تو علاج معالجے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔"

"ہاں کب سے ہے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"تین سال سے۔"

"اس سے پہلے آپ طویل عرصہ کسی بیماری کا شکار رہے؟"

"او نہوں کوئی لمبی بیماری نہیں آئی..... ٹھہریے۔" وہ بولا۔ "چوٹ ضرور لگی تھی۔ میں اسکوٹر سے گرا، تو بے ہوش ہو گیا۔ لوگ مجھے اسپتال لے گئے۔ انھوں نے ایک رات رکھا، اگلے دن ڈسچارج کر دیا۔"

"ڈاکٹر آسمند کا اندازہ ٹھیک نکلا کہ دماغ کا کوئی حصہ متضرب ہو چکا۔"

"ڈاکٹر!" وہ بولا۔ "آپ منفی کیوں سوچتے ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ چوٹ سے ذہن کی کوئی خوابیدہ طاقت بیدار ہو گئی؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے ڈاکٹر! آپ کی سوچ بیماری کے گرد گھوم رہی ہے۔ کہاں بیماری کی پژمردگی، کہاں زندگی کی شگفتگی!"

میں اس کی باتوں کے چکر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی کیس ہسٹری ریکارڈ کرنی تھی، اس لیے جواب نہ دیا۔ کیس ہسٹری مکمل کرنے کے بعد آپریشن کا دن مقرر کر دیا۔

اچھے سلوک کی برکت

دنیا کے عظیم فاتح سکندر اعظم سے لوگوں نے پوچھا کہ تو نے مشرق و مغرب تک لاتعداد ملکوں کو کیسے فتح کیا، جبکہ وہ بادشاہ بہت بڑے بڑے خزانوں کے مالک تھے؟ وہ لوگ تجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ان کے پاس لشکر جرار تھے۔ اس کے باوجود بھی تو نے ان پر فتح حاصل کر لی؟

سکندر نے جواب دیا کہ میں نے جو ملک فتح کیے وہاں کی رعایا کو ہرگز نہ ستایا اور تنگ نہیں کیا۔ میں نے ان لوگوں کی عام رسومات اور رواج کو ہرگز نہ چھیڑا کہ انھیں دکھ ہو۔ میں نے وہاں بادشاہوں کے ساتھ بھی نیک اور اچھا سلوک کیا جو ایک بادشاہ کو دوسرے کے ساتھ کرنا مناسب ہوتا ہے۔

اے دوست، یہ بات سن کر دل میں بٹھا لے کہ عقل مند لوگ ایسے آدمی کو بڑا نہیں مانتے جو بڑے لوگوں کا ذکر برائی سے کرے۔ انسان کا نصیب، تاج و تخت، حکمرانی اور پکڑ جکڑ اور اختیار جب ختم ہو جاتے ہیں، تو وہ ہر چیز سے گر جاتا ہے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ بزرگوں کے نام عزت سے لے۔ ان کے نیک نام کو بد نہ کہے۔ اگر وہ ایسا ہی کرے گا، تو رہتی دنیا تک اس کا نیک نام باقی رہ جائے گا اور بدنامی سے دور رہے گا۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ)

"آپ ۲۷ تاریخ کو صبح دس بجے آپریشن کے لیے آجائیں۔"

"آپریشن کے لیے کوئی تیاری؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی تیاری نہیں۔" میں نے کہا۔

"کتنے دن لگیں گے مجھے تندرست ہونے میں؟"

"ایک دو دن۔" میں نے جواب دیا "دیکھیے کوئی چیر پھاڑ نہ ہوگی۔ پہلے بے ہوش کیا جائے گا پھر ایک تیز مسکن دوا اور بس۔"

آپریشن سے ایک دن پہلے دوپہر کے وقت مجھے اس کا فون آیا۔ کہنے لگا "ڈاکٹر! آپریشن ملتوی کردیجیے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"آپریشن نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

"کیوں؟ آپ نے ارادہ بدل لیا ہے کیا؟"

"نہیں۔" وہ ہنسا "میں نے ارادہ نہیں بدلا۔"

دفعتہ مجھے ایک خیال آیا۔ "وہی منظر دیکھا ہے کیا؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا:

"یہ منظر پورا نہیں ادھورا تھا۔"

"پوری بات بتائیے۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسا اور بولا: "میں آپریشن ٹیبل پر لیٹا ہوا تھا۔ آپ نے پوری تیاری کرلی تھی۔ لیکن ڈاکٹر آسمند....." وہ رک گیا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر آسمند کو؟"

اس نے بتایا "ایک کٹے ہوئے ہاتھ نے اسے آپریشن کرنے سے روک دیا۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ ہنسا اور بولا۔ "میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

"لیکن آپ کل آئیے گا ضرور!" میں نے چلا کر کہا۔ اس نے مایوسی ظاہر کی مگر جب میں نے اصرار کیا تو اس نے آنے کی ہامی بھرلی۔

میں نے فون پر ڈاکٹر آسمند کو ندیم کی بات سے آگاہ کیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ کہنے لگے "کیا کٹا ہوا ہاتھ اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ مجھے آپریشن سے روک سکے؟ فضول بات! ڈاکٹر! آپ ایسی باتوں سے متاثر نہ ہوا کریں۔ یہ رویہ ہمارے پیشے کے منافی ہے۔ آپ کے کیرئیر میں حائل ہوگا۔"

ندیم عین وقت اسپتال پہنچ گیا۔ ہم نے اسے مسکن دوا دے کر میز پر لٹا دیا۔ پھر اس کی آنکھ سن کرنے میں مصروف ہوگئے۔

ڈاکٹر آسمند کو سوا دس بجے پہنچنا تھا لیکن ساڑھے دس بج گئے اور وہ نہ آئے۔ پونے گیارہ بجے سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے فون آیا کہ ڈاکٹر آسمند حادثے کا شکار ہوگئے ہیں۔ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔ میں نے نرس سے کہا۔ یہ جب ہوش میں آجائیں، تو انھیں گھر بھجوا دیں۔ پھر خود سول اسپتال پہنچا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ بایاں ہاتھ بری طرح زخمی ہوا ہے۔

چوتھے دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں زہر پھیل چکا۔

اور پانچویں دن ان کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

دفعتہ کٹے ہوئے ہاتھ کا مفہوم میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے بھاگ کر ندیم کو فون کیا۔ کوئی خاتون بولی:

"ندیم تو چلے گئے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ بولی۔ "وہ تو ہمارے ہاں مہمان کی حیثیت سے آئے تھے۔"

☆☆

دو مہینے بعد ڈاکٹر آسمند اور میں اکٹھے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر بڑی حسرت سے اپنے کٹے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر یاد ہے آپ نے کہا تھا، کیا کٹا ہوا ہاتھ اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ مجھے آپریشن سے روک سکے؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "یاد ہے۔ میں یہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔" ڈاکٹر آسمند منمنایا۔ "کبھی نہیں۔ میں اپنا ہاتھ کھو بیٹھا لیکن اس کیس کی بنا پر میرا ذہن پیشے کی زنجیروں سے آزاد ہوگیا۔"

دوست کی گاڑی میں سوار ہوا، تو چھوٹتے ہی بولا:

وہ ''تمھاری گاڑی بڑی کھٹارا ہے؟''

اس کے گھر گیا، تو سامان آرائش دیکھ کر کہا: ''اوہ! تم نے اب تک گھر کا سامان نہیں بدلا۔''

بچے دیکھے تو بولا: ''ماشاء اللہ! کتنے پیارے بچے ہیں۔ لیکن تم انھیں اس سے زیادہ خوبصورت کپڑے نہیں پہنا سکتے؟''

خاتون خانہ نے کھانا پیش کیا۔ بے چاری نے گھنٹوں باورچی خانے میں کھپ کر کھانا تیار کیا تھا۔ وہ بولا: ''آپ نے چاول کیوں نہیں پکائے؟...... اوہ! اس میں نمک کم ہے۔ یہ ڈش تو مجھے ذرا پسند نہیں۔''

آپ نے تو نہیں پکڑ رکھی

تنقید کی چھڑی

آدابِ اسلامی کی روشنی میں زندگی سہل و خوشگوار بنانے والے تیر بہدف مشورے

ڈاکٹر غلام رسول



ایک بار وہ پھلوں کی دکان پر گیا۔ دکان قسم قسم کے پھلوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ پوچھتا ہے: ”آم ملیں گے؟“

دکان دار نے جواب دیا: ”جی نہیں، آم گرمیوں میں ہوتا ہے۔“

پوچھتا ہے: ”تربوز ہے؟“

دکان دار: ”نہیں۔“

وہ غصے میں لال پیلا ہو کر کہنے لگا: ”آپ کے پاس کوئی چیز نہیں تو یہ دکان کیوں کھول رکھی ہے؟“ وہ بھول جاتا ہے کہ دکان میں پھلوں کی پچاس سے زائد اقسام موجود ہیں۔

بی بابا ایک مسلسل تنقید کر کے آپ کو زچ کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ انھیں جو کوئی چیز پسند آ جائے۔ خریدار لگانے میں انھیں صرف وہاں نظر آتا ہے جو انجانے میں کر پڑا تھا۔ صاف پڑھی [illegible] حرف بیانی کا وہی دھبا دکھائی دیتا ہے جو غلطی سے لگ گیا۔ کتاب میں انھیں کہیں پروف کی غلطی نظر آ جاتی ہے۔ ان کی نگاہ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہ ہمیشہ نکتہ چینی کرنے اور عیب جوئی کا موقع ڈھونڈ نکالنے والے لوگ ہیں۔

ایک شخص طویل عرصے تک میرا ہم جماعت رہا۔ ہمارے تعلقات اب بھی قائم ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ اس نے آج تک کسی شے کی تعریف کی ہو۔ ایک بار میں نے اس سے اپنی کتاب کے بارے میں پوچھا جس کی لوگوں نے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کے بیسیوں نسخے اب تک نکل چکے۔ اس نے سرد مہری سے کہا: ”اچھی کتاب ہے۔ لیکن اس میں فلاں واقعہ غیر مناسب ہے۔ پرنٹ کا معیار بھی مجھے پسند نہیں آیا۔ طباعت بھی گھٹیا قسم کی ہے اور...“

ایک روز پوچھا کہ فلاں رہنما کا انداز تقریر کیسا ہے؟ اس نے تقریر کا کوئی اچھا پہلو بیان نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اب میں کسی بھی شے کے متعلق اس سے رائے نہیں پوچھتا۔

بعض افراد مثالیت (Idealism) کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا شخص چاہتا ہے کہ اس کی بیوی چھوٹے سے گھر کو شیشے کے مانند چمکا کر رکھے۔ بچے سارا دن صاف ستھرے اور استری شدہ رہیں۔ مہمان آئیں تو انھیں فوراً کھانا ملے۔ بیوی کے پاس بیٹھے تو وہ اس سے خوبصورت باتیں کرے۔ کسی قسم کی شورش پیدا نہ ہونے دے۔ بچے بھی ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اپنے رفقائے کار اور [illegible]، محلے، مارکیٹ، بازار میں ملنے والے ہر شخص سے وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کا رویہ سو فیصد ٹھیک ٹھاک ہو۔

ملنے جلنے والے لوگوں میں سے کوئی ذرا بھی کوتاہی کرے، تو وہ اپنی تیز دھار زبان سے جا بے جا تنقید کر کے اور قدم قدم پر نکتہ چینی سے دوسروں کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ لوگ اس سے اکتا جاتے ہیں کیونکہ اسے خیر اور بھلائی کے پہلوؤں میں بھی صرف برائی ہی دکھائی دیتی ہے۔ جس شخص کی یہ عادت ہو، اس نے دراصل خود کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔ قریبی رشتے دار بھی اس سے کتراتے اور اس کی صحبت کو ثقیل سمجھتے ہیں۔ کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے

اذا انت لم تشرب مرارا علی القذا
ظمئت وای الناس تصفو مشاربہ!!

(اگر تم بار بار پانی پینے سے انکار کر دو گے تو پیاسے رہ جاؤ گے۔ بھلا کتنے لوگ ہیں جنھیں صاف پانی ملتا ہے؟)

اذا کنت فی کل الامور معاتبا
رفیقک لم تلق الذی ستعاتبہ

(تم ہر کام میں اپنے ساتھی پر نکتہ چینی کرو اور اسے ڈانٹ پلاؤ گے تو یاد رکھو! ایک وقت آئے گا جب تمہاری ڈانٹ برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔)

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے: ”واذا قلتم فاعدلوا“ ”اور جب تم بات کرو تو انصاف سے کرو۔“

حضرت [illegible] رسول اللہ ﷺ کا [illegible] اپنے رویے

بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ چاہت ہوتی تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔" جی ہاں، رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے: "اللہ! میں نے نو سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کوئی کام کیا اور آپ ﷺ نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ پر آپ نے کبھی نکتہ چینی نہیں کی اور واللہ! کبھی آپ نے مجھے اف کہا۔"

رسول اللہ ﷺ شرافت و نیکی کا اعلیٰ ترین معیار تھے اور ہمیں ان جیسا بننے کی سعی کرنی چاہیے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کوئی خدانخواستہ غلط بات ہوتے دیکھ کر بھی خاموش رہنے کی جرأت نہیں ہے رہا۔ لیکن جو شے اور خاص طور پر دنیاوی معاملات میں ایسی نہ چھیے اور حالات کے مطابق چلنے کی کوشش کیجیے۔

آپ کے گھر مہمان آتا ہے۔ آپ اسے چائے پیش کرتے ہیں۔ وہ پیالی میں جھانک کر بتاتا ہے: "آپ نے پیالی کیوں نہیں بھری؟"

آپ کہتے ہیں: "چینی اور چائے ڈال دوں؟"

وہ بتاتا ہے: "نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ پانی مانگتا ہے۔ آپ پانی کا گلاس پیش کرتے ہیں۔ وہ پی کر کہتا ہے: "پانی ٹھنڈا نہیں تھا۔"

پھر وہ ایئر کنڈیشنر کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے: "یہ اے سی ٹھنڈک نہیں کرتا۔" اور گرمی کا رونا رونے لگتا ہے۔

بتائیے ایسے انسان کا وجود آپ کے لیے کس بات کا باعث ہوگا؟ آپ تمنا کریں گے کہ وہ آپ کے گھر سے چلا جائے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ ثابت ہوا کہ لوگ زیادہ تنقید پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ کسی جگہ سمجھتے ہیں کہ یہاں تنقید کی ضرورت ہے تو اسے خوش نما غلاف میں لپیٹ کر دوسروں کے سامنے پیش کیجیے۔ بالواسطہ مناسب الفاظ میں یا مشورے کے انداز میں

کنو کھاؤ کنو

پہلا دوست: کل میں نے اپنے ابا سے کہا کہ مجھے ایپل یا بلیک بیری خرید دیں۔

دوسرا دوست: انھوں نے کیا کہا؟

پہلا دوست: کہنے لگے، بیٹا، یہ کنوؤں کا موسم ہے۔ کنو کھاؤ کنو۔

تنقید کریں۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی کی غلطی ملاحظہ کرتے تو منہ پر اس کا اظہار نہ کرتے بلکہ فرماتے: "لوگوں کو کیا ہے کہ وہ ایسا اور ایسا کرتے ہیں؟"

ایک دن تین نوجوان مدینہ آئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے عبادت اور نماز کی کیفیت کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔ انھوں نے ازواج نبی ﷺ سے آپ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھا۔ امہات المومنین نے انھیں بتایا کہ آپ ﷺ کبھی روزہ رکھتے ہیں اور کبھی نہیں رکھتے۔ رات کا کچھ حصہ سوتے ہیں اور کچھ حصہ نماز پڑھتے ہیں۔

یہ سن کر تینوں نے اپنا اپنا فیصلہ کیا۔ ایک نے کہا: "میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔" دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزے رکھوں گا۔" تیسرے نے کہا: "میں رات کو آرام کے بجائے ہمیشہ تہجد پڑھا کروں گا۔" ان تینوں کی یہ باتیں رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئیں۔

آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا بیان فرمائی اور فرمایا: "کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے یہ اور یہ باتیں کی ہیں۔ لیکن میں تو نماز پڑھتا اور آرام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔"

ایک اور موقع پر نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ بعض نمازی

دوران نماز آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ غلطی تھی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ نماز کے دوران سجدہ گاہ پر نظر رکھی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "چند لوگوں کو کیا مشکل ہے کہ وہ نماز کے دوران آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔"

اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو آپ ﷺ نے نام لیے بغیر توجہ دلانے کے لیے صرف اتنا کہا: "یہ لوگ اس کام سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔"

مدینہ میں ایک لونڈی، بریرہ آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے آقا سے بات کی۔ آقا نے کچھ رقم ادا کرنے کی شرط لگائی۔ بریرہ حضرت عائشہ کے پاس آئی اور ان سے مدد کی طالب ہوئی۔ ام المومنین نے کہا: "تم چاہو تو میں تمھیں رقم دے دوں گی مگر تمھارا حق ولاء (آزادی کی نسبت) میری ہو گی۔"

بریرہ نے اپنے آقا سے بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھائے۔ آزادی کی قیمت حاصل کرے اور نسبت بھی۔ حضرت عائشہ نے اس بارے میں نبی ﷺ سے دریافت فرمایا۔ آپ ﷺ کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ بریرہ کا آقا کتنا لالچی ہے کہ سب چیزوں کی لونڈی کو آزاد ہونے سے روک رہا ہے۔ آپ ﷺ نے عائشہ سے فرمایا: "تم اسے خرید کر آزاد کر دو۔ ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔"

> جس نے ایسی شرائط عائد کیں جو کتاب اللہ میں نہیں، اسے کچھ نہیں ملے گا، چاہے سو شرطیں لگاتا پھرے۔

رسول اللہ ﷺ پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: "چند لوگوں کو کیا ہو گیا ہے (نام نہیں لیا) کہ وہ ایسی شرائط عائد کرتے ہیں جن کا کتاب اللہ میں کوئی وجود نہیں۔ جس نے ایسی شرائط عائد کیں جو کتاب اللہ میں نہیں، اسے کچھ نہیں ملے گا، چاہے وہ سو شرطیں لگاتا پھرے۔"

جی ہاں! بالکل اسی طرح دوسرے بندے کا اشارہ دیجیے لیکن مارے سے اشتیاق بیٹی کی جگہ گھر کی صفائی ستھرائی پر توجہ نہیں دیتیں تو آپ ان سے کہہ سکتے ہیں: "کل رات میں نے فلاں دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ اس کے گھر کی صفائی کا کیا کہنا، شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔"

آپ کا صاحبزادہ نماز پڑھنے مسجد نہیں جاتا تو اس سے کہیے: "خالد صاحب (پڑوسی) کے بیٹے کو جب نماز میں مسجد میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ لوگ تنقید کیوں پسند نہیں کرتے؟ دراصل تنقید انسان کو کوتاہی کا احساس دلاتی ہے۔ ظاہر ہے کوئی آدمی اپنے آپ کو کوتاہ باور نہیں کرنا چاہتا۔ کہتے ہیں کہ ایک سادہ لوح آدمی کو یہ شوق ہوا کہ اسے کسی شے میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق ہونا چاہیے۔ اس نے پانی کے دو تھرماس لیے، ایک سبز اور دوسرا سرخ۔ انھیں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے بھرا، پھر راستے میں بیٹھ گیا اور آواز لگانے لگا: "ٹھنڈا ٹھنڈا پانی، بالکل مفت۔"

کوئی پیاسا اس کی طرف آتا اور سبز تھرماس سے پانی پینے لگتا تو وہ کہتا: "نہیں سرخ سے پیو۔" وہ سرخ سے پی لیتا۔ دوسرا آتا اور وہ سرخ تھرماس سے پینا چاہتا تو کہتا: "نہیں سبز تھرماس سے پیو۔"

کسی نے اعتراض کیا کہ دونوں برتنوں کے پانی میں کیا فرق ہے؟ وہ بولا: "پانی ٹھنڈا کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ آپ کو اچھا لگتا ہے تو پانی پی لیجیے ورنہ کوئی اور انتظام کر لیں۔" یہ دراصل انسان کے اندر اس احساس کا اظہار ہے کہ اسے معتبر اور اہم گردانا جائے۔

آخر میں یہی گزارش ہے کہ شہد کی مکھی کی طرح عمل اپنائیے جو پھولوں پر بیٹھتی اور گندگی سے دور رہتی ہے۔ اس مکھی کی طرح نہ بنیے جو ہمیشہ گندگی اور زخموں کی تلاش میں رہتی ہے۔



عوام کی بھی تو سنیے

پاکستان ایک عام آدمی کی نظر میں

برسوں سے وطن عزیز کے ناگفتہ بہ حالات کا مشاہدہ کرنے والے حساس پاکستانی کا حقیقت افروز تجزیہ

حافظ محمد سعد اللہ

میرا قومی ذرائع ابلاغ سے دیرینہ تعلق ہے۔ کبھی کبھار بین الاقوامی میڈیا سے بھی کچھ دیکھنے پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں غلطاں ہوں کہ آخر پاکستانی قوم کے قدم ترقی کے زینے پر چڑھنے کے بجائے پیچھے ہی کیوں اٹھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب تحقیق کے بعد جو میں نے نکالا، وہ دردناک ہے۔ گو قارئین اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔

اب آیئے میں اپنا تجزیہ بیان کرتا ہوں۔ بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ آج پاکستان کے حالات دیکھ کر وہی مجھے بار بار یاد آتی اور خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک گداگر کے گھر میں بچہ پیدا ہوا۔ وہ ماں کے ساتھ جھونپڑی میں سویا ہوا تھا کہ ایک بڑا سا چوہا آیا اور اس کے منہ پر جگہ جگہ سے کاٹ ڈالا۔

اتفاق سے ماں اور باپ دونوں قریب نہ تھے۔ چنانچہ چوہے نے بچے کا منہ لہولہان کر دیا۔ جب ماں آئی اور بچے کا زخموں سے بھرا چہرہ دیکھا، تو بہت غمزدہ ہوئی۔ چیخ کر شوہر کو بلایا کہ بچے کا علاج کرایا جائے لیکن جیسے ہی باپ نے بچے کا زخم آلود چہرہ دیکھا، تو بیوی کو مبارک باد دیتے ہوئے بولا ”نیک بخت سمجھ جا، اب تیرے نصیب کھل گئے۔“

بیوی حیران و پریشان اس کا منہ تکنے لگی۔ پوچھا ”میرا معصوم بچہ زخمی ہے، چہرہ خون میں نہایا ہوا ہے اور تم کہتے ہو کہ نصیب کھل گئے؟“

گداگر نے بتایا ”تجھے پتا نہیں، لوگ ہمارے بچے کا زخمی چہرہ دیکھ کر زیادہ خیرات دیں گے۔ یوں ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگا۔“ چنانچہ علاج کے متعلق سوچنے کے بجائے ہر روز انہوں نے یہ ترکیب کیا کہ کسی طرح یہ زخم مندمل نہ ہوں۔ کبھی ان پر مرچیں ڈال دے، کبھی نمک تاکہ بچے تڑپتے اور زخم ہرے رہیں۔ یوں لوگ توجہ دیں اور ہماری آمدنی بڑھتی رہے۔

تو جناب یہ تھا اس کہانی کا مختصر خلاصہ جو پاکستان کے موجودہ حالات پر بالکل صادق آتی ہے۔ غور کیجیے اس کہانی کے چار کردار ہیں: بچہ، چوہا، ماں اور باپ۔ بچہ مجبور و مظلوم ہے اور چوہا ایک ظالم و گھس بیٹھیا کردار، ماں رحم دل عورت ہے اور سب کرداروں پر حاوی ایک ظالم، خود غرض شفقت و مودت سے بالکل نا آشنا، ابن الوقت، دولت کا پجاری کردار باپ!

میرا تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان گداگر کی جھونپڑی میں پیدا ہونے والے بچے کے مانند ہے۔ چوہے کی طرح کبھی قدرتی آفات اور کبھی بیرونی طاقتیں اسے اپنے جبر و تشدد کا نشانہ بناتی ہیں۔ کچھ محب وطن طبقہ ماں کے مانند اس کی بھلائی اور بہتری کے لیے آواز اٹھاتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ کچھ طاقتیں اس گداگر باپ کی طرح ہیں جو کبھی نہیں چاہتیں، پاکستان کے مسائل حل ہوں اور یہ ملک ترقی کرے۔

آئیے مثال کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ پاکستان اس وقت جن طاقتوں کے زیر اثر ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) سیاسی طاقتیں (۲) بیوروکریسی (۳) این جی اوز (۴) فوج (۵) مذہبی طاقتیں (۶) بیرونی طاقتیں

درحقیقت یہی طاقتیں پاکستان کے ارباب حل و عقد یا اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہی طاقتیں چاہیں تو پاکستان بام عروج تک پہنچ سکتا ہے۔ اور چاہیں تو پاکستان کو زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار دیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ طاقتیں "گداگر باپ" کا ظالمانہ کردار کس طرح ادا کر رہی ہیں۔

۱۔ سیاسی طاقتیں

ان میں عام طور پر وزرا، حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تمام ارکان اور ان کے حواری شامل ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی اکثریت جائز طریقے سے سیاست میں نہیں آتی۔ نہ ہی سیاست میں آکر جائز طریقے سے کمائی کرنا چاہتی ہے۔ ان کا مطمع نظر ایک ہی ہوتا ہے کہ کس طرح مال بنانا ہے اور بس!

اگر کوئی وزیر، ایم این اے یا ایم پی اے ہے، تو عموماً نہیں چاہتا کہ عوامی فلاح کا کوئی منصوبہ درست وقت پر صحیح انداز میں مکمل ہو۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ عوامی منصوبے لٹکے رہیں، ان منصوبوں کے نام پر فنڈز متواتر ملیں اور ان کا کمیشن بنتا رہے.... گداگر باپ کی طرح جو یہ نہیں چاہتا کہ بچے کے زخم ٹھیک ہوں کیونکہ اس طرح آمدنی میں کمی کا خدشہ رہتا ہے۔

۲۔ بیوروکریسی

کئی لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان پر حکمرانی کرنے والا یہ اصل طبقہ ہے۔ پاکستان کا دفتری نظام ان کے کنٹرول میں ہے۔ سیکرٹری سے لے کر خاکروب تک سب اپنی مملکت کے مطلق العنان حکمران ہیں۔ جب بھی پاکستان کی فلاح و بہبود کا کوئی حقیقی منصوبہ شروع ہو، تو بیوروکریسی عملی صورت میں اسے تبھی لاگو کرتی ہے جب تک بیچ میں آنے والے تمام بیوروکریٹ اپنا اپنا حصہ حاصل کر لیں۔

یوں جو منصوبہ ایک لاکھ روپے کا ہے، عوام تک پہنچتے پہنچتے ۳۳ ہزار کا رہ جاتا ہے۔ پاکستان کا کوئی ہمدرد حکمران، سیاست دان یا سرکاری افسر ایمانداری سے منصوبے کی تکمیل چاہے بھی تو گداگر باپ کی طرح ظالم بیوروکریسی اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

۳۔ این جی اوز

یہ غیر سرکاری تنظیمیں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ پاکستان کو کب کوئی زخم لگے۔ یہ دعائیں مانگتی ہیں کہ کاش پاکستان میں کوئی سیلاب آجائے، کوئی بڑا زلزلہ آئے، کسی ملالہ کو دہشت گرد گولی مار دے، کسی مختاراں مائی سے زیادتی ہو جائے، کسی لڑکی پر کوئی نامور شخص تیزاب ڈلوا دے۔ یا اور کچھ نہیں، تو اسکولوں میں دہشت گرد گھس کر بچوں کے خون کی

ندیاں بہادیں، یا اسکولوں کو بموں سے اڑا دیں۔

یوں انھیں بیرون ممالک یہ واویلا کرنے کا موقع ملے گا کہ پاکستان میں ظلم ہوتا ہے، سیلاب آتے ہیں، جہالت ہے.....اور ہم یہ معاملات حل کرنے کے نام پہ گداگری کریں، زیادہ سے زیادہ ڈالر اکٹھے کریں اور رقم میں سے اپنا حصہ بقدر جثہ وصول کریں۔ اگر بچ جائے تو ضرورت مندوں تک پہنچیں۔ گداگر باپ کی طرح یہ تنظیمیں بھی نہیں چاہتیں کہ پاکستان کے زخم ٹھیک ہوں۔ بلکہ ان کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان کے زخم تازہ رہیں اور ان کی جیبیں ڈالروں، نوٹوں سے بھری رہیں!

۴۔ فوج

پاکستان کے ارباب حل عقد میں ایک طبقہ فوج کا بھی ہے۔ یہ واحد حکمران طبقہ ہے جس پر کسی حد تک پاکستانی عوام اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب فوج میدان جنگ یا سرحدوں کی حفاظت میں مشغول ہو۔ جب بھی فوج اقتدار میں آ جائے، تو اسے بھی حرص و طمع آ گھیرتی ہے۔ پھر جرنیل بھی سیاستدانوں کی طرح پاکستان کے زخم کریدنے لگتے ہیں۔ بیوروکریسی میں ان کا اثر بڑھ جاتا ہے تو وہاں سے بھی اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ الغرض فوج پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مشغول ہو، تو گداگر بچے کی ماں کا اور سیاست و حکومت میں ہو تو باپ والا کردار ادا کرتی ہے۔

۵۔ مذہبی طاقتیں

ہمارے ہاں مذہبی طاقتوں کا بھی بااثر طبقہ ہے۔ ان سب کا اپنا اپنا الگ حلقہ ہے۔ چند مذہبی راہنماؤں کے علاوہ جنھیں انگلیوں پہ گنا جا سکتا ہے، بقیہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کا حلقہ اثر وسیع ہوتا رہے۔ ان کا نظریہ، مسلک و عقیدہ ہی پاکستان کا سرکاری مذہب بن جائے۔ ان کے علاوہ جو بھی سامنے آئے، اسے اڑا دو۔ جیسے بھی ہو صرف اپنی بات منواؤ، دوسرے کی بات نہ تو سنو اور نہ مانو، چاہے اس سے ملک میں فساد پھیل جائے۔ عالمی سطح پر کتنی بھی بدنامی کیوں نہ ہو، تم اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کی لچک یا کمزوری نہ دکھاؤ بلکہ ہر حال میں بہانگ دہل اپنے نظریات مسلط کرنے میں لگے رہو۔

۶۔ بیرونی طاقتیں

جب پاکستان کی پانچ اندرونی طاقتیں اس کی صحت و سلامتی، خوشحالی و امن کی خاطر نہیں بلکہ گداگر باپ کی طرح صرف اپنا الو سیدھا کرنے میں لگی ہوں، تو لامحالہ بیرونی طاقتوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تب وہ اندرونی طاقتوں میں اپنے ہمدرد تلاش کرتی ہیں۔ پھر اپنے ہمدرد مضبوط اور مخالفین کمزور کرنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے پاکستان کا مفاد نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنا حلقہ اثر بڑھانا چاہتی ہیں۔

کبھی پاکستان کے زخم مندمل ہونے پر آ بھی گئے، تو یہ طاقتیں ڈالر تقسیم کر ان زخموں کو ڈرون حملوں، ٹارگٹ کلنگ، مذہبی عبادت گاہیں اڑانے، سرحدوں پہ جنگی صورت حال پیدا کرنے اور قومی تعصبات پر حملوں کے ذریعے کریدنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ گداگر کی جھونپڑی میں پیدا ہونے والا یہ غریب بچہ زخموں میں تڑپتا رہے.....اور گداگر باپ کی طرح اس کے ارباب حل و عقد زخم دکھا دکھا کر بیرونی طاقتوں کے سامنے مشکول اٹھائے خیرات مانگتے رہیں۔ عالم اسلام کی یہ واحد ایٹمی طاقت کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو اور نہ اس میں اتنا اعتماد آئے کہ دوسروں سے آنکھ ملا کر بات کر سکے۔

اس مضمون کے تناظر میں پوچھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے مسائل کا حل کیا ہے؟ جواب یہی ہے کہ پاکستان کے عوام نہ تو کرپشن کا حصہ بنیں اور نہ کرپٹ لوگوں کو اپنے درمیان پنپنے دیں۔ ورنہ زخموں سے چور بچہ چیختا چلاتا اور تڑپتا ہی رہے گا۔ چہرے بدل بدل کے آنے والے گداگر اس کا زخموں سے چور چہرہ دنیا کے سامنے نت نئے انداز سے پیش کر کے اپنا کاسہ گدائی بھرتے رہیں گے۔

◆◆◆

سچا واقعہ

ایک جھوٹے نے سرِعام کھائی

جھوٹی قسم

بدی کا بدلہ بھلائی سے دینے والے
ایک نیک طینت انسان کی ایمان افروز کہانی

ڈاکٹر ممتاز عمر

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہر کوئی مشرق وسطیٰ جا کر دولت کمانے کے چکر میں تھا۔ اس کے لیے لوگ ایجنٹوں کو بڑی بڑی رقوم بھی دیتے۔ میرے ایک محلے دار، حاجی نعیم بخش کے تعلقات صدر مملکت کے بھائی سے استوار تھے۔ وہ ان کی مدد سے سعودی عرب کا ویزا لینے میں کامیاب رہتے۔ ان کا ذاتی کاروبار مستحکم تھا مگر مقامات مقدسہ کی زیارت معمول رہا۔ حج یا عمرے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ سعودی عرب میں قیام یا وہاں ملازمت کبھی بھی ان کا مطمح نظر نہ رہا۔ مگر جب دوست احباب کو صدر مملکت کے بھائی سے تعلق داری کا اندازہ ہوا، تو دباؤ ڈالنے لگے کہ ویزا لینے میں وہ ان کی مدد کریں۔

آخر حاجی صاحب نے عمرے پر جانے والے ۱۲۰ افراد کو سعودی عرب لے جانے اور وہاں ملازمت دلانے کی خاطر اپنے دوست کے ذریعے ویزے حاصل کر لیے۔ ابتدا ایک ماہ کے ویزے تھے۔ یہ سب لوگ سعودی عرب گئے اور عمرے کے بعد ملازمت پانے کی کوشش کرتے رہے۔

نصف سے زائد ملازمت کے حصول میں کامیاب ہوئے جبکہ باقی واپس آ گئے۔

واپس آنے والوں نے ملازمت کے حصول میں ناکامی کو اپنے مقدر پر چھوڑا۔ کچھ نے خرچ ہونے والے پندرہ ہزار روپے پر کفِ افسوس ملا، تو بعض یہ کہتے نظر آئے کہ پیسا آنی جانی شے ہے۔ اس بہانے عمرے کی سعادت تو نصیب ہو گئی۔ ناکام لوٹنے والوں میں حاجی صاحب کے محلے دار نعمان صاحب بھی شامل تھے۔ وہ پہلے تو خاموش رہے مگر چند دن بعد حاجی صاحب پر یہ الزام لگاتے نظر آئے:



”انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ملازمت دلائیں گے۔ اسی خاطر میں نے تیرے میرے سے پیسے جمع کیے اور اپنی بیوی کا کچھ زیور بیچ کر پندرہ ہزار روپے انھیں دیے۔ چونکہ ملازمت دلانے میں حاجی صاحب ناکام رہے لہٰذا انھیں میری رقم واپس کرنا ہوگی۔“

رفتہ رفتہ نعمان صاحب کی الزام تراشی جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ جھگڑا کم و بیش ہر روز کسی نہ کسی نماز کے بعد مسجد میں ہونے لگا۔ لوگ الزامات، جواب اور وضاحتیں سنتے اور اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کی طرفداری کرنے لگتے۔ جھگڑا پہلے زبان سے ہوتا تھا ایک روز نوبت ہاتھا پائی تک آگئی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا۔ اس تلخی کے دوران ناروا گفتگو، بدتہذیبی میں بدلی تو یوں مسجد کا تقدس بھی پامال ہوا۔ جب دونوں فریق خاموش ہوئے، تو ایک بزرگ حاجی شبیر احمد دہلوی نے کھڑے ہو کر کہا ”یہ جھگڑا جو بھی ہے، بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ دونوں حضرات افہام و تفہیم سے مسئلہ حل کریں۔“

حاجی نعیم بخش نے برجستہ کہا ”حاجی صاحب! میں آپ کو اپنا حاکم مقرر کرتا ہوں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے منظور ہوگا۔“

اسی دوران نعمان صاحب بھی بولے ”حاجی صاحب! میں بھی آپ کو اپنا حاکم مقرر کرتا ہوں۔“

یوں دونوں فریقین نے حاجی شبیر احمد دہلوی کو اپنا منصف مقرر کر لیا۔ حاجی شبیر احمد پہلے تو بڑے جز بز ہوئے۔ کہنے لگے ”میں اتنی بڑی ذمے داری کیسے لے سکتا ہوں؟ یہ بڑا جھگڑا ہے۔“

مگر تمام نمازیوں نے یک زبان ہو کر کہا ”حاجی صاحب! جب دونوں فریق آپ کو فیصلے کا اختیار دے رہے، تو آپ معاملہ سن کر فیصلہ کریں کیونکہ یہ جھگڑا زبانی سے ہاتھا پائی تک پہنچ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بڑھتے بڑھتے کسی کی جان چلی جائے۔“

اندھا رہبر

علم دین بڑھانے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دنیا کمانے کے لیے۔ جس نے پرہیزگاری، علم، تقویٰ فروخت کیا، گویا اس نے غلہ جمع کیا اور پھر سب کو آگ لگا دی۔ گناہوں سے نہ بچنے والا عالم اندھا ہے اور اس کے ہاتھ میں مشعل ہے جس کے ذریعے سے راہ دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر وہ خود راہ نہیں دیکھتا۔ پس اس نے بے حد بیکار زندگی بسر کی، گویا ایسا شخص جس نے کوئی چیز نہ خریدی مگر روپیہ پیسا کوزے میں پھینک آیا۔

بادشاہ عقل مندوں سے حسن ظن اور پرہیزگاروں سے دینی کمال حاصل کرتا ہے۔ بادشاہ عقل مندوں کی نصیحت کے اس سے زیادہ محتاج ہیں جس قدر عقل مند بادشاہوں کے تقرب کے۔ اے بادشاہ، اگر تو کوئی نصیحت سننا چاہتا ہے، تو تمام کتابوں میں اس سے بہتر کوئی نصیحت نہیں ہے کہ حکومت عقل مند کے سوا کسی اور کے سپرد نہ کر۔ اگرچہ عقل مند کے نزدیک حکومت کے امور سنبھالنا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ، انتخاب: تیمور طاہر، لاہور)

حاجی شبیر جو بڑے جوش و خروش سے دونوں فریقوں کو صلح صفائی کی تلقین کر رہے تھے، خود پر آنے والے بوجھ کا ادراک کر کے گھبرا رہے تھے۔ جب لوگوں کا اصرار بڑھتا گیا، تو انھوں نے فریقین کی بات بغور سنی۔

اس موقع پر نعمان صاحب نے کہا ”مجھ سے رقم لیتے وقت حاجی نعیم بخش نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ملازمت دلائے گا ورنہ پیسے واپس دے گا۔“

اس پر نعیم بخش بولے ”یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے تمام لوگوں کو کہا تھا، جو خرچہ بھی ہو رہا ہے، وہ کرائے اور قیام و طعام

کا ہے۔ ملازمت حاصل کرنا آپ کی ذاتی کوشش پر ہوگا۔ اس کے لیے مزید رقم بھی آپ کو خرچنا ہوگی۔ جو لوگ وہاں ملازمت حاصل کر چکے، ان سب نے ایسا ہی کیا اور جو واپس آگئے ہیں، ان میں سے نعمان کے سوا کسی نے رقم کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا۔"

اتفاق سے مسجد میں ناکام واپس آنے والوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اس لیے ان دونوں کے حق اور مخالفت میں گواہی کا امکان جاتا رہا۔ حاجی شبیر نے معاملہ کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرنا چاہا، تو فریقین اور وہاں موجود لوگوں نے کہا "آپ حالات و واقعات مدنظر رکھ کر فیصلہ کر دیں تاکہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"

حاجی شبیر نے نعمان سے کہا "آپ نے جو کچھ کہا، کیا قسم کھا کر یہ بیان دہرانے کو تیار ہیں؟"

وہ بولے "ہاں میں مسجد میں بیٹھ کر ایسا کرنے کو تیار ہوں۔"

ابھی ان کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ حاجی نعیم بخش بولے "میں بھی قسم کھا کر اپنا بیان درست ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔"

حاجی شبیر بولے "آپ خاموش رہیے۔ چونکہ آپ دونوں نے مجھے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے، اس لیے میں جس سے بات کروں وہی جواب دے۔ قسم ایک شخص ہی کھائے گا۔"

حاجی نعیم بخش بڑی بے چینی سے بولے "تو اس طرح میں جھوٹا اور یہ سچا ثابت ہو جائے گا۔"

حاجی شبیر احمد نے کہا "سچے اور جھوٹے کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ آپ خاموش رہیے اور فیصلہ جو بھی ہو اسے ماننے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آوازوں کی بھنبھناہٹ کچھ بڑھنے لگی۔ حاجی شبیر احمد دہلوی نے نعمان صاحب سے کہا "آپ اللہ کی قسم کھا کر اپنا موقف بیان کریں۔" انھوں نے قسم کھا کر اپنا سابقہ بیان دہرایا۔ اس دوران حاجی نعیم بخش اضطراب و بے چینی کی کیفیت میں آنکھوں میں آنسو سجائے خفت و شرمندگی سے دوچار اس طرح بیٹھے تھے کہ آہستہ آہستہ لب ہل رہے تھے اور جسم کانپ رہا تھا۔

جب نعمان صاحب بول رہے تھے، تو مسجد میں خاموشی طاری تھی۔ ہر کوئی آنکھوں میں تجسس لیے ششدر بیٹھا تھا۔ بیان مکمل ہوا۔ حاجی شبیر احمد دہلوی نے سر اٹھا کر بڑے بوجھل انداز میں کہا "حاجی نعیم بخش صاحب! آپ اسے پندرہ ہزار روپے ادا کر دیں۔"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا، حاجی شبیر نے کہا "آپ مسجد میں ان تمام لوگوں کی موجودگی میں اللہ کو گواہ بنا کر یہ کہہ چکے کہ میرا فیصلہ آپ کو منظور ہوگا۔ اس لیے حیل حجت کرنے کے بجائے رقم کی ادائیگی کا وقت بتائیے۔"

حاجی نعیم بخش گویا ہوئے۔ ان کی آواز یوں لرز رہی تھی گویا رنج و غم کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے پکار رہے ہوں۔ بولے "میں نماز عصر کے بعد مسجد کے منبر پر پندرہ ہزار روپے رکھ دوں گا۔"

نماز عصر کے بعد حسب وعدہ حاجی نعیم بخش نے سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں منبر پر رکھ دیں۔ تمام نمازیوں کی نگاہیں نوٹوں پر جمی تھیں۔ حاجی شبیر احمد دہلوی نے کہا "نعمان اپنی رقم اٹھا لیجیے۔"

نعمان صاحب بوجھل قدموں سے آگے بڑھے، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے اور بیٹے کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے گن کر کہا "پورے ہیں۔" پھر دونوں باپ بیٹے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

حاجی نعیم بخش اٹھے اور حاجی شبیر احمد سے گلے لگ کر رندھی آواز میں کہنے لگے "حاجی صاحب! مجھے نہیں معلوم آپ نے فیصلہ کن اصولوں پر دیا مگر بظاہر تو یہی لگتا ہے [illegible] اور جھوٹا ثابت کر دیا گیا۔"

شبیر صاحب انھیں تھپتھپاتے ہوئے مسجد سے ایک

گوشے میں لے گئے اور بولے ”بات یہ ہے کہ قسم دعویدار کھاتا ہے۔ اگر دونوں ہی قسم کھا لیں، تو پھر فیصلہ کیسے ہوتا؟ رہی جھوٹ اور سچ کی بات، تو میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا، جھوٹی قسم کا عقدہ چالیس دن میں کھل جاتا ہے۔“

یہ سن کر حاجی نعیم نے کچھ سکون محسوس کیا۔ پھر وہ بھی اپنے گھر چلے گئے۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد یہ سننے میں آیا کہ نعمان صاحب کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو پندرہ ہزار روپے نقد اور ان کی بیوی اور بہو کے زیورات بھی لے گئے۔ اس واقعے کے بعد کئی دن تک وہ گھر سے نہ نکلے۔ پھر جب دوبارہ مسجد آنا شروع کیا تو لوگوں سے نظریں چراتے، آتے اور نماز پڑھ کر فوراً گھر کی طرف پلٹ جاتے۔ ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایک ماہ بعد حاجی نعیم بخش سو سو کے نوٹوں کی سو گڈیاں کپڑے کے ایک تھیلے میں لیے مسجد آئے۔ مسجد کے خازن، حاجی شبیر احمد دہلوی کو پکڑاتے ہوئے کہا ”یہ رقم مسجد کی تعمیر کے لیے ہے۔“

رقم گننے کے بعد حاجی شبیر نے پوچھا ”اتنی بڑی رقم؟“

وہ بولے ”حاجی صاحب اس دن جی چاہتا تھا آپ کا حکم نظرانداز کرتے ہوئے میں بھی قسم کھا کر اپنی بے گناہی کا اعلان کر دوں۔ مگر پھر کسی قوت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ آپ نے کہا تھا کہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ وقت کرے گا، تو میں خاموش ہو رہا۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ چند روز قبل نیا مال خریدا۔ میں نے اس موقع پر عہد کیا تھا کہ جو بھی منافع ہوا، اس کا چوتھائی حصہ مسجد کے لیے وقف کر دوں گا۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے مجھے دس لاکھ روپے فائدہ ہوا اور میں اپنا وعدہ ایفا کرنے آ گیا۔“

یہ سن کر حاجی شبیر احمد دہلوی نے کہا ”حاجی صاحب! اللہ رب العالمین نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے۔ یہ آپ کی محنت اور اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس وقت نہ چاہتے ہوئے بھی میرا فیصلہ مانا۔ آج بھی میری ایک درخواست قبول فرمائیے۔“

حاجی شبیر نے جو درخواست کی، اسے سن کر حاجی نعیم بخش پہلے اپنے گھر گئے۔ پھر حاجی شبیر احمد کے ساتھ نعمان صاحب کے گھر پہنچے، انھیں گلے لگایا اور پندرہ ہزار روپے ان کی جیب میں ڈال دیے۔ اس وقت نعمان صاحب کا عجیب عالم تھا۔ وہ زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ ان دونوں اصحاب سے یہ بھی کہتے جاتے:

”مجھے اپنے کیے کی سزا تو مل چکی، اب دعا کریں کہ اللہ بھی معاف کر دے۔“

◆◆◆

مقدر کا لکھا

کہتے ہیں کہ ایک کمزور جان ماہی گیر کے جال میں ایک طاقتور مچھلی پھنس گئی۔ ماہی گیر اسے کھینچ نہ سکا۔ مچھلی اس پر غالب آ گئی، وہ جال کھینچ کر لے گئی اور پھر اس سے نکل مزے سے پانی میں تیرنے لگی۔

عام طور پر ہر مرتبہ شکاری شکار کر لیتا ہے، مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شکار ہاتھ سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ گویا یہ قانون قدرت ہے کہ شکاری ہر مرتبہ شکار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کو پھر ناکام واپس آنا پڑتا ہے۔ جب دوسروں کو پتا چلا کہ وہ ماہی گیر عمدہ شکار نہیں پکڑ سکا، تو انھیں بہت افسوس ہوا۔ اس پر ماہی گیر نے ان سے کہا کہ وہ میرا رزق نہ تھا، اسی لیے وہ میرے ہاتھ سے بچ نکلی۔

درسِ حیات:

اللہ تعالیٰ سے طلب اپنی حیثیت کے مطابق کرو تاکہ تمھارے برتن میں سما سکے۔ جو چیز مقدر و قسمت میں نہ ہو، وہ کوشش سے بھی ہاتھ نہیں لگتی۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ)

جب کوئی بھی تندرست و توانا انسان کسی موذی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی بڑی انمول ہے۔ ۳۵ سالہ نوجوان محمد سلیمان صدیق بھی اپنی خوشیوں میں مگن جی رہا تھا کہ اچانک اس پر آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ اسی بدنصیب کی المناک داستان ہے۔

وہ خوبصورت اور توانا تھا کہ دیکھنے والا ہر شخص اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔ پھر وہ وقت آیا جب بستہ اٹھائے اسکول جانے لگا۔ والدین کی امیدوں کا مرکز محمد سلیمان تیزی سے جوانی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد والدین اتنے وسائل نہیں رکھتے تھے کہ سلیمان کو کالج داخل کروا سکتے اس لیے خواہش کے باوجود وہ کالج جانے سے محروم رہا اور ایک چھوٹی سی فیکٹری میں بے حیثیت مزدور کام کرنے لگا۔ مہینے بھر کی محنت کے بعد اسے جو تنخواہ ملتی وہ اسے خوشی خوشی والدین کی جھولی میں ڈال دیتا۔

سلیمان کے والد محمد صدیق ریلوے پینٹ ورکشاپ

تندرستی کو کس کی نظر لگ گئی

"مسٹر پاکستان" سے مریض بننے تک

ایک توانا نوجوان کا المناک قصہ جو گردوں کے مرض میں مبتلا ہو کر گور کنارے تک پہنچ چکا

محمد اسلم لودھی



میں ملازم تھے لیکن انھیں اتنی تنخواہ نہ ملتی جس سے گھر کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ محمد صدیق کے کندھوں پر نہ صرف اپنے گھر کا بوجھ تھا بلکہ والدین فوت ہونے پر چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت بھی ان کے ذمے لگ گئی۔ سلیمان کے ملازمت کرنے سے اُسے ایک بڑا سہارا مل گیا۔ جب سلیمان تنخواہ لے کر آتا، تو گھر میں چند دنوں تک اچھا کھانا پکتا پھر پورا مہینا دال روٹی پر ہی گزارا کرنا پڑتا۔ مالی پریشانیوں کے سائے دن بدن گہرے ہو رہے تھے لیکن محنت و مشقت کو انسان [illegible] تک چاہنے والوں کے ہاتھ کبھی نہ تھکے۔ انھیں یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی تو ان کے مقدر بدلیں گے اور وہ بھی اچھے دن دیکھیں گے۔

محمد سلیمان نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، تو خوبصورت' توانا اور مضبوط جسم کا حامل نوجوان نکلا۔ مضبوط اور کسرتی جسم کو دیکھ کر کئی لوگ اسے "مسٹر پاکستان" سے تشبیہ دیتے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب ماموں کی بیٹی سے ان کا رشتہ طے پا گیا۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ والدین اور عزیز و اقارب نے خوب خوشی منائی۔ گھر میں ہر طرف خوشیوں کا بسیرا تھا۔ سلیمان نے نئی زندگی کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے تین چاند سے بچے عطا کر دیے۔ وہ اپنی خوش بختی پر بہت نازاں تھا۔

شادی کے بعد خرچے بڑھے، تو اس نے کوئی اور کام کرنے کا سوچا۔ چناں چہ پین بنانے والی فیکٹری کی ملازمت چھوڑ شاہ عالم مارکیٹ میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ وہ مختلف فیکٹریوں کے بنے پین اور بٹوے خرید کر تھوک کے حساب سے فروخت کرنے لگا۔ اُسے تیس سے پینتیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہونے لگی۔ گھر کے حالات بدلنے لگے اور تنگدستی کی جگہ خوشحالی نے لے لی۔ چھٹی والے دن وہ بیوی بچوں کو لیے کسی عزیز کے گھر جا پہنچتا۔ سارا دن خوب ہلا گلا جاری رہتا۔ اس کی آمد پر بریانی پکتی تو کہیں تکے کباب تیار ہوتے کہیں چکن قورمہ بنتا، تو کہیں شامی کباب پکتے۔ کرکٹ میچ اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے تو کبھی کیرم کی بازی لگتی۔

سلیمان اپنے ننھیال میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ وہ ننھیال پہنچتا، تو گھر کے تمام افراد اس کے لیے آنکھیں بچھاتے۔ تکبر تو اُسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ نہایت سعادت مند نوجوان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلیمان کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس کا شمار شاہ عالم مارکیٹ کے کامیاب کاروباری افراد میں ہوتا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے تین ملازم بھی رکھ لیے۔

ان حالات میں سلیمان کے والد محمد صدیق اور والدہ سکینہ بی بی بہت خوش تھی۔ انھوں نے بچوں کے جوان ہونے پر جس خوشحالی کا خواب دیکھا تھا، وہ اب عملی صورت دھارنے لگا۔ سلیمان کے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں بھی دھوم دھام سے ہوئیں۔ جب ہر طرف سے خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، تو اچانک ایک دن سلیمان وقت سے پہلے گھر پہنچا۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑی تھیں۔ سلیمان کی بگڑتی حالت دیکھ کر والدین سخت پریشان ہوئے۔ وہ اسے لے کر محلے کے ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ بلڈ پریشر زیادہ ہے۔ پھر نمک سے پرہیز کا مشورہ اور دوائی دے کر فارغ کر دیا۔ ایک دو دن بعد طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ سلیمان پھر دکان پر جانے لگا لیکن اب اس میں پہلے والی چستی اور ہمت نہیں تھی۔ اسے ہر وقت نقاہت اور کمزوری کا احساس ہونے لگا۔

ایک دن وہ والد کے ساتھ طبی معائنہ کرانے شالیمار اسپتال گیا جہاں ڈاکٹر نے خون اور پیشاب کے ٹیسٹ لکھ دیے۔ اگلے دن جب ٹیسٹوں کی رپورٹ آئی تو ڈاکٹر نے بتایا، بلڈ پریشر زیادہ رہنے اور احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے بیماری کا اثر گردوں پر پڑ چکا۔ ساتھ ہی گردوں کا ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا۔ جب ٹیسٹ ہوا تو ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھ کر بتایا، گردے خراب ہو چکے۔ اب ڈائیلاسز کروانا پڑے

گا۔ والد نے یہ رپورٹ سلیمان سے دانستہ مخفی رکھی لیکن محمد صدیق کے سر پر آسمان گر گیا۔ وہ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ریٹائرمنٹ سر پر تھی۔ وہ بیٹا جس کے سہارے زندگی ہنسی خوشی گزارنے کے خواب دیکھ رہا تھا، وہی گردوں کے موذی مرض کا نشانہ بن گیا۔ والدہ سکینہ بی بی کو بیٹے کے گردے فیل ہونے کی خبر پہنچی، تو گھڑی کی گھڑی زمین بوس ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی؟

پھر وہ دن آیا جب والد ریٹائر ہو گئے۔ سبکدوشی کے بعد رقم ملی، تو انھوں نے بیٹے کا علاج کروانے کا تہیہ کر لیا۔ جب تکلیف حد سے زیادہ بڑھی، تو سرکاری اسپتالوں میں کئی دن تک سلیمان دھکے کھاتا پھرتا رہا پھر بھی علاج سے محروم رہا۔ والد سے سلیمان کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ وہ بیٹے کو لیے نجی اسپتال پہنچے جہاں چار دن تک سلیمان زیرِ علاج رہا۔ اس دوران تین بار ڈائلاسیز ہوئے۔ جب وہ رخصت ہوا، تو اسپتال والوں نے ایک لاکھ روپے کا بل تھما دیا۔ محمد صدیق خود بھی بلڈ پریشر کا مریض اور بے روزگاری کا شکار تھا۔ اس کے لیے ایک لاکھ روپے بل کی ادائیگی مشکل تھی لیکن نجی اسپتال والے کہاں کسی کا لحاظ کرتے ہیں؟ سرکاری اسپتالوں میں علاج سرے سے موجود ہی نہیں اور نجی اسپتالوں میں جہاں صورت حال کچھ بہتر ہے، وہاں اتنا بڑا بل بنا دیا جاتا ہے کہ انسان خود کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔

بہرکیف والد نے مجبوری کے عالم میں ریٹائرمنٹ کی رقم بیٹے کے علاج پر خرچ کی اور اسے گھر لے آیا۔ لیکن ایک لاکھ روپے خرچ کرنے کے باوجود شفا نہ ہوئی۔ چند دنوں بعد پھر رات کے وقت شدید تکلیف نے سلیمان کو آ گھیرا۔ وہ ہنستا کھیلتا نوجوان چارپائی سے چمٹ کر رہ گیا۔ چند سال پہلے اس کو رشک بھری نظروں سے دیکھنے والے اب اسے پہچاننے سے بھی انکاری تھے۔ زرد چہرہ، لاغر جسم، کمزور اور نحیف آنکھیں اس کی پہچان بن گئیں۔ بیماری نے اسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھا لیا۔

ایک بار پھر اسے شالیمار اسپتال داخل کروا گیا جہاں ڈائلاسیز بھی ہوئے۔ جب صورت حال زیادہ خراب ہوئی، تو اسے شیخ زید اسپتال لے جایا گیا جہاں ایک ہفتہ علاج کروانے پر پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ شفا پھر بھی نہ مل سکی۔ تندرستی اس سے روٹھ چکی تھی۔ اب ہفتے میں دو مرتبہ ڈائلاسیز کروانا اس کا مقدر بن گیا۔

قدرت نے انسانی جسم کو انمول بنایا ہے۔ گردے خون کے مضر صحت اجزا بذریعہ پیشاب خارج کر کے انسانی جسم کو توانا رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس جس مشین کے ذریعے

معذوری پر معذرت کرنا عیب نہیں

ایک دفعہ ایک بزرگ کے پیٹ میں ریح پیدا ہوئی اور اس کی گڑبڑ بڑھ گئی۔ اسے روکنے کی بھی اس میں طاقت نہ رہی اور وہ بے اختیار اور زوردار آواز کے ساتھ خارج ہوئی۔ اس پر بزرگ نے دوستوں کو کہا، جو پاس بیٹھے تھے کہ جو کچھ مجھ سے صادر ہوا، یہ میرے اختیار سے باہر تھا۔ میں اس حال پر قابو پا سکتا تھا۔ یہ ایسا عمل ہے جو فرشتے میرے عمل میں گناہ نہیں لکھتے۔

پس اب میرے پیٹ سے ریح کے نکلنے پر مجھے راحت ملی ہے، اس لیے میری اس خطا کو تم بھی مہربانی فرما کر معاف کر دو۔ مجھے اس حال کی معذوری تھی، معافی کا طالب ہوں۔

عقل والوں نے یہ کہا کہ پیٹ ریح کا قید خانہ ہے۔ کوئی عقل والا ریح کو پیٹ میں بند نہیں رکھ سکتا۔ جب پیٹ میں ریح گڑبڑ پیدا کرے، تو اسے خارج کر دو۔ اس کا اخراج دل پر بوجھ اور برا اثر پیدا نہیں کرتا۔ ریح مثل تخت جان دشمن کے ہے، اگر پیٹ میں پیدا ہو تو اسے ضرور خارج ہونے دو۔ (شیخ سعدی شیرازیؒ)

ڈائلا سیز کیا جائے۔ وہ خون کے اچھے اور مضر اجزا دونوں نکال دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے، ہزاروں روپے خرچ کر کے ڈائلا سیز کروانے کے باوجود جسم اس قدر کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے کہ انسان چل پھر نہیں پاتا۔ پہلے پیٹ میں سوراخ کر کے ڈائلا سیز کیے جاتے رہے۔ پھر بازو میں سوراخ کیا گیا۔ اب گردن میں سوراخ کر کے وہاں سے ہفتے میں دو بار ڈائلا سیز کیے جا رہے ہیں۔

محمد سلیمان کو اس موذی بیماری سے جنگ لڑتے چار سال بیت چکے۔ اس دوران والد کی ریٹائرمنٹ کے تمام روپے خرچ ہو گئے۔ اب گھر میں فاقوں کی نوبت پہنچ چکی، تو ڈاکٹر مرض سے وقتی نجات کا یہی حل بتاتے ہیں کہ بذریعہ آپریشن ایک گردہ تبدیل کروا لیا جائے۔ آپریشن سمیت ایک گردے کی خرید پر دس سے پندرہ لاکھ روپے خرچ آ رہا ہے۔ اب سلیمان ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے ایک راستہ موت کی طرف جاتا ہے، تو دوسرا آپریشن کی جانب۔ اس موذی بیماری کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات نے پورے خاندان کو معاشی بدحالی کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ وہ اتنی رقم نہیں رکھتے کہ گردہ خرید کر لگوا سکیں۔ اس لیے مخیر حضرات کے مالی تعاون کا انتظار ہے۔

☆☆

ایک صحت مند نوجوان کیسے گردوں کی بیماری کا شکار ہوا؟ اس بارے میں حجاز اسپتال کے گردوں کے ماہر معالج، ڈاکٹر طاہر اقبال کہتے ہیں: گردوں کی بیماری خون میں شوگر کے مسلسل زیادہ رہنے اور بلڈ پریشر کے باعث چمٹتی ہے۔ علاوہ ازیں زیادہ طاقت حاصل کرنے کے لیے جو لوگ حکیموں کے کشتے استعمال کریں، وہ بھی امراض گردہ کا شکار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر اقبال نے مزید بتایا، ہر شعبے کا مستند ڈاکٹر مرض ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے علم کے مطابق ادویات تجویز کرتا ہے۔ لیکن اس مرض کے لیے ایک عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر کچھ مختلف ادویات دیتا ہے۔ ادویہ کی مقدار میں کمی و بیشی بھی انسانی صحت اور گردوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

دور دراز علاقوں کی بات چھوڑیں، لاہور میں میڈیکل اسٹوروں پر کام کرنے والے بعض لوگ خود کو ڈاکٹر ظاہر کر مریضوں کو الٹی سیدھی ادویات دینے میں مصروف ہیں۔ عام لوگ ڈاکٹروں کی بھاری فیسوں اور اسپتالوں کے چکر سے بچنے کے لیے قریبی میڈیکل اسٹور والے کو اپنا مرض بتا اور چند گولیاں کھا کر وقتی شفا تو پا لیتے ہیں لیکن اس بدروش سے گردے متاثر ہوتے ہیں۔

پاک اور صاف زندگی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جو سکون اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے میں ملتا ہے، وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر طاہر اقبال نے بہت خوبصورت بات کہی کہ جس طرح آج کل بھینس کو ٹیکا لگا کر چند ہفتے مقدار سے زیادہ دودھ تو حاصل کر لیا جاتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد وہ دودھ دینے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح انسان کے اپنے بس میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کہاں تک اور کب تک صحت اور تندرستی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ زیادتی کسی بھی چیز کی ہو، انسانی صحت پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔

ڈاکٹر طاہر اقبال کا کہنا ہے کہ ڈائلا سیز وقتی علاج ہے، حقیقی صحت گردے تبدیل ہونے سے ہی ملتی ہے۔ کیونکہ قدرت نے گردوں میں گندا خون صاف کرنے کی جو خصوصیت رکھی ہے، وہ انسان کی بنائی مشین میں موجود نہیں۔ بار بار ڈائلا سیز ہونے سے انسان انتہائی نڈھال، کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص صحت مند زندگی کی جانب پھر لوٹ نہیں سکتا۔ آپریشن کے ذریعے گردوں کی تبدیلی ایک طریقہ ہے لیکن بہت مہنگا۔ ایک گردہ خرید کر تبدیل کروانے پر پندرہ سے بیس لاکھ روپے خرچ آتے ہیں جو خریدنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

◆◆◆

حکمت و معرفت کے انمول موتی

[illegible] نے حضور اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: یہ بارہ کلمات تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم سے ماخوذ ہیں، جو صاحب ایمان انہیں ایک ورق پر لکھے اور اسے دیکھے، اس پر عمل کرے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں [illegible] ہو جائے گا، وہ کلمات یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

۱۔ اے فرزند آدم! روزی کا غم نہ کھا اس وقت تک جب تک میرا خزانہ بھرا ہوا ہے اور میرا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔

۲۔ اے فرزند آدم! ظالم بادشاہ اور امیر کبیر سے مت ڈر، جب تک میری سلطنت ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

۳۔ اے فرزند آدم! کسی سے محبت مت کر جب تک تو مجھے پا نہ لے اور مجھے جب تک چاہے گا پائے گا۔

۴۔ اے فرزند آدم! میں نے سب چیزیں تیرے لئے بنائی ہیں اور تجھے اپنے لئے، پس تو اپنے آپ کو دوسروں کے [illegible] مت کر۔

۵۔ اے فرزند آدم! جس طرح میں تجھ سے کل کا عمل نہیں چاہتا اسی طرح تو بھی مجھ سے کل کی روزی مت مانگ۔

۶۔ اے فرزند آدم! جب میں سات آسمان، عرش، کرسی اور سات زمینوں کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا تیرے پیدا کرنے اور روزی دینے سے کیسے عاجز ہوں گا۔

۷۔ اے فرزند آدم! جس طرح میں تیری روزی فراموش نہیں کرتا تو بھی میری عبادت مت چھوڑ اور میرے حکم کے خلاف مت کر۔

۸۔ اے فرزند آدم! جس قدر میں نے تیری قسمت میں روزی لکھ دی اس پر راضی رہ اور نفس اور شیطان کی خواہشوں سے دل کو مت بہلا۔

۹۔ اے ابن آدم! میں تیرا دوست ہوں تو بھی میرا دوست بنا رہ اور [illegible] کے غم سے خالی نہ ہو۔

۱۰۔ اے ابن آدم! میرے غصے سے بے پاک مت ہو جب تک تو پل صراط سے [illegible] میں داخل نہ ہو جائے۔

۱۱۔ اے ابن آدم! تو مجھ پر اپنے نفس کی مصلحت کے باعث غصہ ہوتا ہے اور اپنے نفس پر میری رضامندی کے لئے غصہ نہیں ہوتا۔

۱۲۔ اے ابن آدم! اگر تو میری تقسیم پر راضی ہو گیا تو تو اپنے آپ کو میرے عذاب سے چھڑا لے گا اور اگر تو راضی نہ ہوا تو نفس کو تجھ پر مقرر کر دوں گا تاکہ تیرا نفس جانوروں کی طرح تجھے جنگلوں میں دوڑاتا پھرے [illegible] عزت کی کہ تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا مگر اسی قدر جو میں نے تیرے لئے مقرر کیا ہے۔



نام کتاب: سیدنا محمد ﷺ۔ مصنف: احمد امام شفق ہاشمی۔
ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ڈی۔۳۵، بلاک ۵، ایف بی ایریا، کراچی۔ فون: ۹۲۔۲۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰۔ قیمت درج نہیں۔

یہ سیرت رسول ﷺ پر لکھی خوبصورت انگریزی کتاب ہے۔ یہ دنیا بھر میں بسے انگریزی داں طبقے کے سامنے ہمارے پیارے رسول ﷺ کی حیات مبارکہ کے سنہرے پہلو عمدگی سے سامنے لاتی اور قاری کو راہ راست دکھاتی ہے۔

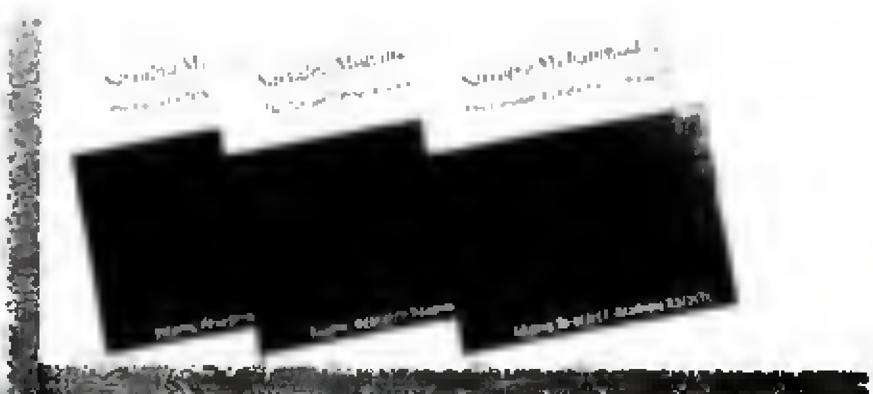
آج کے مادہ پرست دور میں انسان کو آرام و آسائش کی سیکڑوں سہولیات حاصل ہیں۔ لیکن وہ سکون و اطمینان کی دولت سے محروم ہو چکا۔ مگر دور جدید کا انسان نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر صدق دل سے عمل کرے، تو سکون کی دولت پا سکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب یہی عظیم پیغام دیتی اور حیات رسول ﷺ کے لازوال گوشے قاری کے سامنے لاتی ہے۔ کتاب کی پیش کش معیاری ہے۔

☆☆

نام کتاب: اشک ندامت۔ مصنف: رمیز احمد۔ ناشر: حمزہ بک سنٹر، چٹرجی روڈ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۰۰-۸۱۲۴۹۵۸۔ قیمت: ۴۵۰ روپے۔

یہ دور جدید کے ایک مسئلے پر لکھا گیا متاثر کن ناول ہے۔ اس کا موضوع والدین کی وہ خواہشات ہیں جن پر عمل کر کے وہ اپنے بچوں کو صرف ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہیں... اور یہ نہیں دیکھتے کہ بچہ خود کیا بننے کی خواہش رکھتا ہے۔

ناول کا ہیرو، جازب ایک ادیب بنانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ لہٰذا جازب کوئی ادبی تخلیقی شے لکھتا، تو اس کے والد بہت ناراض ہوتے۔ بیٹے



"دنیا میں جینے کے لیے پڑھنا پڑتا ہے۔ اعلیٰ گریڈ لینے پڑتے ہیں۔ یہ مقابلے کا دور ہے بیٹا مقابلے کا!"

والد کا مان رکھنے اور انھیں عزت، دولت اور شہرت عطا



کرنے کی خاطر بیٹے نے ادیب بننے کا خواب ادھورا چھوڑا اور میڈیکل تعلیم پانے لگا لیکن بھرپور کوشش کے باوجود وہ میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لے سکا۔ اس ناکامی نے اسے اتنا زیادہ دل برداشتہ کیا کہ جاذب نے خودکشی کر لی۔

غرض یہ ناول دور جدید کا ایک بڑا المیہ سامنے لاتا اور والدین کو پیغام دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی سعی نہیں کریں۔ ممکن ہے کہ وہ من پسند کا کیرئیر چن کر پیسا زیادہ نہ پا سکیں۔ لیکن سکون، اطمینان کی دولت ضرور پا لیں گے۔

یہ نوجوان مصنف کی قابل قدر کاوش ہے۔ انھوں نے لکھنا جاری رکھا تو مزید عمدہ تخلیقات سامنے آ سکتی ہیں۔

٭٭٭

نام کتاب: ملک مقبول احمد کی ادبی خدمات۔ مصنفہ: ساجدہ محبوب۔ ناشر: مقبول بکس، ۱۰۔ دیال سنگھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

یہ ایک ایسے علم و ادب دوست کی منفرد داستان حیات ہے جس نے سیالکوٹ کے چھوٹے سے گاؤں میں آنکھ کھولی۔ آبائی پیشہ کاشت کاری تھا لیکن ملک مقبول احمد زندگی میں کوئی کارہائے نمایاں دکھانا چاہتے تھے۔ قسمت انھیں لاہور لے آئی۔ انھوں نے پھر فروغ ادب کی خاطر ایک ادبی رسالہ "چودھویں صدی" جاری کیا۔ تاہم رسالہ چل نہ سکا اور مالی نقصان اٹھا کر اسے بند کرنا پڑا۔

ناکامی کے باوجود مقبول صاحب نے ہمت نہ ہاری اور علمی و ادبی کتب کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ ایمان داری اور محنت کے باعث اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں برکت ڈالی اور وہ مستحکم ہو گیا۔ انھوں نے پھر مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام سیکڑوں کتب شائع کیں اور یوں وطن عزیز میں علم و ادب کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ڈالا۔

مقبول صاحب قلم کار بھی ہیں۔ آپ بیتی، خاکے اور سفرنامے تحریر کر چکے۔ زیر نظر کتاب ایک طالبہ کا ایم فل مقالہ



ہے جو مقبول صاحب کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ہمارے ممدوح کی ادبی و علمی تحریروں کا ذکر ہے اور سوانح حیات بھی۔ کتاب کا مطالعہ ایک علم و ادب پرور شخصیت کے عیاں و پوشیدہ پہلو خوبی سے سامنے لاتا ہے۔ کتاب معیاری انداز میں شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب: خواتین کا کمپیوٹر انسائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ: اقرا چودھری۔ ناشر: رائل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: ۰۵۱۔۵۵۵۱۵۱۹۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

روزمرہ زندگی میں کام کاج کرتے ہوئے خواتین کو کئی

طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بعض گھر کی آرائش سے متعلق ہوتے ہیں، تو کچھ کا تعلق کھانے پکانے سے ہوتا ہے۔ زیرتبصرہ کتاب میں خواتین کے بہت سے امور و مسائل کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔



اس منفرد انسائیکلوپیڈیا کے چھے باب ہیں۔ پہلے باب میں گھر کی تزئین و آرائش سے متعلق ٹوٹکے درج ہیں۔ دوسرے باب میں حسن و خوبصورتی بڑھانے کی تجاویز دی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں انواع و اقسام کے کھانے پکانے کی تراکیب پڑھنے کو ملتی ہیں۔ چوتھے باب میں اچار چٹنی داری کے نسخے لکھے ہیں۔ باب پنجم خواتین کے اسلامی حقوق و فرائض سے متعلق ہے۔ جبکہ آخری باب میں امراض نسواں اور بچوں کی بیماریاں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

درج بالا ابواب سے عیاں ہے کہ اس کتاب میں خواتین کی دلچسپی کے بہت سے موضوع جمع ہیں۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث قیمت مناسب ہے۔

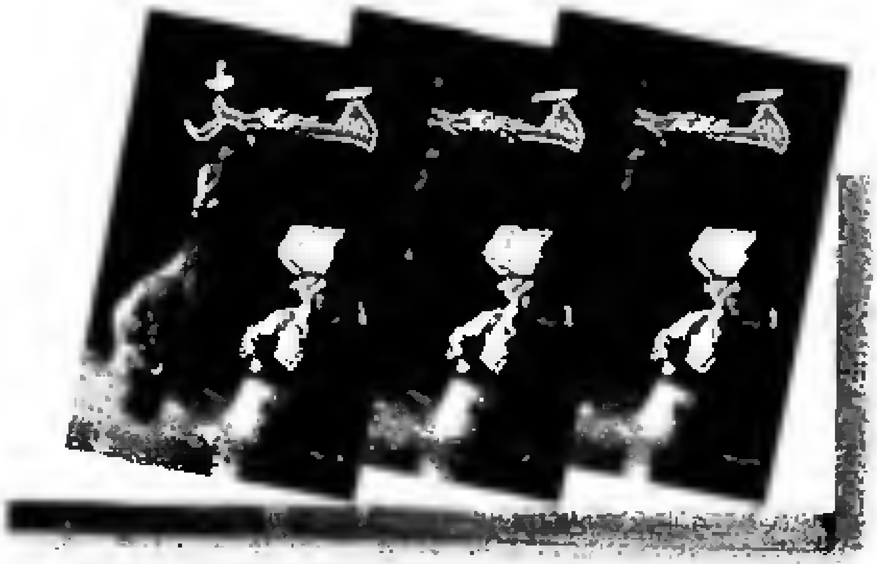
☆☆

نام کتاب: ہڑ۔ مصنف: محمد رشید علوی۔ ملنے کا پتا: مکان نمبر ۲۴۸، بلاک ۲، سیکٹر ای ۱۱، نزد بٹ چوک، کالج روڈ، ٹاؤن شپ، لاہور۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

یہ آپ بیتی نما دلچسپ ناول ہے جس میں مصنف نے مختلف واقعات بیان کیے ہیں۔ زیادہ تر واقعے معاشرتی موضوعات سے

تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بدی اور نیکی کی ازلی کشمکش انجام پاتی دکھائی گئی ہے۔ ناول کے کردار مختلف ماحول اور کیفیات سے گزرتے اور تلخ و شیریں لمحوں سے تجربہ پاتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ ''ہڑ'' پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ یہ عموماً



نالوں میں آنے والے سیلابی پانی کو کہتے ہیں۔ ناول کا آغاز و اختتام سیلاب آنے کے واقعے سے ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے ناول کا یہ نام رکھا گیا۔ ''ہڑ'' سماجی برائیاں عیاں کرنے والی ایک منفرد کاوش ہے۔ طباعت و پیش کش معیاری ہے۔

☆☆

کتاب: دہشت میں محبت۔ مصنف: محمد حمید شاہد۔ ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ، جہلم۔ فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔ قیمت: ۳۸۰ روپے۔

آج کل پاکستان میں اردو دنیائے ادب میں جو افسانہ نگار نمایاں ہوئے، ان میں محمد حمید شاہد نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں پنڈی گھیب میں جنم لینے والے شاہد صاحب بہ لحاظ پیشہ بینکار ہیں۔ مگر ان کا ذاتی مشغل لکھنا خصوصاً افسانے تخلیق کرنا ہے۔ یہ افسانے ادبی رسائل میں شائع ہو کر عام و خواص سے داد پا چکے۔

اب تک شاہد صاحب کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیرنظر پانچواں مجموعہ ہے۔ اس میں مصنف کے تازہ گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ان سب افسانوں کا موضوع

خوف، تشدد اور دہشت ہے۔ واقعہ ۹/۱۱ کے بعد جنم لینے والے یہ تینوں منفی انسانی جذبے بالعموم عالم اسلام خصوصاً پاکستان کو بدقسمتی سے اپنی لپیٹ میں لے چکے۔ مثال کے طور پر تازہ



مجموعے کا ایک افسانہ "خونی ادھ ہوا قتلِ عام: بچوں کا" سانحہ پشاور سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک بوڑھے استاد ماسٹر نسیم الرحمٰن کی کہانی ہے جس کا پوتا بھی شہید ہوا۔ اسی طرح "سوگ میں سوز" واقعہ نائن الیون سے نابلد نہیں ہے۔

ان افسانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے ان میں اسلوب اور تکنیک کے حوالے سے نئے تجربے کیے نیز جدید سیاسی و سماجی رویوں کو بھی موضوع بنایا۔ یہ مختصر افسانے پڑھ کر قاری اپنے دور کے سیاسی و معاشرتی حالات سے کماحقہ آگاہ ہو سکتا ہے۔

یہ افسانوی مجموعہ بک کارنر نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ جہلم جیسے الگ تھلگ شہر میں موجود ہونے کے باوجود یہ اشاعتی ادارہ بڑی ندرت و محنت سے معیاری کتب چھاپ رہا ہے جن کی قیمت بھی مناسب ہوتی ہے۔ یوں بک کارنر وطن عزیز میں بساط بھر علم و ادب کی ترویج کر رہا ہے۔ اس سعی پر ان کی ضرور تعریف و ستائش ہونی چاہیے۔

جدید افسانے سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کو دل پسند پائیں گے۔ یہ ان پر سوچ کے کئی در وا کرتی ہے۔

(تبصرہ: سید عاصم محمود) ◆◆◆

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates are hereby invited for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C & W Department for the current financial year in the field of Highways & Bridges works etc

Tender documents can be obtained from any of the below mentioned office upon written request accompanied with attested copies of enlistment/up to date renewal letter PEC license 2015, Identity Card of contractor/Managing partner/Director of the firm along with registered Power of Attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR/Bank Draft/Cashiers Cheque of any scheduled Bank

1. Chief Engineer, South Punjab Highway Department, Lahore
2. Commissioner, Faisalabad Division Faisalabad.
3. Superintending Engineer, Provincial Highway Circle, Faisalabad
4. District Coordination Officer, T. T. Singh.
5. Executive Engineer, Provincial Highway Division, Jhang
6. Assistant Commissioner, T. T. Singh

Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Undersigned (competent authority) reserves the right to reject all the tender under PPRA Rules. However the authority will communicates the grounds for rejection on request of the tenderer but is not required to justify those grounds. The tenders will be issued **upto** 10-06-2015 and will be received **on** 11-06-2015 **at 2.00 PM** and the same will be opened after 30 minutes of the closing time i.e. at 2.30 PM in the office of the Commissioner, Faisalabad Division Faisalabad in the presence intending contractors or their representative vide Government of the Punjab C & W Department Notification No. SOB-I (C&W) 1-21/65 (V-III) 2010.

Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money @ 2% of the bid price in shape of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque of any Scheduled Bank and attested copies of registered partner ship deed and Power of Attorney in case of firm will not be entertained.

Issuance of tender up to 10-06-2015
Receipt/Opening of tenders. 11-06-2015

Sr. No	Name of Scheme	Estimated Cost (In Rupees)	Tender Fee (In Rs).	Time Limit
1	Special Repair Lahore Jaranwala Faisalabad Jhang Bhakkar Road KM No 227-48 Construction of retaining wall	[illegible]	2500	Upto 20-06-20[illegible]
2	Special Repair [illegible] Jhang [illegible] boundary and fixing of gate at 12 [illegible] District Jhang	[illegible] 21,47,500/-	[illegible]	[illegible]
3	Special Repair of Jhang [illegible] Road [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
4	Special Repair of Lahore Jaranwala Faisalabad Jhang Bhakkar Road [illegible] KM [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

IPL-6955

Executive Engineer
Provincial Highway Division
Jhang

Superintending Engineer
Provincial Highway Circle
Faisalabad

از سرشتہ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال

اشتہار نیلام ٹھیکہ جات برائے سال 2015-2016 (ایک سال)

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال مندرجہ ذیل ذرائع آمدن برائے سال 2015-16 از عرصہ 01-07-2015 تا 30-06-2016

بذریعہ نیلام عام مورخہ 02-06-2015 بوقت 11:00 بجے دن بمقام دفتر ٹی۔ ایم۔ اے ملک وال ٹھیکہ پر دینا چاہتی ہے خواہشمند حضرات / پارٹیاں جو باقاعدہ ضلعی حکومت سے رجسٹرڈ ہوں نیلام میں حصہ لے کر اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ شرائط نیلام دفتری اوقات کار میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ جو کہ کارروائی نیلام سے قبل بھی پڑھ کر سنائی جائیں گی۔ نیلامی میں حصہ لینے سے قبل بولی دہندہ / پارٹی [illegible] زر ضمانت [illegible] بحق [illegible] شیڈول بینک [illegible] جمع کرانا [illegible]۔ نیلامی سے قبل [illegible] رجسٹریشن [illegible] [illegible] ہوگی۔ سب سے زیادہ بولی دہندہ کی بولی [illegible] نیلامی [illegible] منظوری تک [illegible] جائے گی۔ نیز [illegible] ٹی۔ ایم۔ اے کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ بغیر وجہ بتائے بولی منظور یا مسترد کر دیں۔

اہم شرائط:

1. کوئی شخص جو [illegible] کا نادہندہ ہو یا ٹی۔ ایم۔ اے یا کسی ادارے کی جانب سے بلیک لسٹ / نااہل قرار دیا گیا ہو۔ ٹھیکہ میں حصہ نہیں لے سکے گا۔
2. چارج لینے سے قبل ٹھیکیدار [illegible] رقم کے برابر قواعد کے مطابق بینک گارنٹی مہیا کرنی ہوگی۔
3. ٹھیکیدار قسطوں کی ادائیگی ہر ماہ کی [illegible] تک [illegible] کرنے کا پابند ہوگا۔ نیز [illegible] انکم ٹیکس 10% بھی بمطابق قواعد ادا کرنے کا پابند ہوگا۔
4. ٹھیکیدار آمدن کی وصولی منظور شدہ شیڈول کے مطابق [illegible]۔

کیفیت	زر ضمانت	ریزرو پرائس	نام ٹھیکہ جات	نمبر شمار
	15000/-	2[illegible]661.1/-	سلاٹر فیس	1
	40000/-	2400000/-	ایڈورٹائزمنٹ بورڈ فیس	2

2. ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ٹی۔ ایم۔ اے ملک وال اپنی ملکیتی عمارت سابقہ دفتر [illegible] جو پرانا بازار ملک وال میں واقع ہے اور خستہ حالت میں ہے کے ملبہ کو نیلام عام مورخہ 10-06-2015 بوقت 11 بجے دن کرنا چاہتی ہے۔ عمارت کا ملبہ جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر نیلام کیا جائے گا۔ خواہشمند حضرات نیلامی میں حصہ لینے سے قبل اپنا اصل شناختی کارڈ و مبلغ 100000/- روپے کا بینک ڈرافٹ بحق [illegible] بطور سیکورٹی جمع کرانے کے پابند ہوں گے۔ کامیاب بولی دہندہ بعد از منظوری بولی 02 یوم کے اندر اندر تمام رقم بمعہ انکم ٹیکس 10% جمع کرانے کا پابند ہوگا۔ بصورت دیگر جمع شدہ سیکورٹی بحق TMA ضبط کر لی جائے گی اور رقم جمع کرانے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر اندر تمام ملبہ موقع سے اٹھانے کا پابند ہوگا۔ بصورت دیگر مبلغ 5000/- روپے یومیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ اس کی جمع شدہ سیکورٹی ملبہ اٹھانے کے بعد واپس کی جائے گی۔ دوران کام سڑک پر کسی قسم کا ملبہ نہ ڈالے گا اور نہ ہی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے گا۔ [illegible] کسی بھی بولی منظور یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اور کسی درخواست پر بولی مسترد کرنے کی وجوہات بتانے کے پابند ہوں گے جبکہ اس کو Justify کرنے کے پابند ہوں گے۔ مزید تفصیلات دفتر ٹی۔ ایم۔ اے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

3- کوٹیشنز درکار ہیں۔

ٹی ایم اے ملکوال رمضان المبارک تک حسب ہدایت حکومت پنجاب عوام الناس کو سستی اشیاء فراہم کرنے کی غرض سے ملکوال اور ... رمضان بازار لگانا چاہتی ہے۔ جس کے لئے درج ذیل سامان کرایہ داری پر / قیمتاً خریدنا چاہتی ہے۔ خواہشمند حضرات اپنی کوٹیشنز ہمراہ کال ڈپازٹ مبلغ/4000 روپے مورخہ 9.06 ... بوقت 11:00 بجے دن تک دفتر ٹی ایم اے ارسال کر سکتے ہیں۔ جو اسی روز بوقت 12:00 بجے دن کمیٹی ... کی موجودگی میں کھولی جائیں گی۔ زیر دستخطی کوئی بھی بولی منظور یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اور کسی درخواست پر بولی مسترد کرنے کی وجوہات بتانے کے پابند نہیں ہوں گے بجائے کو Justify کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ مزید تفصیلات دفتر ٹی ایم اے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

نمبر شمار	تفصیل سامان	کیفیت
1	بینرز پینا فلیکس	قیمتاً خریدنا درکار ہیں۔ فی بینرز ہمعہ پٹی فی فٹ ولگوائی سمیت ریٹ درکار ہیں۔
2	پرمانینٹ قناتیں	روزانہ کی بنیاد پر ستار رمضان بازار اور اس کے اردگرد کی سڑکات پر لگانا ہوگا۔
3	تار 7/29 انیڈ سوئچ برائے بجلی	قیمتاً خریدنا درکار ہیں۔ تار فی کوائل انیڈ سوئچ فی عدد ریٹ درکار ہے۔
4	پیڈسٹل فین (اعلیٰ کوالٹی کے پاک فین، GFC فین، یونس فین)	10 عدد قیمتاً خریدنا درکار ہیں۔ فی عدد ریٹ ارسال کیا جائے۔
5	جنریٹر	یومیہ کرایہ پر درکار ہیں۔ پٹرول بذمہ کوٹیشن دہندہ ہوگا۔
6	ساؤنڈ سسٹم	یومیہ کرایہ پر درکار ہیں۔ فٹنگ بھی بذمہ کوٹیشن دہندہ ہوگی۔
7	کیری، متفرق، ریت، بجری برائے حسب ایس سینٹرل وغیرہ	فی ٹرالی قیمتاً خرید کرنا ہیں
8	بینچ لکڑی و چٹائی سائز 6x10	فی عدد قیمتاً کرایہ پر
9	پلاسٹک شیٹ	فی مربع فٹ قیمتاً خرید کرنا ہیں
10	دری	فی عدد قیمتاً خرید کرنا ہیں
11	تالے	فی عدد قیمتاً خرید کرنا ہیں
12	ڈسٹ بن	فی عدد قیمتاً خرید کرنا ہیں
13	اجرت لگوائی فٹنگ فنکشن رمضان بازار و دیکھ بھال دوران عرصہ رمضان بازار معہ بار برداری سامان (لانے اور لے جانے)	
14	دیگر سامان حسب ضرورت	

المشتہر

IPL-6929

ایڈمنسٹریٹر
تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملکوال

تحصیل میونسپل آفیسر
تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملکوال

Pakistan-The Way Forward

By:Afnan Ullah Khan

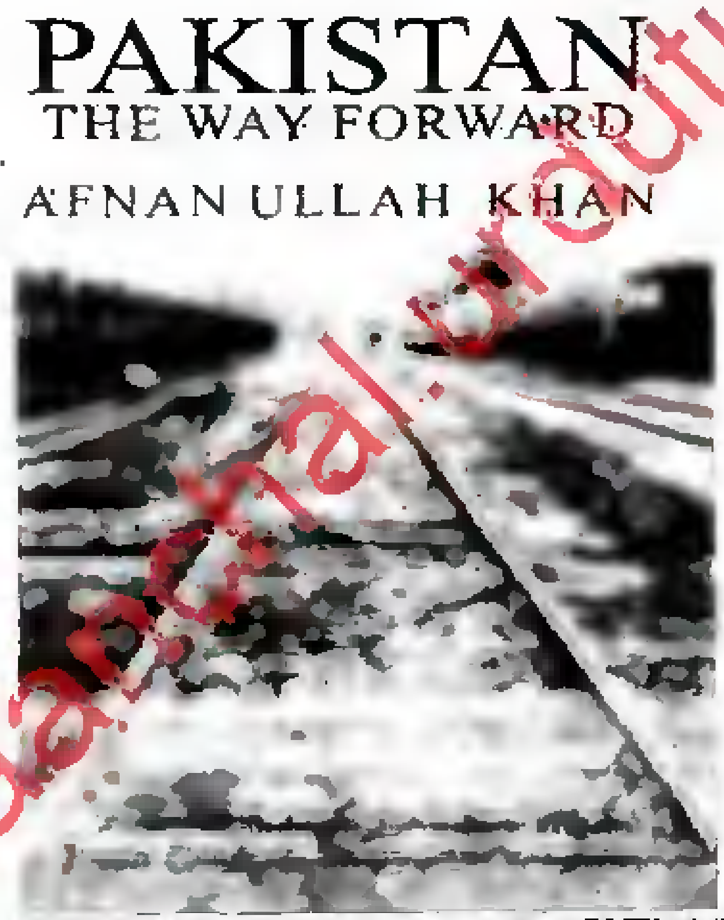
Without a doubt, one of the best and comprehensive books on Pakistan's past and future. **President of Pakistan Mamnoon Hussain**

This book is a collection of Afnan Ullah Khan's ideas and views on various facets of Pakistan, what went wrong in the past and what should be done for a course correction for the future.

Senator Mushahid Hussain Sayed

"Pakistan: The Way Forward" is a candid analysis of the challenges that Pakistan faces. It is based on first-hand knowledge of the country's problems, recounted in a forthright manner.

Khursheed Anwar former Ambassador



Rs.480

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز. 2 ایوانِ تجارت روڈ لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

ایک سائنس دان نے ایک مشین ایجاد کر لی جو کسی بھی انسان کو اس کے بچپن میں لے جا سکتی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ جو کوئی اپنے بچپن میں جانا چاہے، وہ درخواست جمع کرائے۔ فیصلہ قرعہ اندازی سے ہوگا۔ سائنس دان کو ہزار ہا درخواستیں وصول ہوئیں۔ متردد ہو کر اس نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا "میں افسوس کے ساتھ اپنا عہد واپس لیتا ہوں۔ مجھے ہر طبقے کے افراد نے درخواستیں بھجوائی ہیں۔ لیکن یہ بھی لوگ اپنے بچپن میں چلے گئے تو ملک کا نظم و نسق کون سنبھالے گا؟"

یہ فطری امر ہے کہ انسان اپنے ماضی کو بہت پسند کرتا ہے اور خاص طور پر بچپن! یہی حال ہمارا ہے کہ ہمیں اپنے شرارتی بچپن کے دن بہت یاد آتے ہیں۔ عمر عزیز کا چھپنواں یا ستاواں سال

جب میں نے غصے میں

بھائیوں کو باورچی خانے بند کر ڈالا

بچپن کے تلخ و شیریں تجربات ایک قاریہ کی زبانی

عظمیٰ کوثر



تھی۔ ہم لوگ سندھ میں قیام پذیر تھے۔ ابوجان پی ڈبلیو ڈی (PWD) میں ملازم تھے۔

ہمسائے میں لاہور سے آیا ایک خاندان رہتا۔ ان کی بچیاں تھیں۔ جب کبھی میں ان کے گھر جاتی، بچیاں [illegible] ہوتیں۔ [illegible] سے [illegible] کیا گیا تھا۔ انھیں [illegible] شوق ہوا لیکن میری والدہ کو پسند نہ تھا۔ وہ کہتے [illegible] تھے۔ انھیں جانے کے بعد میں اس کا شوق [illegible]

[illegible] ایک روز میں ان کے گھر گئی [illegible] بچیاں [illegible] کر رہی تھیں۔ اسی دوران ابوجان [illegible] میں سے پکڑا گئے [illegible] تھا۔ [illegible] لگا، ان کے ساتھ ہی میری [illegible] آیا۔ [illegible] ابوجان [illegible] سے [illegible] کے سامنے [illegible] سے ان کی [illegible] ہمارے [illegible]

***

[illegible] گئے [illegible] ایک دن [illegible] بھائی دونوں باورچی خانے میں آ کر گئے تھے (چیں) [illegible] تھے۔ ان دنوں گھر میں [illegible] استعمال ہوتی تھیں۔ [illegible] تھے [illegible] کہ بچیں [illegible] ہیں لیکن [illegible] میں آ کر وہ [illegible] سے باورچی خانے کا دروازہ [illegible] لگا دی۔

[illegible] ابوجان کی [illegible] بجھی اور باورچی خانے میں [illegible] بھائی دونوں آوازیں دینے لگے کہ دروازہ کھولو، دروازہ کھولو۔ ہم [illegible] مجھے اب [illegible] نکل [illegible]۔ میں خوف کے مارے امی جان کی چارپائی کے نیچے [illegible]۔ امی جان نے پوچھا "کیا کر کے آئی ہو؟"

جب امی جان [illegible] بتایا تو وہ [illegible]

سے باہر نکالیں اور باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ مجھے بڑی [illegible] گئے۔ میں نے انھیں [illegible] سے معافی مانگی۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

***

[illegible] کے بعد [illegible] نہ پا سکی۔ تب میں نے [illegible] سے [illegible] ایک دن امی جان کے پاس [illegible] اور [illegible] کاٹ [illegible] وہ [illegible] سے باہر چلی گئیں۔ میں نے [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] پاتے [illegible] اس لیے ان کے [illegible] تھے۔ بڑی محنت اور [illegible] سے [illegible] پائی۔ [illegible] کا سب نے [illegible] سے کھایا۔ شام جب [illegible] جان کھانے لگے تو تھوڑی دیر بعد بولے "[illegible]"

میں نے کہا "جی بھائی۔"

کہنے لگے "بہت [illegible] لیکن اس میں سے [illegible] ہی نکل رہی ہیں۔"

سب نے [illegible] سے قہقہہ لگا کر [illegible]

اردو ڈائجسٹ [illegible] اب تیس [illegible] سال پڑھ رہی [illegible] سے وابستہ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ بھائی جان کی [illegible] اردو ڈائجسٹ لاتے تو جب تک [illegible] پڑھ لیتے [illegible] دیتے۔ ہم امتحانات کے بعد فارغ تھے۔ لہٰذا دل چاہتا [illegible] اور ہم پڑھ لیں۔

بھائی جان [illegible] چھپا دیتے تھے۔ خدا خدا کر کے [illegible] میں سے [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] نہ [illegible] اب [illegible] کے [illegible] اردو ڈائجسٹ [illegible] لگ کر پڑھا۔ بعد ازاں بھائی جان کو بتایا کہ ہم بھی یہ رسالہ [illegible] پھر خود ہی دینے لگے۔ شاید انھیں اندازہ ہو گیا [illegible] رہے تھے۔

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتا: مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۳۲۵۔ [illegible] لاہور

ماہ مئی میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ نمبر ۱۔ (الف) [illegible] (ب) ۱۲۶۵ء غیاث الدین بلبن

قصہ نمبر ۲۔ (الف) ۱۲۹۳ء [illegible] (ب) ۱۵۳۰ء آگرہ

قصہ نمبر ۳۔ (الف) ۱۹۰۷ء [illegible] (ب) ۱۹۴۷ء [illegible]

درست جوابات دینے والوں کے نام

[illegible]



دلچسپی معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہ ہے قصہ کوئز

[illegible] انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- عبدالحمید (کراچی)
- [illegible] (لاہور)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام، پتا اور موبائل [illegible] لکھنا نہ بھولیں۔
[illegible] (ادارہ)

قصہ کوئز ۱

۱۹۱۷ء میں نواب میر عثمان علی خان نے اردو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ چونکہ اس وقت تک اردو میں جدید علوم و فنون کی کتابیں موجود نہ تھیں اور نہ سائنسی اصطلاحات دستیاب تھیں، چنانچہ اردو یونیورسٹی کے لیے نصابی کتب تیار کرنے کی غرض سے اس کا دارالترجمہ دو سال پہلے ہی وجود میں آ گیا۔ ۱۹۱۹ء سے تعلیم شروع ہوئی۔ امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم ایم ایس سی تک اردو میں دی جاتی تھی۔ ہندوستان بھر سے بہترین اور منتخب اساتذہ بھرتی کیے گئے۔ جامعہ کے طلبہ نے یورپ کی یونیورسٹیوں میں کامیابی سے جامعہ عثمانیہ کا نام روشن کیا۔ اردو زبان کا شمار اب انگریزی زبان کے علاوہ ایک بڑی علمی زبان کے طور پر بھی ہونے لگا۔ [illegible] ادبی اور سائنسی کتب بڑے پیمانے پر شائع ہوئیں۔

(الف) جامعہ عثمانیہ کہاں واقع ہے؟

(ب) اسے قائم کرنے کا مشورہ کس نے دیا؟

قصہ کوئز ۲

جامعہ کراچی ایک ایکٹ کے تحت قائم ہوئی۔ یہ ایک الحاقی، امتحان لینے والا اور تدریسی ادارہ ہے اور اس کا دائرہ اختیار صرف کراچی شہر تک محدود ہے۔ آنرز، پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ براہ راست یونیورسٹی کے کنٹرول میں ہے جب کہ ڈگری کورس اور ٹیکنیکل کورس ملحقہ کالجوں میں کرائے جاتے ہیں۔ جامعہ کراچی پچاس سے زائد شعبے یعنی آرٹس، سائنس، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، کاروباری تنظیمات، کامرس، اسلامیات، فارسی، قانون تعلیم اور طب کے تحت جاری ہے۔ علاوہ ازیں آرٹس، سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم کے کالج ہر سال مختلف میدانوں میں بارہ ہزار طلبہ کو بی اے کی ڈگری کے امتحان کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم رائج کیا گیا۔

(الف) یہ یونیورسٹی کب قائم ہوئی؟

(ب) یہ یونیورسٹی کتنی مختلف زبانوں میں تعلیم فراہم کرتی ہے۔

قصہ کوئز ۳

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام مولانا محمد علی جوہر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پہلے چانسلر حکیم اجمل خان اور پہلے وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر مقرر ہوئے۔ ان دنوں تحریک ترک موالات زوروں پر تھی۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے اندر اوکھلے میں اپنی موجودہ مستقل عمارت میں منتقل ہوئی۔ جامعہ نے بہت جلد مستقل یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس دور کے نصاب میں حدیث، تفسیر، فقہ اور دینیات کی تعلیم شامل رہی لیکن جامعہ کے پیش نظر دین دار گریجویٹ پیدا کرنا تھا جو دین کے مبلغ اور عالم ہوں۔ چنانچہ جامعہ کے نصاب میں فنون اور جدید علوم بھی شامل کر لیے گئے۔ اسی بنا پر ادارے کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بجائے جامعہ رکھا گیا۔ جامعہ ڈاکٹر سید ذاکر حسین، [illegible] فاروقی اور علامہ محمد اسلم جے راج پوری جیسے بلند پایہ [illegible] کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔

(الف) یہ ادارہ کہاں ہے؟

(ب) اس کی بنیاد کس نے اور کب رکھی؟

◆◆●

چمنِ خیال



قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

ارکان قومی اسمبلی کے لیے ایک مثال

میں ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۷ء اسلامیہ ہائی اسکول بدوملہی میں زیر تعلیم رہا ہوں۔ یہ قصبہ نارووال سے تقریباً ۲۶ کلومیٹر دور ہے۔ جب میں اسکول میں داخل ہوا تو چودھری ابراہیم ہمارے پرنسپل تھے۔ چند برس بعد وہ صوبائی یا قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ لیکن رکن بن کر بھی وہ اسکول میں پڑھانے آتے رہے اور کوئی تنخواہ نہ لیتے۔ تب تعلیم دینا عبادت سمجھا جاتا تھا۔

چودھری ابراہیم روزانہ بذریعہ ریل نارووال سے بدوملہی آتے تھے۔ ایک دن جب وہ بدوملہی سے نارووال جانے لگے تو انھوں نے دو ٹکٹ خریدے۔ ریلوے کا ایک ملازم یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ چند دن بعد اس نے چودھری ابراہیم سے کہا "چودھری صاحب! آپ نے دوسرا ٹکٹ کس کے لیے خریدا؟ گاڑی بس چلنے ہی والی تھی اور دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔"

یہ سن کر چودھری ابراہیم بولے "پچھلے ہفتے میں جب میں نارووال اسٹیشن پہنچا تو ریل چلنے والی تھی۔ لہٰذا میں ٹکٹ لیے بغیر چڑھ گیا۔ اب دوسرا ٹکٹ اس لیے ہے کہ قومی خزانے کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کا ازالہ کر سکوں۔"

یہ واقعہ آج صوبائی و قومی اسمبلیوں اور سینیٹ کے لیے سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ وہ بھی ایمان داری کو اپنا چلن بنائیں گے۔ (پروفیسر رشید احمد غوری، پشاور یونیورسٹی)

قومی و اخلاقی روایات کا امین

اردو ڈائجسٹ نصف صدی سے زائد عرصے سے بہت محترم قومی و اخلاقی روایات کا امین چلا آ رہا ہے۔ ادارے کو یہ نیک روایات برقرار رکھنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (زاہد اعوان، نائب صدر، وفاقی ایوان ہائے تجارت و صنعت پاکستان)

اعلیٰ تعلیم.....سب کے لیے!

بیس تیس سال پہلے تک سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں معیارِ تعلیم اچھا تھا۔ اساتذہ ذمے داری اور محنت سے پڑھاتے۔ یوں غریبوں کے بچے بھی پڑھ لکھ کر معاشرے میں بلند مرتبہ پا لیتے۔ مگر اب سرکاری تعلیمی اداروں میں بہت کم پڑھائی ہوتی ہے۔ بیشتر اساتذہ مفت کی تنخواہ لیتے ہیں۔ دوسری طرف غریب کا بچہ ہزار ہا روپے فیس لینے والے اسکول یا کالج میں نہیں پڑھ سکتا۔ حکومت سے اپیل ہے کہ وہ سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا معیار بلند کرے تاکہ غریب بچے بھی لکھ پڑھ کر ترقی کر سکیں۔
(عبدالصمد قریشی، کراچی)

حکومت میں قادیانی

قیام پاکستان کے بعد روزِ اول سے سول و فوج میں قادیانی اعلیٰ عہدوں پر فائز چلے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومتی عہدوں پر جتنے بھی قادیانی فائز ہیں، انھیں فوراً برطرف کیا جائے۔ یوں کئی خفیہ سازشیں عیاں ہوں گی۔
(ڈاکٹر ملک عظیم مجوکہ، شیخوپورہ)

طلبہ و طالبات کی کیریئر کونسلنگ

"مشورہ حاضر ہے" کے دوبارہ اجرا پر دل خوش ہو گیا۔ کمپیوٹر کے حوالے سے مفید معلومات کا سلسلہ بھی دوبارہ شروع کیجیے۔ عالمی ادب سے بھی خوب انتخاب شامل ہوتا ہے۔ کاروباری مشاورت کے مضامین بھی بہترین کاوش ہیں۔ اسی طرح طلبہ و طالبات کی کیریئر کونسلنگ پر ضرور کچھ دیجیے۔ جدید دور میں روزگار کے بے شمار شعبے آ گئے ہیں جن سے والدین اور طلبہ و طالبات لاعلم ہیں۔
(حکیم محمد یونس صدیق صمدانی، تحصیل و ضلع رحیم یار خاں)

اردو ڈائجسٹ.....قومی تحریک

"اردو ڈائجسٹ" ایک جریدہ ادب و ثقافت تو ہے ہی

اب یہ ایک تحریک کا نام بن چکا۔ اخلاقیات، پاکستانیت، دو قومی نظریہ، ہماری روایات و اقدار، ہمارا علمی و ادبی ورثہ، ہماری علمی و ادبی تاریخ جیسے موضوعات سے مسلسل اور متواتر آگاہ رہنا اور نئی نسل کو باخبر رکھنا کوئی معمولی قدم نہیں۔ پھر ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی صاحبان کا اپنی تمام عمر اس مقدس فریضے کی نذر کر دینا عام واقعہ نہیں جسے بھلا دیا جائے۔ کاروانِ علم رواں دواں ہے اور انشاءاللہ یہ کام اب آنے والی نسلیں جاری رکھیں گی۔ میں گاہے گاہے اپنی تحریریں اور منظومات روانہ کرتا رہوں گا اور زندگی شرط ہے، رابطہ جاری و ساری رہے گا۔
(کرامت بخاری، لاہور)

ایک کارِ خیر

شمارہ مارچ میں اپنی کتاب "نوید فکر" پر تبصرہ دیکھا۔ ادارہ اردو ڈائجسٹ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے جو اقدامات کر رہا ہے وہ بھی قابل ستائش ہیں۔ لوگوں کو لکھنے پر ابھارنا بجائے خود ایک کارِ خیر ہے۔
(افشاں نوید، روزنامہ جسارت، کراچی)

موت اٹل حقیقت ہے

شمارہ اپریل میں مضمون "کیا انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟" زیرِ مطالعہ رہا۔ کئی ہزار برس کے دوران سیکڑوں انسان ابدی زندگی پانے کی سرتوڑ کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر امریکی گلوکار مائیکل جیکسن بھی طویل عمر پانے کا خواہش مند تھا۔ بارہ ڈاکٹر اس کی خدمت پہ مامور رہتے۔ لیکن وہ پچاس برس کی عمر میں دنیا سے چلا گیا۔ سچ یہ ہے کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔

موت کے متعلق عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ کچھ یوں ہے: "اس دنیا میں مرتے دم تک سوائے غم سہنے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ آدمی خوش نصیب ہے جو جلد چلا گیا اور سب سے زیادہ خوش قسمت وہ جو آیا ہی نہیں۔"
(رانا محمد شاہد، بورے والا)

تعریف بھی، تنقید بھی

اردو ڈائجسٹ کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے، تاہم پروف ریڈنگ کی غلطیوں پر قابو پایئے۔ راقم کے مضمون "اڑتا ہوا محل" میں صفحہ ۱۲۹ پر سن ۱۹۱۷ء کی جگہ ۲۰۱۷ء ہونا چاہیے تھا۔ غلطیوں کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن انھیں کم سے کم ہونا چاہیے۔

(نقیر اللہ خان، ریٹائرڈ فنانس منیجر پی آئی اے، لاہور)

☆☆

رسالہ زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ دعا ہے کہ ارکان ادارہ اردو ڈائجسٹ جیسا معیاری رسالہ آب و تاب سے نکالتے رہیں۔

(خادم حسین مجاہد، ایڈیٹر دستک، بھابڑا، سرگودھا)

☆☆

اردو ڈائجسٹ میں شکاریات کی کہانیاں شامل کیجیے۔ بچوں کے صفحات ختم کر کے انھیں مایوس کیا گیا۔ بچے اپنے مطلب کی تحریریں نہ پا کر سوال کرتے ہیں۔

(ستارہ خالد، کراچی)

☆☆

شمارہ اپریل میں سبھی تحریریں عمدہ تھیں۔ "دلا بھٹی کے دیس میں" پڑھ کر لطف آیا۔ وجہ یہ کہ میری زندگی کے ۱۵ برس پنڈی بھٹیاں میں گزرے ہیں۔ میں ڈائجسٹ کے پچھلے شمارے بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔ (نائلہ بلیغ الرحمن، بہاولپور)

☆☆

اردو ڈائجسٹ کے متواتر مطالعے سے اندازِ فکر اور طرزِ تحریر کو جلا ملتی ہے۔ اس بار مرکزی سیرت النبیؐ کانفرنس میں میرا مقالہ "ذرائع ابلاغ کا کردار اور ذمے داریاں، سیرتِ طیبہ کی روشنی میں" انعام کا حق دار قرار پایا۔

(قاضی محمد مطیع الرحمن، پنڈ کمال خان، ہری پور)

☆☆

شمارہ مارچ میں سبھی تحریریں قابلِ مطالعہ تھیں۔ "ایک

یزدانی جالندھری کی بیگم کا سانحۂ ارتحال

ممتاز شاعر اور مجلس ادارت اردو ڈائجسٹ کے مرحوم رکن، یزدانی جالندھری کی زوجہ ۲۲ مئی کو وفات پا گئیں۔ مرحومہ رسالے کے ڈیزائنر، عبدالرحمٰن کی دادی تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سانحے پر لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ بخشے۔

(ادارہ اردو ڈائجسٹ)

"دکھی شوہر کی فریاد" میں عورتوں کی بے اعتنائی کا ذکر ہوا۔ لیکن ازدواجی جھگڑوں کا ذمے دار صرف بیوی کو ٹھہرانا مناسب نہیں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

(ادریس شیخ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆☆

میں اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ رسالے میں قسط وار جاسوسی کہانی بھی شامل کریں۔

(ڈاکٹر شریف الدین، ساماروسوری، سندھ)

☆☆

رسالے میں آہستہ آہستہ نکھار آ رہا ہے۔ اسی لیے ہماری اڈیالہ جیل میں اس کی مقبولیت بھی بڑھ گئی۔ اب ہر شمارہ باری لگا کر پندرہ سے بیس قیدی پڑھتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ رسالے کے صفحات میں اضافہ فرمائیں۔

(قیدی رفاقت قادری، راولپنڈی)

☆☆

اردو ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ تجویز ہے کہ مضمون نگاروں کا فون نمبر بھی شائع کیا جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے رابطہ ہو سکے۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں بھی بعض اوقات نظر آتی ہیں، ان پر توجہ دیجیے۔

(ابوحمزہ عبدالحمید المری، علی پور، مظفرگڑھ)

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ مئی میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) ۹ روزے (ب) آٹھویں پارے میں اسلامی کوئز ۲۔ (الف) ۲۰۷، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ (ب) ریان جنت کا دروازہ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ محمد سبحان رضوان (آزاد کشمیر) 2۔ بدیع الیاس (منڈی بہاؤالدین) 3۔ طاہرہ عنایت (پشاور) 4۔ اشن فاطمہ (راولپنڈی)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

ماہ رخ سعید (لاہور)، اسد سعید (لاہور)، فاطمہ سعید (لاہور)، ہاشم سعید (لاہور)، رحمٰن سعید (لاہور)، حنیٰ سعید (لاہور)، مدیحہ رحمٰن (اسلام آباد)، محمد سبحان رضوان (آزاد کشمیر)، توصیف احمد (حیدرآباد)، نسیم منظر (کراچی)، کاشف مرزا (حیدرآباد)، اظہر حسین (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، نادیہ تحریم (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، مریم رحمٰن (اسلام آباد)، وجیہہ رحمٰن (اسلام آباد)، نوید بشیر (ڈی آئی خان)، نعمان رفیق (میرپور)، بدیع الیاس (منڈی بہاؤالدین)، منور سعید خانزادہ (سکھر)، محسن حبیب (فیصل آباد)، احتشام الرحمٰن (ہری پور)، نادیہ بی بی (ڈیرہ اسماعیل خان)، ہشام صابر (ہری پور)، شہزاد سعید (کراچی)، فائزہ نبیل (جہلم)، طاہرہ عنایت (پشاور)، محمد سعید معین (رحیم یار خان)، حسن ظفر (راولپنڈی)، احتشام ظفر (راولپنڈی)، اشن فاطمہ (میرپور)، اسامہ ظفر (راولپنڈی)۔

اسلامی کوئز ۱

ارشاد باری ہے: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے، اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔“

(الف) روزہ اسلام کا کون سا رکن ہے؟ (ب) آپ ﷺ نے شب قدر کو رمضان کی کن راتوں میں ڈھونڈنے کے لیے کہا؟

اسلامی کوئز ۲

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی۔ ایک روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعا، دوسرے عادل بادشاہ کی دعا، تیسرے مظلوم کی دعا جس کو حق تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھا لیتے ہیں اور آسمان کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جاتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ میں تیری ضرور مدد کروں گا گو (کسی مصلحت سے) کچھ دیر ہو جائے۔ (ترمذی، ابن حبان)۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزے کو افطار کرے، غیر رمضان کے روزے چاہے تمام عمر رکھے اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔

(الف) کن لوگوں کی دعا رد نہیں ہوتی؟ (ب) روزہ کس کے لیے ہے اور اس کا اجر کون دیتا ہے؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پائے گا۔

(مدیر اردو ڈائجسٹ، لاہور)



انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور